

اے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں

عبدالقادر

رحمٰن چغتائی

اوراق

مدیران

ریاض قادر • ناصر کاظمی

عبدالقادر نمبر

بیادگار

شیخ عبدالقادر مرحوم

اوراقِ نو

زرِ سالانہ:- ۸/۷ روپے

قیمت

خاص نمبر - ایک روپیہ

مدیران

ریاض قادر

ناصر کاظمی

گوشۂ ادب لاہور

موضوعات کے انتخاب میں کبھی سستی اور پست قسم کی رنگینی یا عریانی کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے ایسے عنوانات چنے ہیں جن میں قوموں کے دکھ درد کا مداوا اور انسانی ذہن کی پاکیزہ آسودگی کا فراہم

34685 ہماری مطبوعات

شمع ۔ اے۔ آر۔ خاتون ۔ نیا ایڈیشن مشہور و معروف معاشرتی ناول - اس میں عورت کی نفسیات کا عمیق مطالعہ اس کا تجزیہ کردار اور اس کی زندگی کی وہ گتھیاں جو آج تک ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں آپ کو زبانِ حال سے اپنا افسانہ سناتی ہوئی ملیں گی۔ کاغذ طباعت عمدہ - خوبصورت سہ رنگہ - ڈسٹ کور - قیمت چھ روپے مجلد

پبلک سیفٹی ریزر ۔ ابراہیم جلیس ابراہیم جلیس افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیا سے متعارف ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک کامیاب طنز نگار بھی ہے - پبلک سیفٹی ریزر ایک لخراش طنز ہے - قیمت دو روپے آٹھ آنے -

اٹک کے اس پار مولف فارغ بخاری - رضا ہمدانی وہ سرزمین جہاں کے جفاکش باشندے اپنے ملک کی جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن سامراجی حکومت نے انہیں پہاڑوں کی اوٹ میں رکھا جنہوں نے اس وقت فسطائیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جبکہ سارے ایشیا میں ان کا کوئی ہمنوا نہ تھا - اٹک کے اس پار، اس سنگین ماحول میں بسنے والے حریت پرست پٹھانوں کی تہذیب، کلچر، معاشرت اور ادب کا بیغرافی حق قیمت ۸/-

قائدِ اعظم کے آخری ایام کرنل الٰہی بخش اس آہنی عزم کے فولادی انسان کی زندگی کے آخری ایام کا مطالعہ جس نے غلامی کی گہرائیوں میں سسکتی قوم میں جذبۂ آزادی کی روح پھونک کر اس آج ثریا پر پہنچا دیا - اس کتاب میں کرنل الٰہی بخش صاحب نے جو قائد اعظم کے آخری ایام میں ان کے معالج کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے اس عظیم الشان اور فقید المثال انسان کے بے پناہ خلوص، جذبۂ ایثار، قربانی - محنت و استقلال کا نہایت دلکش نقشہ کھینچا ہے - قیمت دو روپے آٹھ آنے

پھول اور پتھر - خاطر غزنوی پتھریلی زمین پر اُگنے والے وہ پھول جنہیں خاطر غزنوی نے سرحدی چٹانوں سے چن کر آپ کے دامن کو زینت دی - ناولٹ کی شکل میں ایک لافانی شاہکار - قیمت ایک روپیہ چار آنے

ہماری دیگر کتابیں

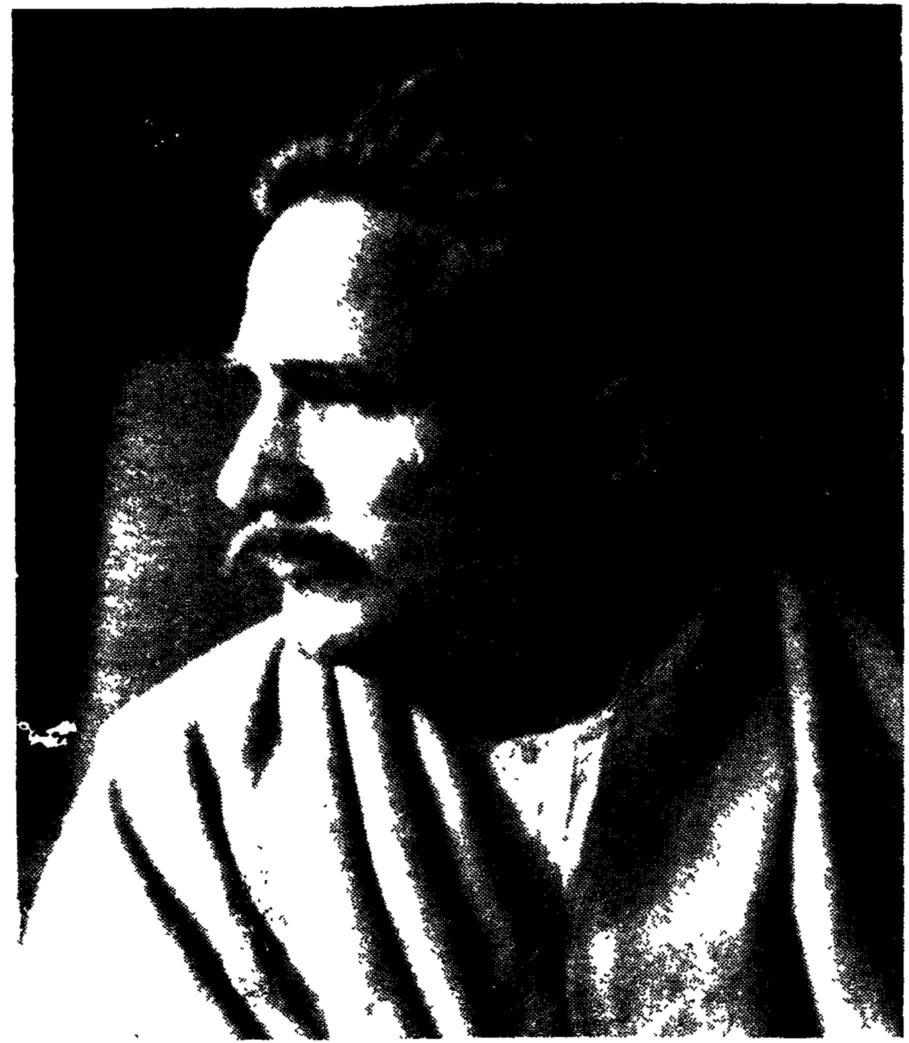
صحیفۂ ٹیپو سلطان	محمود بنگلوری	۸/-
تاریخ سلطنت خداداد	〃	۹/۱۲
تاریخ جنوبی ہند	〃	۵/-
فیصلہ کن جنگیں	〃	۲/۸
حیدر علی	〃	۲/-
انقلابات ہیں زمانے کے	〃	۲/-
سیرت الصدیق	حبیب الرحمٰن خان شیروانی	۲/-
انسانیت موت کے دروازے پر	آزاد	۲/۸
فلسفۂ تاریخ	غلام محمد احمد	۲/۸
اسلامی ڈرامے	باسط سلیم	۲/۸
رخسانہ	لطفی المنفلوطی	۲/-
اسلامی خطبات	قریشی	۲/۴
تاریخ پاکستان	〃	۲/۴
اشک و تبسم	جبران	۳/-
ریت اور جھاگ	〃	۲/۸
سینر فارڈ ڈرامہ	آغا بابر	۱/۴
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/-
عورت کا گناہ	فارغ بخاری	۲/-
آزادی کے بعد	قدرت اللہ شہاب	۱/۸
تصویر (زیر طبع)	اے۔ آر۔ خاتون	۵/-
افشاں (زیر طبع)	〃	۵/-
بدنام بستی ناول	انتصار حسین	۲/-

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور

امپلی ناسشن ۔ ایک ایسا کھیل اور سبق جو علمی معلومات اور قابلیت بڑھاتا ہے قیمت ایک روپیہ چودہ آنے

فہرست مضامین

دو دوست

علامہ اقبال

عبدالقادر کے نام

"علامہ اقبال مرحوم نے جو میرے نام پیام دیا تھا"

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر

بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اگرچہ ہماری زندگی کی راہیں الگ الگ رہیں اور مستقل طور پر ہم نشینی حاصل نہیں رہی لیکن ایک طرح ان کا منشا پورا ہو کر رہا ۔ میری زندگی بھی خدمتِ اردو میں صرف ہوئی ۔"

شیخ عبدالقادر

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر — قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز — جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ — چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں؛ — خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہر چہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

سر عبدالقادر کا آخری پیغام

میں نے اپنی عمر میں بہت سے رسالوں کو خیر مقدم کہا۔ اور بعض کے لئے نام تجویز کئے۔ جو پسند کئے گئے۔ اوراق کے نام کی تجویز میں میرا دخل نہیں۔ یہ نام میرے فرزند ریاض قادر اور اُن کے دوست ناصر کاظمی نے انتخاب کیا ہے۔ جو مشترکہ طور پر اس کے مدیر ہیں۔ اور دل سے چاہتے ہیں کہ رسائل کی اس کثرت کے زمانے میں کوئی ایسی چیز پیش کریں جو جدت کے ساتھ معلومات کی عمدگی اور مضامین کی رنگا رنگی سے ممتاز ہو۔ میرے خیال میں اُن کی یہ آرزو حوصلہ افزائی کے قابل ہے۔ اور اس کے لئے بعض پہلوؤں سے اوراق موزوں نام ہے۔ کسی نئی چیز کو بروئے کار لانے کے لئے اگر نام سادہ ہو اور اس میں یہ گنجائش ہو کہ کاغذ پر پہلے لکھی ہوئی کوئی سطریں موجود نہیں جو رہوارِ قلم کی رفتار کو محدود کریں۔ بلکہ قلم کے سامنے ایک کھلا میدان ہو جس میں وہ روانی کے ساتھ جولانیاں کر سکے۔ تو اس مطلب کے لئے اوراق سادہ سے بہتر جولانگاہ نہیں ہو سکتی۔

میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ مدیران اور ان کے رفقائے کار ان اوراق پر ایسی چیزیں لکھیں اور لکھوائیں جو اُردو ادب میں ایک نئے اور مفید باب کا اضافہ کریں۔ اور جن میں نوجوان اور ہونہار ادیبوں کی فن کاری کے بہترین نمونے شائع ہوں۔ کیونکہ اردو ادب کو آجکل پہلے سے بھی زیادہ ضرورتِ خدمت ہے اور بڑھنے کے مواقع بھی باوجود اُس دشمنی کے حاصل ہیں جو بعض برصغیر میں نمودار ہیں۔ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ مخالف اثرات کا مقابلہ کرے اور اُردو کے درجے کو بلند رکھنے میں کامیاب ہو۔

مدیران چاہتے ہیں کہ پختہ کار ادیب بھی اپنے تعاون اور سرپرستی سے ان کو ممنون فرمائیں اور اس زبان کو تقویت پہنچائیں جس کی خدمت میں انہوں نے اپنی عمروں کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پرانے اہلِ قلم حضرات خوشی سے اس کام میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ ہر چند کہ میری صحت کچھ عرصے سے اچھی نہیں ہے۔ میں حتی الوسع اپنے دوستوں کے ساتھ اس خدمت میں شریک ہوں گا۔

ریاض قادر

اِک شمع رہ گئی تھی

ایک۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ اور اسی طرح دَورِ حاضر میں ہماری قوم، ہمارے ادب، ہمارے موجودہ کلچر، ہماری تمام تر موجودہ اقدار کے معماروں کی صف ماضی کے دھندلکوں میں غائب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور کون جانے وہ روحیں جو یہاں اس قدر زندہ و تابندہ خاطر تھیں۔ جو اپنی قوم، اپنی ملت اور انسانی ارتقا کے لئے اس قدر بے کل اور بیتاب پا رہتی تھیں۔ اس وقت بھی آنکھوں میں پہلی سی امید اور چمک لئے زمانے کی رفتار کو۔ اور زندگی، اور تحریک بخش رہی ہوں۔ وہاں جہاں ازل اور ابد کی سرحدیں ایک ہیں۔ اور آج اور آنے والا کل گذشتہ صدیوں سے ہمکنار اور ہمکلام ہیں۔

وقت کے ہاتھ سے آج تک کون بچ نکلا۔ کس کس تہذیب نے چٹانوں پر سر نہ ٹپکا۔ کن کن سلطنتوں نے دم نہ توڑ دیا۔ کس کس کے غرور نے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ کس کس کے ذاتی وقار، کس کی اولوالعزمی، قومی محبت، خلق کی خدمت، انتھک قربانی، جاہ و جلال، نخوت و حشمت، غرور، خداترسی تمام تر اعلےٰ اور ادنیٰ خصائل پر قضا نے انگلی اٹھانے میں گریز کی۔ کس کس انسان کو ہو یلد نے اپنے ہم جنس سے نہ چھینا۔ انسانی ارتقا کے عروج کے زمانے میں بھی کب انسانی تاریخ کا سینہ پھٹ نہ گیا۔ اور کب غم کی فراوانی سے انسانیت کے سنہری ادوار نے وقتی طور پر اپنی چمک کھو نہ دی۔ اور کب زندگی کا دل قضا کے ہاتھوں بھر نہ آیا۔ کب کب نسلِ انسانی اپنے بہترین خزانے وفا کر سر جھکائے سوگوار نہ ہوئی۔ قضا کو کون روک سکتا ہے اور خدا کے کاموں میں کس کو دخل ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس تسلی سے ہی انسانوں کی پہلے زمانوں میں ڈھارس بندھی اور اسی تسلی سے آج بھی انسان صبر کی خو پیدا کر لیتا ہے۔ اس تسلی سے آج بھی انسان رضا پر مجبور ہے۔ انسان مظلوم اور پابند ہے

قضا کی انگلی اردو ادب کے سب سے بڑے معمار پر اٹھ کر رہی۔ اور زندگی کی آغوش کو اس کے ایک اور پیارے فرزند سے تہی کر گئی۔ قوم کا دل ایک بار پھر خون ہو گیا۔ اور اس کے سینے پر ان مٹ داغ رہ گیا۔ ایک درخشندہ باب کا آخری چراغ گل ہو گیا ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آج جب قوم اُن کی قیمتی اور مخلص ترین خدمات سے محروم ہے وہ اپنی قوم کے لئے اور اپنے خویش و اقارب کے لئے اُسی طرح موجود اور خندہ بلب ہیں۔ اُن کی وہ نرم گفتاری جس میں گرمئ جستجو جس قدر زیادہ تھی اسی قدر محض آواز کے حجم اور بے سود لفظوں کی تکرار اور ہاتھوں پاؤں کی جنبشوں اور لہجہ میں تحکمانہ رعونت اور اشاروں کی خود نمائی سے

گریز اُس کی نمایاں خصلت تھی۔ آج بھی ہر عمر اور ہر صنف کے لوگوں۔ اور خصوصاً نوجوانوں کو مخاطب کر رہی ہے۔ اور روحِ امید کی دھڑکن رگ و پے میں دوڑا رہی ہے۔ جو یاس کی گہری تاریکی میں قوم کی خاموش مگر اہم روشوں میں بار ہا ارتقا کا پیغام بنی۔ کیونکہ امید کی دھڑکن خود زندگی ہے۔ اور جہاں قومیں اور افراد زندہ دل ہوئے۔ زمانہ اُن کی ٹھوکریں ہے اور ان کا ہر قدم ایک نئی آبادی۔ اُن کا ہر خیال ایک نئی روش اور ان کا ہر سانس ایک نئی ایجاد ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اور زندگی کے ہر زیر و بم کو ہر حالت میں ایسے زاویئے سے دیکھ سکنا کہ دل امید سے روشن رہے۔ یہی ایمان ہے۔ مومن وہی ہے جو زندگی پر ایمان لائے۔ اور یہ خصوصیت مرحوم میں تھی۔

انہوں نے زندگی کو بغور دیکھا۔ اور اس کی تاریکی کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کی تجلیوں پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے اپنی قوم کو بغور دیکھا۔ اور اس کی ساری قباحتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ارتقا اور قوت تعمیر کے امکانات سے نا امید نہ ہوئے۔ انہوں نے انسان کو بغور دیکھا۔ اور اُس کی ذلتوں پر صاف لفظوں میں بار ہا اصرار کرتے رہے۔ مگر مایوسی کا منہ دیکھنے سے انکار کیا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ ایسا ہُوا کہ انہوں نے اپنے لہجے کی مخصوص نرمی قائم رکھتے ہوئے میری کئی خوش فہمیوں پر یوں پانی پھیرا کہ "اعتماد اچھی چیز ہے۔ یہ عادت تو بذاتِ خود اچھی ہے کہ لوگوں کو اچھا سمجھو۔ مگر تمہیں ابھی لوگوں کو پہچاننا باقی ہے۔ لوگوں سے بھلا کرنا تو لازمی ہے۔ مگر اُن پر اعتماد کرنے کے بجائے انہیں پرکھنا سیکھو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

انہوں نے انسانوں کی ایذا پرستی کو سمجھا اور نرمی روی کے قائل ہوگئے۔ انہوں نے طبیعتوں کی تلخی کو اپنے ملک میں عام پایا اور ان کی طبیعت شیریں سے شیریں تر ہوتی گئی۔ انہوں نے قوم کو سرنگوں دیکھا اور اُن کا جذبۂ قومی شدید تر ہو گیا۔ انہوں نے اپنی محبوب زبان اردو کے دشمن بڑھتے دیکھے اور قومی اخوت کا بہترین ذریعہ اردو کو گردانا۔ انہوں نے زبان اور کلچر کے رشتے پر نظر رکھی۔ اور زبان اور قومی ترقی کا گہرا تعلق ایک نظر میں بھانپ لیا۔ سیاسی جد و جہد کی عارضی کشمکش سے کچھ ہٹ کر ان کی نظر بنیادی مسائل پر ٹھہری۔ اور یہ خوب جانتے ہوئے کہ سیاست بھی ذاتیات کی اُلجھنوں کے باعث قومیت کے اصل تک پہنچ نہیں پاتی۔ اور اپنے دائرے سے ماورا جستجو کی محتاج ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ سیاست نظم تو دے سکتی ہے۔ حفاظت تو کر سکتی ہے۔ ملک کے اجتماعی مسائل اور حالات۔ اجتماعی نظام اور اس کی ترقی اور حفاظت۔ قومی زندگی اور قومی حقوق۔ ان سب کی ضامن تو ہو سکتی ہے۔ بنتے بگڑتے حالات کو سنبھالا تو دے سکتی ہے۔ زندگی کی بنیادیں تو ڈال سکتی ہے۔ مگر زندگی کی تعمیر تو ماہرین۔ اور سائنس دانوں۔ فن کاروں۔ مفکروں۔ صنعت و حرفت کے ماہروں۔ ادیبوں اور جملہ علوم کی دریافتوں اور ایجادوں کی ہمیشہ منت کش رہتی ہے۔ مرحوم کے طبعی انکسار نے تعمیر کا بظاہر آسان مگر طویل اور کٹھن راستہ انتخاب کر لیا اور سیاسی جد و جہد کی زیادہ چمک دار راہ عمل سے گہری دلچسپی کے باوجود نسبتاً کم متاثر ہوئے۔ اور ادب اور ادیب کی پرورش کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔

جس وقت جوان عبدالقادر نے ادب اور قوم کا جائزہ لیا۔ قدیم ادب کچھ دم توڑ چکا تھا اور کچھ تڑپ رہا تھا۔ قومی

زندگی سے انگریزی زبان اور انگریزی نظام نے گھیر رکھی تھی۔ اور جو رہا سہا ادب تھا۔ اور جو رہی سہی قومی زندگی تھی۔ وہ اپنی مخصوص ڈگر سے ہٹنے سے قاصر تھے۔ اور اگر ایک جماعت میں ایک نئی قومی زندگی جنم لے رہی تھی تو ابھی تک بیشتر باشندگانِ ملک۔ اُس سے اُسی طرح خائف تھے جیسے انسان ہمیشہ ہر نئی تحریک اور نئی ایجاد سے رہتے چلے آئے۔ اور مسلمانوں کی ہمدردی یہ تحریک اس لئے جذب نہ کر پائی تھی۔ کہ مسلمانوں کا مخصوص کلچر اور ملی رجحان اس سے کوئی بالواسطہ نسبت نہیں رکھتے تھے۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ گراں قدر علمی یا فنی خدمات سر انجام دینا یا ان کی توقع رکھنا یا زندگی کے مختلف شعبوں میں اختراع و ایجاد کا ظہور میں آنا ناممکن سی بات تھی اور بے محل امید۔

صحیح معنوں میں اجتماعی زندگی تب ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک جماعت یا انسانوں کا کوئی بھی گروہ یا اجتماع مشترکہ ضروریات کے باوصف۔ ایک طویل مدت تک یا ایک قلیل مگر شدید دور میں۔ وسیع پیمانے پر مشترکہ تجربات حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر جب مشترکہ المیوں۔ مشترکہ مصائب۔ مشترکہ مسائل۔ مشترکہ مقاصد کے حل کرنے اور حل تجویز کرنے۔ اور ان مقاصد کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے۔ اور ان سہولتوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے میں اور اُن ساری مادی اشیاء کو فراہم کرنے۔ اور فراہم کرنے کے بعد اُن ذاتی اغراض سے (جن میں مشترکہ حل کی سوچ اور فکر مفقود ہو) محفوظ رکھنے میں ہر فرد از خود مشغول نظر آنے لگے۔ تو جانئے کہ اجتماعی زندگی یعنی ایک سماج کے بالمعنی ایک تہذیب یافتہ گروہ کے۔ اپنی تعمیر کی پہلی منزل عبور کر رہی ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایسے وسیع پیمانے پر ایک گروہ کو مشترکہ تجربات حاصل ہونے لگیں۔ مشترکہ مسائل سے متعلق جدوجہد کی شعوری حیثیت بڑھتی چلی جائے گی۔ حتےٰ کہ یہ اجتماعی شعور۔ یہ عام اور مشترکہ آگاہی۔ کسی ایک ایسے نظام اور حکومت۔ کسی ایسے متعین نظم و نسق کی مقتضی ہو جائے گی جس میں یہ سارے مشترکہ مسائل منعکس ہوں اور جس میں ان ساری اجتماعی ضروریات کا حل ملحوظ رکھا جائے۔ اس منزل کو جہاں اجتماعی شعور۔ کسی صورت میں بھی۔ مشترکہ طور پر ایک ہی نظام یا ایک ہی حکومت کا مقتضی ہو۔ اگر قومیت کی۔ اور قومیت کے تصور کی بنیاد قرار دیا جائے۔ تو غالباً بجا ہے۔ ان تعینات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ نتیجہ شاید کوئی زیادہ وضاحت طلب نہیں کہ ایسے اجتماعی شعور سے پیدا شدہ ایک حتی المقدور مناسب اور مقبول نظام میں۔ ہر اہم مشترکہ ضرورت کو مشترکہ طور پر حل کرنے کے ذرائع اتنی کثرت سے فراہم ہو جانے چاہئیں۔ کہ اختراع و ایجاد کی پیش ازاں دشوار یا نامعلوم اور بعید القیاس راہوں کی فراوانی دیکھ کر عقل نگہ حیراں بن جائے۔ انسان کی تخلیق میں اور تہذیب انسانی کی تعبیر میں۔ قومیت اور قوم ارتقا کے زینے کی پہلی سیڑھیوں میں سے ہیں۔ قومیت ایک ذہنی فضا اور اس سے متعلق سماجی ماحول کا نام ہے۔ جس میں قوم کی تعبیر حتی الامکان میں آ جاتی ہے۔ اور جس کی تہ میں یہ بنیادی اصول کارفرما ہے کہ فرد جماعت کا رکن ہے۔ ایک منظم گروہ یا اجتماع یا سماج کی اجتماعی تعداد کی ایک اکائی ہے۔ اُس کے نصب العین۔ اُس کی مشترکہ اور اجتماعی بہبود کا خواہاں۔ اور اس کے نظام اور حکومت کا باعزت رکن۔ جہاں اس سماج کا نصب العین۔ اس منظم اجتماع کی حکومت اور اس کا قانون حفاظت تعزیر و سزا۔ افراد کی مشترکہ ضروریات کی نسبت سے قائم ہوتے ہیں۔ مگر جہاں فرد کی قیمت ا[illegible]ت

اس کی خدمتِ خلق۔ یا مشترکہ نصب العین پر پورے اُترنے کی خواہش اور قابلیت سے طے پاتی ہے۔ جوں جوں کوئی بھی سماج ان شرائط کو پورا کرتا جاتا ہے یا اس جانب اس کی اہلیت بڑھنے لگتی ہے۔ وہ ایک قوم بننے کے نزدیک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ قومیت کے تصور کا اصرار ہی کیونکہ اجتماعی زندگی پر ہے۔ اس میں فرد سے فرد کو متمیز کرنے کا کوئی اصول نہیں۔ بجز اس کے کہ افراد مشترکہ اجتماعی نصب العین کو سامنے رکھتے ہوئے خدمتِ خلق میں کس قدر زیادہ معاونت کرتے ہیں۔ اور خدمات سرانجام دینے میں اپنے کارکن ساتھیوں سے کس قدر سبقت لے جاتے ہیں۔ سو اس لحاظ سے قومیت انسان اور انسان کی برابری کا پہلا اصول مرتب کرتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان اور انسان کی تفاوت کا کوئی اصول نہ تراشنا۔ بجائے خود اس کے تصور کے احاطہ میں نہیں۔ گو قومیت اور قوم کی اوسطے تعریفیں بہت ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کو تسلیم کرنے میں ہمیں قومیت کی مندرجہ بالا تعریف سے ہاتھ نہیں دھونے پڑتے۔ کیونکہ اس سے صرف اس قدر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قوموں کو ابھی تک کہیں بھی قومیں ہونا نصیب نہیں ہوا۔ اور قومیت کے اصل کو کسی سماج کی بھی فضا۔ ذہنی یا بیرونی ابھی تک نہیں پہنچی۔ آج اس تحریر و تقریر کے زمانے میں ہمارے ملک میں قوم کا لفظ جس آسانی سے قلم سے ٹپکتا ہے اور زبان پر چڑھتا ہے۔ اُس آسانی سے ذہن میں نہیں اُترتا۔ جذبہ و زبان تو بن چکا ہے۔ جزوِ جان نہیں بن پاتا۔ جزوِ ایمان ہونے سے انکار کرتا ہے۔ آج جب ہم ایک قوم ہیں۔ ہم "قوم" نہیں ہیں۔ آج بھی ذاتی اغراض ترقی کی راہیں روکے کھڑے ہیں۔ اور اسی لئے جب ہمارے قائد اعظم کے مبارک ہاتھ اس محنت اور قربانی سے ایک عظیم الشان قومیت کی بنیاد ڈال چکے ہیں۔ سائنسدانوں اور فن کاروں کے ہاتھ اُسی طرح بندھے ہوئے ہیں۔ اُن کے ذہن اُسی طرح مفلوج ہیں۔ اختراع و ایجاد ابھی امید کے موڑ پر بھی نظر نہیں آتے۔ اور اس کی وجہ دشمن کا خطرہ نہیں (ہمارا معمار ہمیں ایک بہت پختہ عمارت تعمیر کر کے دے گیا ہے) اس کی وجہ وہ افراتفری اور ذاتی جدوجہد ہے جو ایک نئی دولت کی چمک دمک دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ فرد نے اپنے ذاتی تقاضوں کی وجہ سے قوم سے بغاوت کر دی ہے۔ جب دشمن سے نفرت کا وقت آتا ہے تو ہم ایک قوم ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی باہمی محبت۔ ملّی اخوّت کا نام لے دے یا ثبوت چاہے۔ تو ہم افراد ہیں۔ جیسے کہ خدانخواستہ اور خاکم بدہن نفرت ہی ہمارا آپ کا قومی نصب العین اور آئین قرار پایا ہو۔

کیونکہ قومیت کی بنیاد اجتماعی ضروریات اور محض ذاتی اغراض اور ضروریات کے تفاوت پر قائم ہے۔ اس کے تصور میں بجائے خود جغرافیائی حدود یا وقتی سیاسی حدبندیوں پر کوئی اصرار نہیں۔ اس میں اور بین الاقوامیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں فرق صرف ارتقا کے مدارج کا ہے۔ منزل مقصود بین الاقوامیت ہی ہو سکتی ہے۔ سماجی شعور کی وسعت ہمیشہ بڑھتے رہنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ سماج کی تہ میں اصول انسان اور انسان کی برابری کا ہے۔ قومیت کے معنی ہیں مشترکہ نصب العین اور "مشترکہ" کے معنی ذہن میں لاتے ہوئے۔ ہم اعداد و شمار سے متعلق تو ہیں۔ مگر اعداد و شمار کے تعین سے بے نیاز ہیں۔ قومی شعور جوں جوں وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اپنے اس بنیادی اصول سے منسلک اور آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غالب کی آواز

یوں کہ اس شعر کے مفہوم میں ڈھل جاتا ہے۔ ؎

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

لہٰذا قومیت انسانی زندگی، انسانی تہذیب، انسانی ارتقا کی بنیاد ہے۔ اور ایک ایسے زمانے میں جبکہ علم و فن کا فقدان ہو۔ اور کسی قسم کی علمی تفتیش و دریافت ہو رہی ہو۔ ہر ایسے شخص کے لئے جسے قدرت نے نظر بخشی ہو۔ قومیت کے مسئلے کو اہم ترین قرار دینا اور اس بارے میں کوشاں رہنا گویا ایک مذہبی فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کبھی بھی کوئی ایسا شخص جس کی روح شخصی اور ذاتی مطمع نظر سے بلند ہو کر اجتماعی زندگی، سماجی شعور میں ڈھل چکی ہو۔ جس کا دل قومی ارتقا کی ہر اونچ نیچ کا ساتھ دیتا ہو۔ جس کا ہاتھ ہمیشہ سماج کی نبض پر رہتا ہو۔ اور جس کی زندگی اور زندگی کی امنگ اسی نبض کی رفتار کے اشاروں پر چلتی ہو۔ جس کی مسرت اور شادمانی قوم کی مسرت اور شادمانی سے ہو۔ اور جس کو قوم کی زبوں حالی خون کے آنسو رلا دیتی ہو۔ قوم کے شیرازے کو پریشان دیکھتا ہے تو وہ خود کو قوم کی محبت میں کھو بیٹھتا ہے۔ اور کسی نہ کسی شکل میں مصلح قوم اور ایک نئے ماحول کا معمار بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ عبدالقادر جو اس وقت ایک مفکر نوجوان تھے۔ ایک ایسے ہی معمار ثابت ہوئے۔ ان کی جگہ ان کی ذہانت۔ ان کی سی نظر رکھنے والا کوئی اور شخص جسے اپنی ذاتی بہبود اور انفرادی خود نمائی سے معمولی سی بھی دلچسپی ہوتی۔ شاید کسی ایک خاص فنی یا علمی شاہکار کی فکر کرتا۔ جس سے اس کا شہرہ ہو جائے۔ اور جس سے اس کی قوم کو بھی اگر ہو سکے تو نفع پہنچے مگر ان کی ذہانت ان کی قوم تھی۔ اور ان کے اس خلوص اور اس عشقِ حقیقی نے انہیں وہ راہ سجھائی۔ جو محض ذہانت کے بل پر جس کی ان کے ہاں کبھی کمی نہ رہی۔ نہ سوجھ سکتی تھی۔ علمی یا فنی رہبری کے لئے اور یہاں تک کہ سیاسی رہبری کے لئے بھی۔ تو کسی ایک راستے کو انتخاب کر لینا اور اس پر مستقل اور انتھک محنت سے عمل پیرا رہنا ہی۔ ایک غیر معمولی ذہانت رکھنے والے انسان کے لئے خاصہ کامیاب اور نسبتاً یقینی ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر ایک پوری قوم کی ایک پوری روش میں تبدیلی پیدا کرنا۔ جزو پیغمبری ہے۔ اور اس میں غیر معمولی ذہنی خصائل رکھنے کے علاوہ۔ کسی خاص شعبۂ علم و فن میں ممتاز ہونے کے علاوہ۔ اختراع و ایجاد کی قابلیت کے علاوہ۔ تخلیق کی قوت کے علاوہ۔ شخصیت کی تکمیل کی ضرورت ہے۔ اور اس عمیق نگاہ پیدا کرنے کی جو وقتی الجھنوں کے دھندلکوں میں سے سماج کے مستقبل کے تقاضوں کو بے نقاب دیکھ لے۔ تاثیر صاحب کے مضمون کا کا عنوان یا سیاسی اہلیت کی طرف اشارہ ہے۔ تاثیر صاحب اپنے مضمون کے آغاز میں فرماتے ہیں۔ "شیخ صاحب کوئی بہت بڑے ادیب۔ بہت بڑے نقاد۔ بہت بڑے سیاست دان یا لیڈر نہ تھے۔ مگر ان کا تعلق ادب۔ تنقید۔ سیاست اور لیڈری سے بہت گہرا تھا"۔ اس فقرے کا اطلاق ان کی زندگی پر خاصہ صحیح ہے۔ اس میں شاید گھٹایا تو نہیں جا سکتا۔ کچھ بڑھانے کی البتہ گنجائش ضرور نظر آتی ہے۔ وہ یہ سب تو نہ تھے۔ گو انہیں اس ملک میں اور اس دور میں بڑا ادیب کہنا ہی پڑے گا۔ مگر وہ تھے جو ہر بڑے سائنس دان۔ ہر بڑے فن کار۔ ہر بڑے لیڈر۔ ہر بڑے عالم۔ ہر بڑے ادیب اور ہر بڑے سائنس کو ہونا بارہا نصیب نہیں ہوا۔ وہ ہمارے ملک میں اس دور کے ایک بہت بڑے انسان تھے۔ وہ اس ملک میں اس پہلا

نصف صدی کی مکمل ترین شخصیتوں میں سے تھے۔ وہ مسلمانانِ قبل از تقسیم ہند کی نصف صدی کی کلچر کا ایک بہترین نمونہ تھے۔ وہ انسانی تہذیب کے بہترین خصائل کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اگر ملکی سیاست ایک قومیت کا نیا سانچہ تراش رہی تھی۔ تو ان کے وہ ہاتھ تھے جنہوں نے اصل قومیت کے اجزا پہلے پہل۔ اس سانچے میں ڈھلنے کے لئے ڈال دئے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ سیاست انسانی ارتقا کا ذریعہ ہے۔ کوئی نصب العین نہیں۔ زندگی کی رفتار کا بڑھتا ہوا عکس ہے۔ خود زندگی یا رفتار نہیں۔ اقتصادی اور معاشرتی اقدار اور بنتے۔ بگڑتے۔ اور مسلسل بدلتے ہوئے اور نئے نئے پرچم بلند کرتے ہوئے حقوق کے مطالبات اور تحفظ کا عملی جامہ ہے۔ ذریعہ مقصد ہے۔ مگر خود مقصد نہیں۔ سماجوں کی یا بین الاقوامی رابطوں کی ہر نئی منزل کا زینہ ہے۔ کوئی سماجی یا بین الاقوامی منزل نہیں۔ اور یہ کہ سیاست زندگی کے لئے ہے۔ نہ کہ زندگی سیاست کے لئے۔ انہیں یہ سب بخوبی معلوم تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ زندگی امیروں کے گھر کی لونڈی ہو تو ہو۔ مگر انہیں تک محدود تو نہیں ہے۔ اور کسی خاص طبقے یا گروہ کی میراث نہیں۔ اور اسی لئے سیاست اور حکومت اور قوموں کی تعمیر کے مسائل ہمیشہ پردہ پوشیوں کے باوجود وسیع معاشرتی مسائل سے متعلق رہے ہیں۔ لہذا حقوقِ انسانی کی حفاظت کے لئے ہر باشعور شہری کا معاشرتی اصولوں کو سمجھنا قطعی فرض کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جمہوریت انسان کا وہ پیدائشی حق ہے۔ جس کی تسکین طلب کرنے کے لئے اُسے صرف ذی ہوش اور بالغ ہونا درکار ہے اور رائے شماری محض جہالت کا ہتھیار بن جاتی ہے۔ اگر معاشرتی شعور ہر فرد کی کوشش اور معاونت کے ذریعے حکومت اور سیاست کا رفیق کار نہ ہو۔ شیخ عبدالقادر اس وسیع النظری اور ہمہ گیر آگاہی کے سبب سیاسی لیڈری سے گریز کر گئے۔ اور یہ کام اُن ممتاز ہستیوں کے حصے میں آیا۔ جنہوں نے وقت کی چاپ سُنی۔ وقت کو قوم کو بلاتے سُنا۔ اور ایک جذبۂ بے اختیار شوق سے آگے آگے ہو لئے۔ شیخ عبدالقادر نے رہروانِ درماندہ کی صدا سنی۔ اور ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ سیاست زندگی کی تعمیر کے مسئلے کو بھول کر آگے چل دی ہے۔ شوق اپنی منزل سے آگے نکل گیا ہے۔ اور یہ دیکھ کر کہ انہوں نے اپنی ذات کا جائزہ لیا۔ اور اپنی رُوح کو "وفاداری بشرطِ استواری" کے ساتھ نرم روی کا پیغام دیتے ہوئے۔ قومی زندگی کی تعمیر کی بنیاد ادب کے ذریعے۔ جا بجا تقاریر کے ذریعے۔ کلچرل تحریکات کے ذریعے۔ قدم بقدم۔ دوش بدوش۔ خشت بہ خشت رکھنا شروع کی۔

ہمارے ملک میں تو یونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ کوئی تعمیری کاموں کا بھول کے بھی نام نہیں لیتا۔ جلسے جس قدر چاہیے کر لیجئے۔ ہار جس قدر چاہیے پہن لیجئے یا پہنوا لیجئے۔ دھواں دھار تقریریں دل والوں کو تو غیر اشارہ ہی کافی ہے۔ اور ہزار دل دھواں دھار تقریریں حاضر۔ مگر کام کا نام لیجئے۔ اور جذبات کی رو لوٹ جاتی ہے۔ اور لوگ نظریں بچاتے سرکنے اور چلنے لگتے ہیں۔ جہاں ابھی مجالس کی گہما گہمی تھی سناٹوں کی بستیاں آباد ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی تعمیری مقصد بھٹک کر منظرِ عام پر آ بھی جاتا ہے تو اسے سیاسی یا ادبی یا بیوپاری نعرہ یا محض ہنگامی پکار یا اعصابی مریض کی چیخ بنتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ اور ساری کی ساری خلقِ خدا ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور انسانی ہجوم کی اس بلا کے کروڑہا پاؤں تلے ہر مقصد اور ہر کاروبار دفعتاً

چاہتا ہے۔ اور جب بھیڑ دہٹتی ہے تو ویرانی کا منظر دیکھ کر ہر فرد کے لئے ہر دوسرا فرد آئینۂ حیراں بن جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ سیاست بھی اور شعبوں کی طرح ایک شعبۂ کاروبار ہے۔ جس کے لئے ہر ایک اہل نہیں۔ جب کسی قوم یا ملک پر کوئی سخت وقت آن پڑے۔ تو سیاست کی جہازرانی کے لئے لازمی ہے کہ ہر کارکنندہ اپنی متعین جگہ پر اپنے فرائض پہلے سے زیادہ محنت اور خلوص سے انجام دے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ سیاست میں حصّہ لینا ہر باشعور شہری کے لئے فرضِ اولیٰ ہے۔ تو اس سے یہ تو مراد غالباً نہ ہو گی۔ کہ جملہ افراد سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا روزمرہ کا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر۔ دفاتر بند کر کے۔ دوکانوں پر قفل لگا کر۔ فیکٹریوں میں کام بند کروا کر۔ کھیتوں کو خدا کی نگرانی میں دے کر اسمبلی چیمبر کے سامنے آ کھڑے ہوں۔ اور محکمۂ امداد میں فوری داخلے کی اجازت طلب کریں تاکہ وہ یہ دُنیا پر روشن کر سکیں۔ کہ تمام قوم سیاست کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہل ہے۔ اور با جماعت سیاسی کاروبار میں مصروف ہے۔ جہاز کے کپتان کی ساری ناخدائی بیکار رہے۔ اگر جہاز کی مشین کو چلانے والے مفقود ہوں یا ناقص ہوں۔ اور سیاست کی باگ ڈور ایسے حالات میں سنبھال لینا خود اعتمادی تو شاید کہلا سکے۔ حقیقت شناسی اور دور اندیشی تو یقیناً نہیں ہے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں۔ کہ جب جوان عبدالقادر نے گردوپیش کے حالات کا اس نظر سے جائزہ لیا۔ کہ اُن کی مخصوص ذہانت اور جذبۂ قوم کے لئے کونسا راستہ موزوں ترین ثابت ہو سکے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنہوں نے سیاسی رہبری کا راستہ اختیار کیا۔ اُن میں سے کون کون اور کہاں تک ہمارے مثال کے کپتان کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ اور کہاں تک اُن کی ہی وہ کاوشیں تھیں۔ جن کا پھل آج ہم آزادی یا قومی راج کی صورت میں پا رہے ہیں۔ سیاسی نگاہ جب اس قدر بے ساختہ طور پر ظہور میں آئے۔ جیسے کہ انڈین نیشنل کانگرس کے آغاز سے مسلم لیگ کے جنم لینے تک قبل از تقسیم ہند میں اور بعد ازاں ہوا۔ تو اس بارے میں سوال و جواب بے سود ہو جاتے ہیں۔ کہ سیاسی کارروائی کے لئے حالات میں کوئی جواز تھا بھی۔ یا کوئی اساس اقتصادی یا عقلی تھی بھی یا نہیں۔ ناظر کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ کہ وہ ان حالات کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے۔ ان کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لے۔ اور گہرے تجزیئے کے ذریعے اقتصادی اور معاشرتی طاقتوں کی جانچ پڑتال میں سیاسی مظاہر کی وجہ جواز کا سُراغ لگانے کی کوشش کرے۔ کسی گروہ یا طبقے یا سماج میں کوئی بھی گہرا تغیر کمیٹیوں کے فیصلوں سے ظہور میں نہیں آتا۔ اس کو منظرِ عام پہ لانے میں اس سماج کی گہری معاشرتی تبدیلیاں دُنیا کی بڑھتی ہوئی تاریخی رَو اور زمانے کے بے شمار اور بیک نظر ناقابلِ فہم تقاضوں کے ساتھ ہاتھ بٹاتی ہیں۔ سو یہ سوال کہ کانگرس کی لیڈری سنبھالنا چاہیے تھی یا نہیں۔ محض ان حقائق سے ناواقفیت ہی سُجھا سکتی ہے۔ اُن حالات میں کسی نہ کسی کو کانگرس کی لیڈری سنبھالنا پڑنی ہی تھی۔ اور کچھ لوگوں کو سنبھالنا پڑی۔ مگر اُس زمانے کے بیشتر قوم پرستوں نے ایک ایسی جدوجہد اور تگ و دَو کو خود سیاست ہی سمجھ لیا۔ جو درِ اصل سیاست کا پیش خیمہ تھی۔ اور جس کا فوری مقصد اور اثر فقط ایک ذہنی اور قلبی فضا پیدا کر دینا تھا۔ جو قومی سیاست کی اساس ثابت ہو۔ قومی سیاست کی بنیادیں تو پھر استوار ہوتیں۔ ابھی تو قومیت ہی کی بنیاد نہیں رکھی گئی تھی۔ اور کیونکہ فوری مقصد انگریز سے

پا لیا تھا۔ اور اس منزل کا راستہ بہت پُرخار تھا۔ قومی مقاصد اور خود قوم کے مفہوم کی وضاحت بر دوش فرما ڈالی گئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا باہمی تفاوت۔ اس مسئلے کا قومیت کے مسئلے سے گہرا تعلق۔ قومیت کے مسائل کا اُس ٹڈی دل مفلسی کی طرح ایک حاجب الاواقوجہ کی حد تک عدم توازن تھا طلب جس کے نرغے میں آکر کروڑوں انسان ملک کی کم و بیش نوّے فی صدی مخلوق تھی ویران آنکھوں سے موت کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ ان سب مسائل کا حوالہ سیاسی پروگرام میں مفقود تھا یعنی ہمارے ملک کے سیاستدانوں کی نظر اُن سب چیزوں سے غافل تھی جن پر توجہ دیئے بغیر قوم تعمیر کرنا ناممکن ہے۔ اور قومیت کا تکلا ایک تیغ مسخرہ پن۔ اس سب تجاہل مخلصانہ کے پیش نظر کانگریس کی تحریک سے لے کر مسلم لیگ کے سیاسی اُفق پر اُبھرنے تک۔ جس کے ذریعے ان بنیادی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یعنی ہندو مسلم کا سوال۔ حل کے لئے پیش ہوا۔ سیاسی لیڈروں کی حالت مشتّہ اس لئے کہ پیشِ قوم مسائل کی بھول بھلیاں ہی ایسی تھیں۔ کہ اُس فرضی کپتان سے زیادہ قابلِ رشک نہ تھی جس نے جہاز کی مشین چلانے والوں کے بغیر طوفانوں سے مقابلہ کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور آج بھی ہمارے عزیز پاکستان میں۔ ہمارے مسائل کی بھول بھلیاں اس قدر زیادہ ہیں۔ اور فوری ضرورت دفاع اور تدبیرِ دفاع کی اس قدر اہم۔ کہ قوم کی تعمیر کے سوال کو ابھی "طلوعِ فردا" کا منتظر رہنا ہے۔ آج جب ہمارے ہاں ہمارے قابل اور ذہین قائدوں کے طفیل ہم بڑی بڑی آزاد قوموں کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا دیئے گئے ہیں۔ آج جب ہم اپنے ملک کی استعداد پر ناز کر سکتے ہیں۔ آج جب ہمیں آزادی خوشی کے آنسو رُلاتی ہے۔ آج جب ہم میں سے ہر فرد سرِ اونچا کر کے چل سکتا ہے۔ آج بھی حالات کے نرغے میں ہم کروڑہا بھائیوں کی مفلسی کا منظر دیکھتے رہنے پر مجبور ہیں۔ گو ہنوز اس وقت "تقدیر کا بہانہ" نہیں ہے۔ اور ہمیں نہ صرف یقین دلایا جاتا ہے۔ بلکہ ہمیں اعتماد ہے کہ ایسی قابل قیادت جو ہمیں نصیب ہے۔ اور جس کا دنیا کی ہم سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں میں اعتراف ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے بھنور کو کھلنا لازم ہے۔ اور جلد کھل کے رہیگا۔ مگر اس وقت ابھی قوم کی تعمیر کے مسئلے پر توجہ مخصوص طور پر مرکوز کرنے کی شاید اس سے کچھ کم ضرورت نہیں جیسی کہ اس وقت تھی جب بیسویں صدی کے پہلے چند سالوں میں شیخ عبدالقادر نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا۔ اور اپنے مشہور رسالے "مخزن" کی بنیاد ڈالدی۔ جو کہ نہ صرف رسالوں کی دنیا میں۔ بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور یہ اس زمانے کے بہترین ادیبوں کے کارناموں کے علاوہ۔ جن سے "مخزن" میں ایک ہموار معیاری سطح قائم رہی۔ خود اُن کی اپنی اُن تحریروں کے طفیل ہوا جن میں اردو ادب کے سوانح میں پہلی مرتبہ مضمون نگاری کی اُس روش اور اُس صنف کا کامیاب مظاہرہ ہوا۔ جو کہ مغرب میں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ اور ایسے سیدھے سادھے بے تکلف اور مؤثر اظہار کے لئے جس میں قاری اور مصنّف کے دماغوں کے درمیان براہِ راست رابطہ قائم ہو جائے۔ بہترین ذریعہ ثابت ہو رہی تھی۔ یہاں مراد اُس صنفِ ادب سے ہے۔ جسے انگریزی میں "Essay" کہتے ہیں۔ یعنی بے ساختہ مضمون۔ اور کیونکہ یہ صنف خالصتاً مغرب کی اختراع ہے۔ اسے اردو میں بھی سہولت کے لئے "Essay" ہی کہنا مناسب ہے۔ یہاں شاید اس بات کی طرف توجہ دلانا بے موقعہ نہ ہو۔ کہ شیخ

عبدالقادر کے اُن احسانات میں سے۔ جو انہوں نے خالصتاً اردو ادب پر کئے۔ اردو کو اس صنف یعنی "Essay" سے متعارف کرانا شاید کسی اور احسان سے کم نہیں۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں "Essay" کی صنف کے بانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور وہ اس لئے نہیں کہ ان کا "Essay" کی صلاحیتیں اور نمونوں کو اردو کے ادیبوں کی دسترس میں لے آنا کوئی نصب العین یا مقصد حیات تھا۔ اُن کا اُردو کو "Essay" کی صنف سے مزین کرنا اور "Essay" کے ذریعہ اظہار کے لئے نئے راستے آنے والے ادیبوں کی آمد و رفت کے لئے کھول دینا اور اجاگر کر دینا۔ ایک خالصتاً ادبی کارنامہ ہے۔ اور اس کی قدر و منزلت متعین کرنے میں شیخ عبدالقادر مرحوم کو خالصتاً ادیب کے طور پر دیکھتے ہوئے۔ اس دور کے بہت اُونچے درجے کے ادیبوں میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ مگر تاریخ ادب میں "Essay" کے ظہور کی وجہ جواز اور معرف مصنف کی ذات کے مخلص ترین اظہار کی تلاش ہے۔ "Essay" کے لغوی معنی غالباً کوشش کے ہیں۔ مگر ایک بلند پایہ شخصیت کے ہاتھ میں "Essay" محض کوشش یا مشق سخن تو ظاہر ہے کہ نہیں کہلا سکتی۔ اس کے وجود میں آنے کا سبب یاد رکھتے ہوئے۔ ہمیں اس صنف کے کسی مضمون نگار کی تصانیف کا جائزہ لیتے وقت۔ ان میں مصنف کی شخصیت کے نقش کی تلاش ہو گی۔ اور اُسی حد تک اُنہیں کامیاب یہ ساختہ مضامین یا "Essays" کہنا بجا ہو گا۔ جس حد تک اُن میں شخصیت نمایاں ہو گی۔ اور اس نسبت سے ایسے مضامین کو اعلے ادب میں شمار کرنا مناسب ہو گا۔ کہ ان میں جس شخصیت کا نقش بلا کسی رسمی تکنیک کے ذریعے کے موجود ہے۔ کہاں تک۔ کسی ایک نقطہ نگاہ سے یا کئی وجوہات کے سبب قابل احترام۔ جاذب اور قابل قبول ہے۔ سو اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ اس صنف کے مضامین کی ادبی قدر متعین کرتے وقت۔ انہیں ادب کی اور اصناف کی نسبت کہیں زیادہ شخصیت کے پس منظر میں (لہٰذا زندگی کے پس منظر میں) دیکھنا پڑتا ہے۔ اُن تحریکات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ جن کے سبب احساس کا جام اس قدر لبریز ہو کے رہا۔ کہ اُسے اظہار میں نمایاں ہوتے ہی بنی۔ اور اسے اس برجستہ سادگی کے ساتھ اتنے بے تکلف اور براہ راست پیرایۂ بیان میں ڈھلنا ہی پڑا۔

شیخ عبدالقادر کی تصانیف۔ کیونکہ وہ تشہیر سے آراستہ نہیں کی گئیں۔ اور کیونکہ شاید مقدار پسندوں اور حجم شناسوں کے لئے۔ ان کی مقدار اور حجم معیاری نہیں ثابت ہو سکے۔ ان کی ادبی خدمات کو اُن کے اصل پس منظر میں نہیں پرکھا گیا۔ اُس اسلوب نگارش کے معترف ہوتے ہوئے بھی۔ جسے متفقہ طور پر اردو کا سرمایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور دور جدید کی نثر کا آغاز مانا جاتا ہے اس ادبی کارنامے کا ہمارے بڑے بڑے نقاد اُچٹتے ہوئے انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ اور مرحوم کے ذاتی خصائل کی طرف گریز کر جاتے ہیں جیسے کہ کہتے ہوں۔ کہ کیا ہوا اگر انہوں نے خود قلم نہیں اٹھایا۔ ان کی شخصیت تو آخر کشش رکھتی تھی۔ وہ مخلصانہ سرپرستی کے طفیل کچھ دوسروں سے تو لکھوا ہی لیتے تھے۔ میری ناقص رائے میں ان کی ادبی حیثیت۔ ان کی شخصیت بطور ایک ذومعنی نمائندے کے۔ کسی ایسی دوست داریوں اور اسالیب تنقید کے توازن کی نمائش۔ اور ان کے ذاتی خصائل کے متعلق اعلان انصاف۔ اور مخلصانہ معذرت ناموں کی محتاج تو نہیں ہے۔ ان کی ادبی عظمت اس قدر تو محتاج بیاں نہیں ہے کہ محض اپنے ہی

پاؤں کے بل نہ کھڑی ہو سکے۔ مقامِ خلافت جو شاید اردو ادب میں مولانا شبلی کے لکھے ہوئے سفرنامے کے بعد صرف انشاء سفرنامہ تھا۔ اس کا معرضِ وجود میں آنا ہماری ادب کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارے کا طلوع تھا اور بلا مبالغہ اس کے ظہور کی نوعیت کسی معجزے سے کم نہیں۔ پہلے تو مصنف کے سفر میں بظاہر ترددکے شروع کئے مضمون کو انتخاب کرنا ہی۔ ہمارے قارئین کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک دلیرانہ اقدام تھا اور پھر جس باوقار اور انداز کی حسن و لطافت اور دل نشینی سے خلافت کے زمانے کے ترکستان کی تصویر انہوں نے کھینچی ہے۔ جسے قاری یوں بے تکلف پڑھے جاتا ہے۔ جیسے کہ وہ کوئی قصہ یا ناول پڑھ رہا ہو۔ ہماری تاریخ ادب میں اسلوبِ نگارش کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ مگر اس کے سحرِ بیان سے مرعوب ہوکر۔ پڑھنے والے یہ بھول سکتے ہیں کہ اس سفرنامے کی تخلیق کا محرک کونسا جذبہ تھا۔ اور اس کو پیش کرنے میں مصنف کو کیا کیا کہنا۔ بتانا اور سمجھانا مقصود تھا۔ اس گراں قدر ادبی شاہکار کے ورق جہاں کہیں سے چاہئے اُلٹ لیجئے۔ اور بغیر کسی گہری تنقید کی ضرورت کے۔ یہ بات واضح نظر آجائے گی کہ اُن میں اسلام سے اور مشرق سے۔ اور پھر تمام قوم سے۔ کس قدر محبت جھلکتی ہے۔

خلافت کے ترکستان کی ایک نہایت مکمل تصویر جس میں مناظر کا نقشہ اس قدر واضح طور پر اور بالتفصیل پیش کیا گیا ہے۔ کہ مسافر اُسے بطورِ حوالہ استعمال کرکے جا بجا آسانی سے پہنچ سکے۔ اور ترکستان کی بیشتر قابلِ دید چیزوں سے نظریں سیراب کر سکے۔ اُسے ایک تاریخی پس منظر کے سامنے رکھ کر۔ اسلامی نصب العین کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے دو باتیں بہت صاف ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں وہی قوم کی تعمیر کا مقصد اس کی سب سے نمایاں خصلت ہے۔ اور یہی مقصد ایک سفر جیسے روکھے مضمون کو علمی فوائد کے پیشِ نظر۔ منظرِ عام پر لانے کا محرک ہے۔ اور دوسرے یہ کہ قوم کے معنی مصنف کے دماغ میں ہمیشہ ملت کے مفہوم کے تحت میں رہے۔ اور ہمیشہ۔ اسلام سے۔ اس کی تاریخ سے۔ اس کے اصولِ حیات سے۔ متعلق اور منسلک رہے۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہمارے ملک میں انگریز کے ہاتھ نہایت فولادی تھے۔ اور سلطان عبدالحمید خصوصیت سے انگریزوں کی پالیسی کے تحت۔ موردِ عتاب تھے۔ ان کا ترکستان کو سفر کے لئے انتخاب کرنا اور سلطان عبدالحمید سے محض اپنی ذاتی حیثیت میں۔ اور محض ذاتی عقیدت کے سبب ملنے کے بعد۔ اس محبت اور احترام سے ان کا سفرنامے میں ذکر کرنا۔ ان کی صائب رائے۔ آزادانہ نقطۂ نظر اور قوم پرستی کی بہت سی مثالوں میں ایک مثال ہے۔ یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ اس تصنیف کی بے شمار خوبیاں گنوائی جائیں۔ یہاں اس تصنیف کے حوالے سے بس اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ قوم پرستی مرحوم کی ذات کا کہاں تک جزو بن چکی تھی۔ اور کہاں تک وہ مجبور تھے کہ اپنی زندگی کا ہر قدم قوم کی نسبت سے اٹھائیں۔ اگر ان کی ادبی کارروائی صرف "مقامِ خلافت" ہی تک محدود ہوتی۔ تو ان کے اس دور کے بڑے ادیبوں میں شمار کئے جانے کے لئے کافی تھا اور ان کی قوم پرستی کا اور اصل سیاست کے متعلق شعور رکھنے کا بیّن ثبوت۔ مگر ان کے حبِّ قوم اور حبِّ ادب کو سمجھنے کے لئے جو کہ ان کے ہاں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایک ہی جذبے کے دو مختلف نام۔ ان کی اپنی تصانیف کے مخصوص موضوعات کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اور ان کے لکھے جانے کی وجہ سمجھنی پڑتی ہے۔ ان "Essays" یعنی بے ساختہ مضامین میں اُن کی شخصیت کا گہرا نقش۔

نظر ان کے جذبۂ قومیت کا گہرا نقش ملتا ہے۔

کسی بیدار مغز نقاد کے لئے ناممکن ہوگا کہ وہ ایک نظر میں نہ بھانپ لے کہ یہ تصانیف ایک بھرپور عشقِ قوم۔ ایک گہری انسان دوستی اور تہذیب دوستی۔ ایک دائمی کلچرل پیغام اور جذبۂ علم پروری۔ ایک مسلسل قومی انہاک۔ ایک نئی قومی زندگی کی خواہش اور اس زندگی کیلئے موزوں ماحول کی تعمیر کی جستجو اور کاوش کا بھرپور اور بے ساختہ اظہار ہیں۔ اور ایک نئی زندگی کی قدریں منوانے اور اس زندگی کی تصویر الفاظ میں پیش کرنے کے لئے۔ ایک ٹھوس مگر جذباتی ہرچند کہ "نسیم صبحگاہی" کی طرح نرم رَو اور اسی طرح روح افزا اور جاں بخش، پروپگنڈے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ پروپگنڈا کسی عام معنوں میں پروپیگنڈا نہ تھا کیونکہ اس کا خطاب ایک پورے سماج۔ ایک پورے ملک اور سارے دیس۔ اور ساری ملت سے تھا کیونکہ شیخ عبدالقادر کی تحریروں میں ایک ایسا نایاب اور پاکیزہ دل قوم کے لئے دھڑک رہا تھا جو ہماری ساری دَورِ جدید کی قومی ارتقا کی تاریخ میں۔ جہاں بے شمار دلدادگان قوم کے نام جھلملاتے ہیں۔ اپنی ایک اور مثال نہیں رکھتا۔ اگر ہم ہندوؤں میں گاندھی اور مسلمانوں میں اپنے قائداعظم کے ناموں کو چھوڑ کر تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیں۔

"مشعلِ راہ" کے عنوان سے "اوراق" کے اس شمارے میں جو شیخ عبدالقادر کی یاد میں نکالا جا رہا ہے۔ ان کی مخزن کی تصانیف میں سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جس میں ان کے عشقِ قوم کے یہ دونوں رخ واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ادب کے ذریعے قوم کی خدمت اور اسلوبِ نگارش میں خاموش انقلاب پیدا کرنے کے ذریعے خود ادب کی خدمت یوں تو "مشعلِ راہ" کو پڑھنے سے۔ شیخ عبدالقادر کی شخصیت کا پس منظر پیش کرتے ہوئے جن باتوں کا اس پیش لفظ میں ذکر آ چکا ہے اُن کا قارئین بآسانی خود ہی حوالہ پا لیں گے۔ مگر خود "مشعلِ راہ" کے لئے شاید مندرجہ ذیل اقتباسات مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

ایک جگہ اپنے مضمون "گھر سے نکل کے دیکھو" میں فرماتے ہیں "پس اگر حُبِ وطن کا ہندیوں پر یہ اثر ہو۔ کہ وہ اپنا گھر گھسنا بن چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے۔ نئے مقامات میں رزق ڈھونڈنے کی مشکلات کا سامنا کرنے نکلیں۔ تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ وطن سے نکل کر وطن کو یاد رکھیں۔ اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس کے حق سے غافل نہ ہوں"۔

اور پھر قابلِ غور ہے:۔

فرماتے ہیں۔ کہ "اگر ڈھب کے آدمی نکلنے لگیں۔ تو تجارت۔ زراعت۔ صنعت۔ اشاعت مذہبی۔ کئی اسباب تحریک کیلئے موجود ہیں"۔ یعنی دیکھئے کس سادہ انداز میں قوم کو اقتصادی اور معاشرتی ترقی کا آنا دیسع راستہ سجھایا گیا ہے۔ جس میں عنوان کا یہ تفریحی انداز "گھر سے نکل کے دیکھو" گویا یوں ہے جیسے کہ محض ذرا سی پُرلطف سیر اور سفر کا پیغام دے رہا ہو۔ اور غور طلب ہے کہ ملک کی معاشی ارتقا اور اشاعت مذہبی یعنی قوم اور ملت۔ مصنف کے ذہن میں کتنے ہم آہنگ اور ہم آواز بن چکے ہیں۔

قومی محبت کی شدت اور گہرائی کا اندازہ کیجئے۔ ذرا آگے چل کر اپنی ایک اسی موضوع پر مختصر سی نظم پیش کرنے سے پہلے اعتراف کرتے ہوئے کہ یہ نظم کوئی معیاری شاعری کی حیثیت نہیں رکھتی۔ فرماتے ہیں "شاعر ہوتا تو اس لمبی تحریر کی بجائے مختصر اور پُر زور نظم لکھتا جسے لوگ گاتے پھرتے"۔ کتنا خلوص۔ کتنی سادگی۔ کتنا قومی محبت کا نشہ۔ کتنا درد ہے ان چار سادہ سے معصوم سے الفاظ

میں یہ جیسے لوگ گاتے پھرتے ہیں:

اور پھر یہ سادہ سی نظم جو کہ شاعری کہلانے کی مستحق ہو یا نہ ہو۔ کم از کم اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں ایک دل لبھانے والے انداز میں اور بہت مختصراً اُن کی اُس قومی شخصیت کی ترجمانی ہے۔ جس کو پیش کرنے کی اس پیش لفظ میں ایک ادنےٰ سی کوشش کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

بخت آزمانے نکلو — جنگل بسانے نکلو
کڑیاں اٹھانے نکلو — جانیں لڑانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو
دولت کمانے نکلو — حکمت اڑانے نکلو
مذہب سکھانے نکلو — ہر ہر بہانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

ایک اور جگہ "مجالسِ تفریح" کے عنوان سے ایک مضمون میں کہتے ہیں: "یہاں کسی کو ہمت نہیں کہ شیکسپیئر کلب نہ سہی ایک "سعدی کلب" تو بنا دے" اور پھر سعدی کی عظمت کا احساس اس دلچسپ تقابل کے ذریعے دلاتے ہیں: "مرتے وقت وہاں کے ملک الشعرا ٹینیسن کی بھی انگلی شیکسپیئر ہی کی کتاب پر تھی۔ ہمارے خیال میں نہ صرف ایران بلکہ ایشیا سعدی پر ویسا ہی نازاں ہو سکتا ہے جیسے انگلینڈ یا یورپ شیکسپیئر پر"

ایک رسالے کے پیش لفظ میں تفصیلاً ایک ایک مضمون پر تبصرے کی گنجائش اور موقعہ نہیں۔ بلکہ جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ یہ شمارہ عام شماروں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور ایک بہت بڑی اور ممتاز ہستی کی یادگار ہے۔ جس کی وفات سے قوم کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جسے پُر کرنے کے لئے ابھی ملک اور قوم کو خاصی دیر انتظار کرنا ہو گی۔ کیونکہ ممتاز شخصیتیں ارتقا کی کئی منازل طے کرنے کے بعد ممتاز ہوتی ہیں۔ سو دنوں اور مہینوں میں یہ منازل عبور نہیں ہوتیں۔ وقت کے تقاضے کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں۔ کتنے ہی مخصوص قسم کی شخصیتوں کے متقاضی کیوں نہ ہوں۔ وقت کے پاس کوئی "کُن فیکون" کی طرح کا طلسم نہیں کہ ادھر ایک شخصیت کی کمی ہوئی اور اُدھر پوری ہو گئی۔ ڈاکٹر باقر نے اپنے مضمون میں شیخ صاحب مرحوم سے ایک گفتگو کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس اظہارِ رائے پر کہ جیسے علامہ اقبال کے ہم میں موجود نہ رہنے سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ اسی طرح اگر خدا نخواستہ آپ کا سایہ ہم پر سے اٹھ جائے۔ تو جو ہمارے درمیان آپ کی جگہ ہے اُسے کوئی اور پُر نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنے طبعی انکسار سے کام لیتے ہوئے یہ جواب دیا تھا۔ کہ کوئی بھی شخصیت ایسی نہیں جس کا بدل زمانہ نہ پیش کر سکے۔ ان کا یہ کہنا اُن کے انکسار کا تقاضا ہی نہ تھا (وہ مدعی انکسار کے قائل نہ تھے۔ نہ ہی انہوں نے انکسار کا سکہ کبھی منوانا چاہا) بلکہ یہ اُس ابدی حقیقت کا اعتراف تھا۔ جو انسان کی ایک بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ اور انسان کے ارتقا کی ضمانت ہے جس کے

سبب سماج کبھی بھی بہت دیر تک اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کسی ایک فرد یا کسی ایک بڑی سے بڑی شخصیت کی خدمات یا معاونت کا منت کش نہیں رہا۔

مگر گو شیخ صاحب کا یہ کہنا بجا تھا۔ اور ان کی بھرپور زندگی کے گہرے تجربات اور جائزوں کا نچوڑ تھا۔ جو نقصان ان کے ہمارے درمیان میں سے اٹھ جانے سے ہوا۔ اُس کی تلافی ابھی بہت دیر تک ناممکن ہے۔ اور اس سے پہلے کہ ایک اور ایسا محب قوم اور خادم ملت پیدا ہو۔ قوم کے ابھی بہت آنسو۔ اور جاں نثاران قوم کی ابھی بہت کاوشیں اور قربانیاں باقی ہیں۔

نیاز فتح پوری صاحب اپنے مضمون میں فرماتے ہیں "درا صل مخزن ایک شاہراہ تھی۔ جسے عبدالقادر کے دل و دماغ نے کاروان اُردو کے لئے نکالا۔ اور جب یہ کاروان اس شاہراہ سے ہٹا۔ تو پھر کسی مرکز پر جمع نہ ہو سکا۔ صرف اس ایک پہلو سے دیکھا جائے۔ تو ہماری زبان کی ارتقا میں عبدالقادر کا حصہ کچھ کم نہیں" نیازی صاحب کے اس جائزے میں مخزن کو جو اُردو زبان اور اُردو ادب سے نسبت تھی۔ اُسے ایک نہایت کامل استعارے میں سمو دیا گیا ہے۔ ذرا آگے چل کر کہتے ہیں "مخزن تو تھا ایک بھرے دور کا ترجمان۔ اور عبدالقادر اُس کی روح" تو گویا جہاں ایک طرف شیخ عبدالقادر: مخزن کی روح تھے۔ وہ ایک پورے دور کے روح رواں تھے۔ دورِ جدید کے اردو ادب کے لئے اور ایک پورے دور کی کلچرل تعمیر کے لئے اُن کی ہستی ایک طلسم تھی۔ جو کہ آج جب وہ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ایک رنگین افسانہ سا معلوم ہوتی ہے۔ جس کا تصور مکمل احاطہ نہیں کرپاتا اور عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ اور ان کا یہ تقریباً ناقابل یقین کارنامہ یعنی یہ کہ ان کی شخصیت ایک مکمل دور کا عنوان بن جائے۔ ایک مکمل دور کے تقاضے اپنی ذات میں سمو لے۔ کیونکر ممکن ہوا؟ جو ازشائد اتنا سیدھا سادھا ہے کہ پہلی نظر میں قابل قبول جواز نہ بن سکے۔ مگر اس سوال کا جواب ہے یہی ایک۔ اُن کی محبت اور خلوص کے سبب۔ اُن کی حق پسندی اور حق گوئی کے سبب۔ اور طبیعت کی اس بے باکی کے سبب جس میں اعلانِ ذات کا شائبہ نہ تھا۔ غلام بھیک کے الفاظ میں "ان کے ذاتی شعار میں عظمت محض کھلونا۔ اور خلوص اصل ایمان تھا"

مولوی عبدالحق نے اس جگہ کا جو شیخ عبدالقادر کو ان کی نظر میں اردو ادب میں حاصل ہے۔ ذکر کرتے ہوئے۔ انہیں یوں خراج تحسین ادا کیا ہے "اردو زبان کی جو بیش بہا خدمات انہوں نے کی ہیں وہ ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ اردو ادب کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور نقاد تھے" یہ منصفانہ فیصلہ جو بابائے اُردو کی قلم سے پنجاب کے بابائے اردو کی ادبی خدمات کے متعلق درج کیا۔ محتاج تفصیل نہیں۔ مگر اس فیصلے کے ایک حصے کے متعلق ایک دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں۔ اُن معنوں میں جو کہ آجکل ادبی تنقید کے لئے جانتے ہیں۔ مرحوم کی بہت کم ایسی تحریریں ہیں۔ جو کہ واقعی ادبی تنقید کے ارادے سے لکھی گئی ہوں۔ انگریزی میں ان کی ایک کتاب "New School of urdu Literature" (یعنی اردو لٹریچر کا نیا سکول) جس کے مضامین وہ لیکچر ہیں جو کہ ۱۹ اور ۲۲ برس کی عمر کے درمیان وہ ایک نوجوانوں کی ایسوسی ایشن کے سامنے پڑھتے رہے۔

اُن کی اور انگریزی یا اُردو تصانیف کی نسبت۔ ادبی تنقید کے تقاضوں سے قریب تر ہے۔ مگر اس مجموعے کے یہ لیکچر بھی تنقید کی غرض سے نہیں دیئے گئے تھے۔ ان کا مقصد تھا۔ ممتاز اور جانے پہچانے ادیبوں کی زندگیوں اور اہم تصنیفات کا پس منظر پیش کرنا۔ اور مختصر ترین طور پر ان کی تحریروں اور حالات کے منتخب بیان سے۔ نوآموز طالب علموں کے اکتساب علم کے لئے راستہ سہل بنا دینا۔ لہٰذا اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے بھی ہم خالص تنقید کے معیار نہیں استعمال کر سکتے۔ لیکن اپنے مقصد کی حد میں ان میں ایک ایسے اُونچے درجے کا تنقیدی عمل نظر آتا ہے۔ جو آج تک ہمارے ادبِ جدید کے نقادوں کو نصیب نہیں۔ اور اگر اسی ایک سیدھے سادے تنقیدی اصول کو یاد رکھ لیا جائے۔ (جسے باوجود اس کی واضح صورت اور سادگی کے۔ عام نقاد فراموش کر دیتے ہیں) کہ ہر تصنیف کو اس کے مخصوص مقصد کی حد میں اور اس کے موضوع کے دائرے ہی میں دیکھتے ہوئے اس کی صحیح جگہ متعین کی جا سکتی ہے۔ تو شاید بابائے اردو مولوی عبدالحق کی اس رائے سے کہ شیخ عبدالقادر اردو ادب کے اعلیٰ درجے کے نقاد تھے۔ ایک زیادہ صائب اور متوازن فیصلہ دینا آسان نہ ہوگا۔ اور تنقید کو اتفاق کرنے کے علاوہ یارائے اظہار نہ رہے گا۔

شیخ عبدالقادر کی بیشتر ادبی تنقید ان کے دیباچوں میں ملتی ہے۔ یعنی اُس صنفِ تحریر میں جس میں مقصد تعارف ہوتا ہے۔ نہ کہ تنقید۔ اور ایک مصنف کی خصوصیات سے قارئین کو متعارف کراتے ہوئے۔ باقی سب چیزوں سے زیادہ انتخاب کو دخل ہوتا ہے۔ نہ کہ کسی گہرے ادبی یا نفسیاتی تجزیئے کو۔ مگر انتخاب کرتے ہوئے ایک وسیع اور گہرے تنقیدی عمل کی ضرورت ہے۔ اور مصنف کی تصانیف اور شخصیت سے ایک اُس قدر مکمل تعارف جتنا کہ دیباچے کی محدود گنجائش پر ممکن ہے۔ صرف اُسی صورت میں کروایا جا سکتا ہے کہ شخصیت اور تصانیف، ان دونوں کے باہمی تعلق اور ان کے پس منظر کو ملحوظ رکھا جائے۔ اگر اُس تنقیدی عمل کے علاوہ بھی جو تعارف کے لئے لازمی ہے دیباچوں میں کوئی تنقیدی مضامین تلاش کرے اور تنقیدی مضامین پڑھتے ہوئے دیباچوں کا تعارفانہ انداز ان میں نہ پا کر مایوس ہونے لگے۔ تو وہ رہا اُس پڑھنے والے اور اس کی عقل کا معاملہ۔ اس پر زیادہ کہنے سننے کی تو گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ کئی مرتبہ یہ اعتراض سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ کہ شیخ عبدالقادر نے کیونکہ بہت اچھے لکھنے والوں سے لے کر معمولی لکھنے والوں تک کی تصانیف کے دیباچے لکھے ہیں۔ اور کسی کی صاف الفاظ میں مذمت نہیں کی۔ لہٰذا ان کے دیباچے کسی صحیح معیارِ تنقید سے مبرا نظر آتے ہیں۔ اس رائے سے زیادہ متعجب کرنے والی شاید ہی کوئی اور رائے ہو۔ دیباچے آخر مصنف کی خواہش سے لکھے جاتے ہیں۔ اور ایسا کونسا لائق مصنف ہوگا جسے اپنی مذمت کروانا مقصود ہو۔ اور یہاں تک دل سے اپنی مذمت چاہتا ہو۔ کہ اپنی کمیوں کی فہرست دیباچہ میں بنوا کر۔ اپنی تصانیف کو اس طشتری میں پیش کرے۔

مرحوم کا خلوص اس قدر تھا۔ کہ وہ بہت دیر تک مسلسل تقاضوں کو رد کرنے کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ مگر جب کبھی بھی کسی مخلص مصنف کو ان کی پدرانہ شفقت نے سراہا۔ اُسے مایوس نہ کرتے ہوئے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے نقادانہ ضمیر پر حرف نہیں آنے دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے خود مجھے ساتھ کے کمرے سے بلا کر۔ ایک ایسے ہی ادبی دریوزہ گر کے متواتر مطالبوں کے خطوط دکھاتے ہوئے۔ اور اس کی تصانیف کی معصومانہ کاوشوں کے نمونے سناتے ہوئے اپنی مخصوص مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ

جو ہونٹوں پر دبی دبی رہتی تھی اور ساری کی ساری آنکھوں میں سمٹ آتی تھی۔ کہا۔ دیکھو بھئی اب ان بیچارے لوگوں کا کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے آدمی کو کیا کوئی سمجھائے جسے اپنی ادبی صلاحیتوں پر اس بے علمی کے ساتھ اتنا زیادہ اعتماد ہو۔ اور پھر تعارف کرواتے ہوئے۔ کہدو کہ مصنف نالائق ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے۔ اور تعریف کے لئے اس کی تصانیف خود گنجائش نہیں چھوڑتیں تو بھئی میں نے تو اس تعریف پر عمل کر کے اس کے مسلسل تقاضوں سے جان چھڑائی ہے۔

دندانِ تو جملہ در دہانند ‏ ‏ ‏ ‏ چشمانِ تو زیرِ ابرو آنند

اور پھر اس شعر کے متعلق جو جو انہوں نے اپنے زبان پر مکمل عبور کے سبب مضمون میں پہلو بچا رکھے تھے۔ ان کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے وہ حسبِ عادت میری ہنسی میں ایک کھلے اور طویل قہقہے کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جو صرف اُسی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ جس کی زندگی کبھی کسی کے متعلق بُرا سوچنے یا برا کہنے کی اہل نہ رہی ہو۔ اُس دیباچے کا انداز جس پر یہ ہنسی ہوئی۔ کچھ ایسا تھا جیسے کوئی کہے کہ مصنف کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے۔ مصنف بہت پُرگو ہے۔ اس کے ہاں طویل نظمیں بھی ملتی ہیں۔ اور مختصر بھی۔ طویل نظمیں کچھ زیادہ ہیں اور مختصر کچھ کم۔ کچھ نظموں میں اقبال کے انداز میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اقبال کے کلام سے خاص لگاؤ ہے۔ مگر اس بارے میں کہ ان نظموں کا معیار بلند ہے یا پست۔ ان کا پیرایہ لطیف ہے یا کثیف۔ دیباچہ میں کوئی الفاظ نہ تھے۔ اب وہی بات ہے کہ عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہے۔ جہاں ایک عالم ادیب کو دیباچہ لکھتے ہوئے ایک پُرگو شاعر کے متعلق بیان میں مجبوراً صرف ایسی ہی باتیں انتخاب کرنی پڑیں۔ اور نفسِ مضمون سے صاف پہلو بچانا پڑے۔ تو اُس شاعر اور اس کی پُرگوئی کے لئے اس سے زیادہ مذمت نہیں ہو سکتی مگر پھر خیال آتا ہے کہ اُس کے اعتماد کو اس آسانی سے کہاں ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ جہاں مفلس ادیبوں کا تعارف کرواتے ہوئے۔ شیخ عبدالقادر کے اس "دندانِ تو جملہ در دہانند" انداز کو کئی صاحبان تعریف کی انتہا سمجھے بیٹھے ہیں۔ اور ان کے مخلص مداحوں کے لئے اُن کی شرافت کو اُن کی اس خوئے مدح و ثنا کا مجرم ٹھہرانا ہی۔ اُن کی نقادانہ عظمت کو تنقید کی زد سے محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ نظر آیا ہے۔

خیر ادبی تنقید۔ صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں۔ بلکہ ہر جگہ۔ کچھ دلائل کی بہت دلدادہ ہے۔ اور دلائل کے پہلے چند اصولوں سے بے نیاز۔ قانونی عدالت میں تو بے دلیلی سب سے بڑی غلطی ہے۔ بحث ذرا بھٹکنے لگی اور جج نے روکا کہ یہ دوسری بحث ہے اس کا یہاں موقعہ نہیں۔ اپنی جگہ درست شاید ہو مگر یہاں اس کا استعمال بے موقعہ کیا گیا ہے۔ فلاں فلاں بات اپنے مخصوص دائرے سے اور احاطۂ بیان سے باہر نکل گئی ہے۔ اور ایسی اور باتوں سے متعلق ہوتی جا رہی ہے۔ جو بحث کے کم از کم فوری مقصد میں شامل نہیں۔ مگر ادبی تنقید۔ تجزئیے کا نعرہ لگاتی ہوئی موضوعات کے جغرافئے۔ مضامین کی حدود پر خنداں۔ سرحدوں سے بے نیاز۔ سبک سیر اور تیز رفتار۔ منزلوں پر منزلیں طے۔ اور مہم پر مہم سر کئے چلی جاتی ہے۔ اور ادب شناس طبقہ "لبیک" پکار اٹھتا ہے۔ اور محفل تا محفل تحسین کی لہر دوڑ جاتی۔

شیخ عبدالقادر کے دیباچوں کے متعلق بس یہ ایک نقطہ کافی ہے۔ کہ جب بھی انہوں نے کسی ممتاز ادیب کی تصنیف کا دیباچہ لکھا ہے: اس کی ایسی خصوصیات گنوائی ہیں۔ اور ایسی مثالیں انتخاب کی ہیں۔ کہ مدتوں تک اس مصنف کی تحریروں کے ضمن میں عام نقادوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔ اور ان کی یہ خوبی ایک بہت بلند تنقیدی صلاحیت کا پتہ دیتی ہے۔ تجزیہ تنقید کا ذریعہ ہے۔ خود تنقید نہیں تنقید کے

معنی ہیں مضمون اور مصنف کی شخصیت کی روح کو پہنچ جانا۔ اور اگر یہ عمل قدم بقدم ہو سکتا ہے۔ تو ایک جست میں بھی ناممکن نہیں۔ بہترین تنقید صرف بتاتی نہیں سمجھاتی بھی ہے اور اس کی فضیلت سمجھا سکنے کی اہلیت۔ ہر اعلیٰ پایہ تنقید کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہ خوبی اگر تنقید کی امتیازی خصوصیت ہے۔ تو اس نظر سے دیکھئے۔ اور شیخ صاحب مرحوم کے دیباچوں کی حیثیت اس فنِ تنقید کے معیار پر پوری اُترے گی۔

اس بارہ میں ایک آخری نقطہ شیخ عبدالقادر کو بطور ادیب دیکھتے ہوئے۔ انہیں جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ مصلح قوم اور کلچرل لیڈر کی حیثیت میں دیکھنا ضروری ہے۔ نہیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ بڑے نقاد اس لئے نہ تھے۔ کہ انہوں نے دیباچے لکھے، سیاسی سوجھ بوجھ معمولی رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ کلچرل رہبر تھے وغیرہ وغیرہ۔ گمان کی وہ خالص تنقید (جو ان کے دیباچوں سے اور انگریزی کی اس تصنیف سے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ نمایاں ہوتی ہے) ایک مثالی حیثیت تو رکھتی ہی ہے۔ اُن کی قوتِ تنقید کا صحیح اندازہ ان کے اپنے ہی میدان میں لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی ان کے مضامینِ مخزن میں۔ اور یہاں تنقید کا موضوع ہم ادب نہیں پاتے۔ یہاں تنقید کا موضوع زندگی ہے۔ وہ قومی زندگی جیسے ابھی تعمیر ہونا تھا۔ اور جو ان کے ماحول میں سیاسی شعور میں جنم لے رہی تھی۔ جس کے مستقبل کا منظر ہمیشہ ان کی آنکھوں میں رہا۔ اور جسے ابھی ان کے ہاتھوں اور سیاسی رہبروں کے ہاتھوں پرورش پانی تھی۔ وہ ادب سے کہیں زیادہ۔ زندگی کے نقاد تھے۔ اور اس تنقید کا ذریعہ اور کئی ذریعوں میں ان کے ہاں ادب تھا۔ اور اس لئے گو وہ بہت کم تصانیف چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا ادبی کارنامہ کوئی عام کارنامہ نہیں۔

ان کی تصانیف۔ اور ملک اور قوم کی ادب کے ذریعے خدمت کا جائزہ لیتے وقت اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کی جگہ قائم کرتے وقت۔ جن الفاظ میں انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کے متعلق مضمون کا آغاز کیا ہے (جس کا ترجمہ وجیہ الدین احمد کی قلم سے ان اوراق میں شائع ہو رہا ہے) ہمیں جس احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہیں، وہ الفاظ اور ان کی تلقین ہمیں امید ہے کہ ہمارے قابل نقاد یاد رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ضمناً ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ عبدالقادر نقاد کی حیثیت میں کس قدر انصاف پسند تھے۔ اور تنقید کے اصول اور اسلوب سے کس قدر واقف۔

یہ ہیں وہ الفاظ:۔

"کسی وسیع تر اور زیادہ ترقی یافتہ زبان کا مورخ زبان کے خالصتاً ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے غالباً مولانا شبلی کی تصانیف کو اعلیٰ پائے کے ادب میں شمار نہ کرتا۔ گو انہیں سوانح اور تاریخ کے صیغے میں ایک بلند مقام کا مستحق ضرور سمجھتا۔ اردو زبان ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے۔ جنھوں نے ہمارے ادب کی بنیادوں کو استوار کیا ہے۔ ہم تنقید کے وہی معیار استعمال نہیں کر سکتے جن کی روشنی میں ہم کسی قدیم اور مکمل زبان کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے شبلی کو اردو ادب کے معماروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔"

شیخ صاحب کی وفات سے چند ہی مہینے پہلے محکمۂ تعلیم کی طرف سے وزیر تعلیم آنریبل فضل الرحمان صاحب نے ان سے استدعا کی تھی۔ کہ وہ علامہ اقبال کی شاعری کے چھ پہلو ایک لیکچروں کے سلسلے کی صورت میں مرتب کریں۔ ان کی تعمیری، ادبی اور قومی کاموں سے

لاجنت اور عزم کی دلیل ہے۔ کہ گو وہ اپنی وفات سے پہلے کم وبیش ایک سال سے بیمار ہی چلے آ رہے تھے۔ وہ کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے بیماری کی حالت میں بھی موقعہ پا کر یہ لیکچر لکھواتے رہے۔ مگر یہ ایک بڑا قومی نقصان ہے۔ کہ ان کی زندگی نے آخر ان کی محبت اور ادب دوستی کا ساتھ نہ دیا۔ اور وہ لیکچروں کے اس سلسلے کو مکمل نہ کر سکے۔ ان تحریروں کو لکھواتے وقت انہیں بہت حد ـ اپنی پہلی معلومات اور غیر معمولی یادداشت پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ کیونکہ صاحبِ فراش ہوتے ہوئے۔ انہیں مہلت نہ تھی کہ اس حد ـ کتابوں کا حوالہ سامنے رکھ کر اپنی تنقید کو مثالوں سے آراستہ کریں جتنا کہ وہ کرنا چاہتے۔ جس حالت میں ان آخری لیکچروں میں سے ایک ن اوراق میں تبرکاً پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی ادبی قیمت یہ ہے۔ کہ وہ ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہے۔ جس کو قریب سے دیکھنا اور ہرے دوست کی طرح عزیز رکھنے کا شرف مرحوم کو حاصل تھا۔ اور جس کی روح سے وہ اس طرح واقف تھے جیسے اُن کے سوا کسی ور کو ہونا نصیب نہ تھا۔ اور جو اعتماد اُن کی شخصیت پر علامہ اقبال کو تھا۔ وہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی نظم "عبدالقادر کے نام" میں مرحوم ہی کو اپنی زندگی کے عظیم نصب العین اور مشن میں رفیق سمجھا۔

حیرت انگیز تھی اس محبِّ قوم کی ہمت۔ بے اندازہ تھا اس رہبرِ قوم کا خلوص۔ کہ "آخر عمر میں جبکہ وہ بہت ضعیف تھے" انہوں نے اعزازی طور پر پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسری کے فرائض ادا کرنا منظور کیا۔ اور وفات سے تین ماہ قبل ابھی پھر اپنی ان خدمات کو جاری رکھنے کی فکر کر رہے تھے۔

ہمارے "اوراقِ نو" اُن کی ادبی سرپرستی سے محروم رہ گئے۔ اور ہمیں اُن کی پدرانہ شفقت اور حوصلہ افزائی سے۔ کس محنت سے انہوں نے ہمارے رسالے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے پیغام منگایا تھا۔ جو ہمیں افسوس ہے کہ گو مولوی صاحب نے خط میں یہ لکھا کہ میں اُسے بھیج چکا ہوں اور آپ کو ضرور مل گیا ہوگا۔ کہیں ڈاک ہی کے سلسلے میں کھویا گیا۔ اور ہمیں مل نہ سکا۔ کس دلچسپی سے آخر وقت تک جبتک کہ وہ ہوش میں رہے جب کبھی میری موجودگی میں اور میرے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے آنکھ کھولی۔ تو رسالے کے بارے میں ایک دو فقرے ضرور پوچھے۔ ہمارے کہنے پر وہ خود رضامند ہو گئے تھے۔ کہ وہ بشرطِ خیریت مضامین کا ایک سلسلہ جس کا نام "میری ملاقاتیں" ہوگا۔ ہمارے رسالے میں جاری کریں گے۔ گو پہلے شمارے کے لئے مجھے ایک صبح خاصی تکلیف کی رات گزارنے کے بعد کہنے لگے۔ کہ میں پہلی رات تو یوں نہیں سویا کہ ایک مضمون تمہارے لئے سوجھا تھا۔ اُس کا نقشہ دماغ میں کھینچتا رہا۔ اور پچھلی رات ایک تو یوں نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ اور پھر یہ مضمون میری مرضی کے خلاف دماغ میں گھومتا ہی رہا۔ میں تبھی تو کہتا ہوں کہ رسالے کی بات مجھ سے رات کو نہ چھیڑا کرو۔ مجھے یہ سن کر اپنی خود غرضی پر بہت ندامت ہوئی۔ اور اس کے بعد میں نے کبھی اپنی مرضی سے رات کو اُن سے رسالے کے متعلق مشورہ نہیں لیا۔

بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے بے شمار سکیمیں ہمیں سمجھائیں۔ جن میں ایک یہ تھی۔ کہ یہ رسالہ صوبائی اتحاد کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر تم صوبائی زبانوں کے ادبی شہ پارے ترجمہ کروا کے چھاپتے رہو۔ ان کا اس ضمن میں پہلا نام جو سوجھا تھا۔ وہ بنگال کے مشہور قوم پرست شاعر قاضی نذر الاسلام کا تھا۔ انہوں نے بارہا کہا کہ میں ذرا اچھا ہو لوں۔ تو کئی ایسے لوگ میرے ذہن میں ہیں جنہیں میں اس بارے

میں لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر ان کی حالت گرتی ہی گئی۔ اور نہ ہی یہ خط لکھے جا سکے۔ نہ ہی کوئی مضمون لکھنے یا لکھوانے کی نوبت ہی پہنچی۔ اُن سے ہم نے اپنے رسالے کے لئے پیغام کی استدعا کر رکھی تھی۔ انھوں نے ایک دن خود ہی کہا کہ ناصر کاظمی سے کہو (میرے وہ دوست جو میرے ساتھ اس رسالے کے مدیر ہیں) کہ وہ پیغام لکھ لیں۔ میں بولتا جاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ۔ بعید نقاہت کے باوجود مگر نہایت بے تکلفی سے۔ ایک قلم کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان گھماتے ہوئے۔ اور آنکھیں کبھی قلم پر جما کر جس حالت میں ان کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ اور گاہے گاہے آنکھیں اُٹھاتے ہوئے (وہ آنکھیں جن کی چمک ضعیف یا بیمار آدمی کی ہرگز نہیں تھی۔ انھوں نے وہ پیغام جو کہ مکمل صورت میں رسالے کے آغاز میں شائع ہو رہا ہے۔ لکھوانا شروع کیا۔ کس قدر زندہ تھا دل ان کا اس ضعیفی میں بھی۔ کس قدر اپنے ہم جنسوں کے لئے خلوص۔ اور ملک اور ادب اور انسانی ارتقا کے لئے عشق اپنی زندگی کی شرط سے بھی بے نیاز۔ کہ وہ اُس بیماری میں بھی جس کو اُن کی آخری بیماری ہونا تھا۔ اُس بستر پہ جو کہ مشیتِ ایزدی سے بسترِ مرگ بن کے رہا۔ یہ دعا کر سکتے تھے۔ گویا ان کے لئے ابھی امید اور ولولہ کی نسبت سے زندگی کی سحر ہی تھی۔

"میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ مدیران اور ان کے رفقائے کار۔ ان اوراق پر ایسی چیزیں لکھیں اور لکھوائیں جو اردو ادب میں ایک نئے اور دقیع باب کا اضافہ کریں۔ اور جن میں نوجوان اور ہونہار ادیبوں کی فن کاری کے بہترین نمونے شائع ہوں۔ کیونکہ اردو ادب کو آجکل پہلے سے بھی زیادہ ضرورتِ خدمت ہے۔ اور پڑھنے کے مواقع بھی۔ باوجود اُس دشمنی کے حاصل ہیں جو ہمیں برِ صغیر میں نمودار ہے۔ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ مخالف اثرات کا مقابلہ کرے۔ اور اردو کے درجے کو بلند رکھنے میں کامیاب ہو۔

مدیران چاہتے ہیں کہ پختہ کار ادیب بھی اپنے تعاون اور سرپرستی سے ان کو ممنون فرمائیں۔ اور اُس زبان کو تقویت پہنچائیں۔ جس کی خدمت میں انھوں نے اپنی عمروں کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ پرانے اہلِ قلم حضرات خوشی سے اس کام میں ان کی رہنمائی کریں گے۔"

اور آخر میں اس دعا کے بعد انھوں نے پیغام میں یہ آخری لفظ لکھوائے۔ جن میں اپنی قیمتی سرپرستی اور معاونت کا اس سادگی سے وعدہ فرمایا۔ "ہر چند کہ میری صحت کچھ عرصے سے اچھی نہیں ہے۔ میں حتی الوسع اپنے دوستوں کے ساتھ اس خدمت میں شریک ہوں گا۔" اس حتی الوسع میں اتنا درد تھا۔ میرا دل بھر آیا۔

مگر آج ہمارے "اوراقِ نو" اس سرپرستی۔ اس گراں قدر معاونت سے محروم ہیں۔ مگر ہمیں یہ امید ہے کہ اُن کی اس دعا کو ہماری کاوشیں مستجاب کر کے رہیں گی۔ اور جن پختہ کار ادیبوں سے ان کا یہ پیغام مخاطب ہے۔ انہیں ان کی اس امید اور اس دلی دعا کا پاس رہے گا۔ اور اگر ایسا ہو۔ تو "اوراقِ نو" اپنے اس مقصد میں جو شیخ عبدالقادر کو مقبول تھا۔ ناکام ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ خصوصاً جب "مصورِ مشرق" عبدالرحمان چغتائی کا اشتراک ہمیں حاصل ہے۔ جنھوں نے "اوراقِ نو" کے شعبۂ فن کی ادارت اپنے ذمے لے لی ہے۔

یہاں میں سمجھتا ہوں کہ ان اصحاب کا جنھوں نے نظمیں یا مضامین بھیجے ہیں یا جنھوں نے تاروں اور خطوط کے ذریعے اپنے دل دہ دینے

یوں سمجھئے علیحدہ طور پر شکریہ ادا کرنا ان کی محبت اور گہرے غم کی توہین کرنا ہے۔ خاندان کا کوئی ایک فرد دوسرے فرد سے رسمی اظہار ہمدردی کر کے ایک کے اور دوسرے کے غم کو ترازو میں تولے۔ موازنے سے اپنی تکلیف کی برتری کا اعلان کرے۔ یہ شایانِ محبت نہیں۔ شیخ عبدالقادر کے ہم میں سے اٹھ جانے سے ایک قوم کا۔ یعنی ایک خاندان کا نہایت ہر دلعزیز رکن ہم میں سے جاتا رہا ہے۔ اور اس لئے ہمارے بس میں یہی ایک صورت ہے۔ کہ ہم سب مل کر رو لیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے آنسو پونچھ کر۔ زندگی کو ایک جماعت ہو کر اس محبت اور امید سے دیکھیں۔ جس کی خواہش انہیں ہمیشہ رہی۔ اور جیسے آج اگر وہ ہم میں موجود ہوتے تو چاہتے۔

زمانے کی آواز بن کر جناب جعفر عباس کے الفاظ میں یہی سوال لبوں پر بار بار آتا ہے:۔

"اب وہ صورت۔ وہ آواز۔ وہ خزانۂ علم۔ وہ کوہِ وقار۔ وہ خضرِ راہ۔ وہ مربی۔ وہ مددگار۔ وہ عیسےٰ نفس کہاں ہے"۔

آہ میرا محسن

(از حفیظ جالندھری)

ماتمِ مرگِ عزیزاں ہے مرا آغازِ حیات   تا بہ انجام اسی دھن پہ بڑھا سازِ حیات
سفرِ زیست کی مدت انہی راہوں میں کٹی   عمر آہوں میں کٹی۔ واہ رے اندازِ حیات

میں یہ سمجھا تھا۔ کہ اب زد سے نکل آیا ہوں   مرگِ احباب کی سرحد سے نکل آیا ہوں
تھی یہ تدبیر نیا تیر نہ کھاؤں گا کوئی   ہر مقامِ خبرِ بد سے نکل آیا ہوں

میں یہ سمجھا تھا کہ پیمانہ ہے لبریز مرا   دوسروں سے ہے قدم سوئے عدم تیز مرا
آج معلوم ہوا سست ہے رفتار مری   بار ہے مجھ پہ وجودِ الم انگیز مرا

آج معلوم ہوا۔ راہ ابھی باقی ہے   منزلِ غم پرے اللہ ابھی باقی ہے
باش اور مرحلۂ جاں سے گذرنے والے   اک نیا صدمۂ جانکاہ ابھی باقی ہے۔





تیر وہ آکے لگا ہے جو کماں میں تو نہ تھا　　قدر انداز کی چشمِ نگراں میں تو نہ تھا
ہائے یہ رگ تو کہیں دل نے چھپا رکھی تھی　　ہائے یہ زخم مرے وہم و گماں میں تو نہ تھا

آہ یہ درد۔ کہ فریاد کی بھی تاب نہیں　　آہ یہ جسمِ ضعیف آہ مری جانِ حزیں
کوہِ اندوہ کہاں۔ یہ تو فلک ٹوٹ پڑا　　قصرِ اخلاص و وفا ہو گیا پیوندِ زمیں

کس اشارے سے یہ فرمان ہوا ہے صادر　　چھین لیا کس نے وہی ایک وجودِ نادر
نقشِ کامل سے کیا دیدۂ دل کو محروم　　دستِ قدرت ترا شہکار تھا عبدالقادر

ہاں وہ رکھتا تھا مرے حال پہ شفقت کی نگاہ　　ہاں وہی میرا مربّی تھا۔ وہی درد آگاہ
وہی آغوش مرا گوشۂ تسکیں تھا حفیظ　　وہی دامن تھا وہی در تھا مری جائے پناہ

تھی اگر میرے مقدر کو مجھی سے پرخاش　　ساری دنیا کو مرے ساتھ ملی کیوں پاداش
دامنِ شیخ سے وابستہ میں تنہا تو نہ تھا　　موت پتھرائی ہوئی آنکھ نہ ہوتی اے کاش!

ہمہ جان و ہمہ تن خیر تھا عبدالقادر　　خیر خواہِ حرم و دیر تھا عبدالقادر
کون ہے جس کو بنایا نہ یگانہ اس نے　　ہے کوئی جس کے لئے غیر تھا عبدالقادر

اے قضا کون سی محفل میں وہ مطلوب نہ تھا　　اس کا اندازِ مروت کسے مرغوب نہ تھا
لاگ مجھ سے تھی تجھے سارے جہاں سے تو نہ تھی　　ایک میرا ہی اکیلے کا وہ محبوب نہ تھا

خاص کچھ مجھ سے نہ تھا شیخ کا فیضانِ عمیم　　ذرے ذرے پہ گہر بار تھا وہ ابرِ کریم
اے قضا تجھ کو گلستانِ ادب کی سوگند　　ایک میں ہی نہیں دنیا ہے مرے ساتھ یتیم

اُس کا دیدار تھا آنکھوں کیلئے صبحِ اُمید　　سرد مہری کے دھندلکے میں طلوعِ خورشید
وہ مدارات و عنایات کہ شایانِ ہنر　　وہ ملاقات کہ اربابِ کمالات کی عید

اُس کی رفتار سے مانوس رہی موجِ ضعیف　　اُسکی گفتار سے پائی نہ کسی نے تکلیف
معتقد لمعۂ انوار کا ہر مردِ خُدا　　معترف خوبیٔ کردار کا ہر فردِ شریف

خُلق باقی نہ رہا خلقِ خدا روتی ہے　　رسمِ اخلاص بھی چشمِ دل نشاں روتی ہے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اک بندۂ تسلیم و رضا　　پردۂ راز میں چھپ چھپ کے قضا روتی ہے

دیدہ و دل کیلئے صبر کا یارا نہ رہا　　"ہم کبھی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا"

تھا وہی ایک سہارا جو دیا تھا تو نے　　اے خدا آج وہی ایک سہارا نہ رہا

شیخ کا مرثیہ کہنے کی مجھے تاب نہیں　　درد کو فرصتِ پابندیٔ آداب نہیں
غالباً خواب میں ہوں خوابِ پریشاں ہی سہی　　دوستو رحم کرو۔ یہ نہ کہو خواب نہیں؛

مولوی عبدالحق کا بیان

(امروز کے سٹاف رپورٹر سے)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے شیخ عبدالقادر مرحوم کو خراج عقیدت دیتے ہوئے "امروز" کا حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"سر شیخ عبدالقادر کی وفات ایک قومی سانحہ ہے۔ وہ ہماری قوم میں جامع حیثیات شخص تھے۔ اُردو زبان کی جو بیش بہا خدمات انہوں نے کی ہیں۔ وہ ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ اُردو ادب کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور نقاد تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر انہیں کامل قدرت تھی۔ اور جیسے وہ بہترین انشا پرداز تھے۔ ویسے ہی وہ مقرر تھے اور ہر موقع پر بے تکلف تقریر کرتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل، خوش مذاق اور وسیع الاخلاق تھے۔ علاوہ ادب کے ان کی عام معلومات بہت وسیع تھیں۔ ان سے مل کر خاص مسرت ہوتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

اُردو زبان اور ادب سے ان کا گہرا ذوق اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آخر عمر میں جبکہ وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں اعزازی طور پر اردو پروفیسری کی خدمات انجام دیں۔ اردو سے ہمدردی صرف ادب تک ہی نہیں تھی۔ بلکہ اردو کی اشاعت اور حمایت میں بھی انہوں نے قابل قدر کوشش کی۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے صدر تھے۔ اور ان کے تجربے اور مشوروں سے انجمن کو بڑی تقویت پہنچی۔ ان تمام خدمات کی وجہ سے اہل ملک کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و محبت تھی۔ ایک ایسے فاضل ادیب، روشن خیال اور اعلیٰ سیرت کے شخص کا اٹھ جانا اس زمانے میں ہمارے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے۔ ان کے انتقال سے ہماری قوم ایک ایسی برگزیدہ ہستی سے محروم ہو گئی ہے۔ جس کا نعم البدل بھی میسر نہیں ہو سکتا۔"

ہزایکسیلینسی

سردار عبدالرب نشتر

نے

ایک بیان میں فرمایا: "میں نے نہایت افسوس سے شیخ عبدالقادر صاحب۔ لاہور کے بیرایٹ وقار کی وفات کی خبر بد سُنی۔ وہ ایک عظیم فطانت کے مالک تھے۔ اور صرف اپنی محنت سے زندگی کے ہر شعبے میں بڑے مراتب تک پہنچے دوستوں اور قرابت داروں کے علاوہ ان کی کمی اُردو کے پرستاروں میں بہت محسوس کی جائے گی۔ جن کی انہوں نے بہت خدمت کی ہے۔ میں تمام خاندان کو اپنی ہمدردی پیش کرتا ہوں"۔

ہزایکسیلینسی
سردار عبدالرب نشتر
گورنر پنجاب

عبدالمجید سالک

شیخ عبدالقادر مرحوم

(اقتباس)

آخر وہ منحوس ساعت آ پہنچی۔ جس کا کھٹکا کئی دن سے لگا ہوا تھا۔ بزرگ محترم شیخ عبدالقادر اس جہانِ فانی سے رنگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شیخ صاحب مرحوم کی پاکیزہ زندگی کے مفید پہلو اس قدر بے شمار ہیں۔ کہ ان پر بلامبالغہ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ایک چھوٹی سی تقریر سوانح عمری کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن حادثہ چونکہ تازہ ہے۔ اس لئے ضرورت ہے۔ کہ اس بزرگ کے کچھ حالات ترشادہ قوم کے سامنے بیان کر دیئے جائیں۔ جو ممکن ہے بعض سعید روحوں کے لئے شاہراہِ زندگی میں چراغِ راہ ثابت ہوں۔ شیخ عبدالقادر کا اصلی وطن قصور تھا۔ اس قصبے کے شرفا میں شیخ فتح الدین بہت محترم سمجھے جاتے تھے یہی شیخ صاحب مرحوم کے والد تھے۔ ولادت ۱۸۷۴ء میں ہوئی گویا اس حساب سے شیخ صاحب نے پچھتر سال کی عمر پائی۔ ابتدائی تعلیم قصور ہی میں ہوئی۔ اور حسنِ اتفاق یہ ہے۔ کہ جس مدرسے میں شیخ صاحب پڑھتے تھے۔ اس میں فارسی پڑھانے کا کام اس زمانے میں مولانا گرامی مرحوم کے سپرد تھا اور شیخ صاحب ہمیشہ فخر سے کہا کرتے تھے کہ فارسی میں سب سے پہلے انہوں نے مولانا گرامی مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے فارغ ہو کر آپ ایف سی کالج لاہور میں داخل ہوئے اور وہاں سے بی اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گذارا۔ اور ۱۹۰۱ء کے ماہ اپریل میں مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ تین سال کے بعد ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں بھی "مخزن" کے لئے پے درپے مضامین لکھتے رہے اور ۱۹۰۶ء میں تعطیلات کا زمانہ استنبول میں بسر کیا۔ جہاں سے واپس آ کر اپنا مشہور سفرنامہ "مقامِ خلافت" لکھا۔ ۱۹۰۷ء میں انگلستان سے کامیاب و کامران واپس آئے اور "مخزن" کی ترتیب و تہذیب کے علاوہ مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرت کے سلسلے میں صوبے بھر کا دورہ کر کے انجمنیں قائم کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ "مخزن" کو مولوی غلام رسول مرحوم کے سپرد کر کے لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہو گئے۔ اور اپنے فرائضِ منصبی کو اس قدر محنت۔ دیانت اور سلامت روی سے بجا لائے۔ کہ ۱۹۲۱ء میں چند ماہ کے لئے لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ مجلس وضعِ قوانین پنجاب کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کے نمائندے بن کر تشریف لے گئے اس سے قبل چند ماہ کے لئے پنجاب کی وزارتِ تعلیم پر بھی فائز رہے۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے اور مختلف اہم اور مفید کمیٹیوں کی رکنیت پر سرفراز ہوتے رہے۔ اسی تمام دوران میں آپ علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی کے ٹرسٹی اور انجمن حمایتِ اسلام کے نائب

سے بھی رہے - اور قومی خدمت کے مختلف شعبوں میں نہایت سنجیدگی سے مصروف کار رہے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۴ء میں سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں آپ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر اور بعد میں ایڈوائزر بنے اور ۱۹۴۲ء میں ایک ماہ کے لئے لاہور میں پریکٹس کرتے رہے اور پھر بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر کئے گئے جہاں سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے - اس سبکدوشی کے بعد اگرچہ حکومت نے بارہا چاہا کہ شیخ صاحب کسی شعبے میں دوبارہ آمادہ بکار ہو جائیں۔ لیکن آپ بالکل خانہ نشین ہو گئے۔ گو آپ کی ادبی و علمی و تعلیمی سرگرمیوں اور سرپرستیوں میں کبھی فرق نہ آیا۔ ممکن ہے میرے اس بیان میں شیخ صاحب کی بہت سی سرگرمیوں کا ذکر نہ آیا ہو۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ محض ایک تقریر ان کی زندگی کے کوائف کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

شیخ عبدالقادر کی زندگی میں جو چیز دوسری تمام فعالیتوں سے زیادہ ممتاز نظر آتی ہے وہ ان کی اردو ادب سے محبت تھی وہ ابتدا سے انتہا تک زندگی کے کسی مرحلے میں اردو کی خدمت سے غافل نہیں ہوئے - اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آج زبان اردو اور ادب اردو کی جو رفتار دنیا بھر سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے - اس میں بہت بڑا حصہ شیخ صاحب کا ہے - جنہوں نے اس زمانے میں جب مغربی تعلیم یافتہ طبقوں میں اردو کی کس مپرسی نہایت دردناک تھی - اپنی پرکشش شخصیت - اپنی بے مثال زباندانی اور اپنے مشہور رسالہ "مخزن" کے ذریعے سے صدہا انگریزی دانوں کو اردو کا بے نظیر ادیب اور شاعر بنا دیا - اور ان کے احباب میں جو نمایاں شخصیتیں تھیں - ان کو چمکانے اور بڑھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کون نہیں جانتا کہ اقبال - نیرنگ - ناظر - اعجاز - تلوک چند محروم - نادر کاکوروی - طالب بنارسی اور دوسرے بے شمار شعرا اور ادبا مثلاً سید سجاد حیدر - مولانا راشد الخیری وغیرہ کے کمالات سب سے پہلے "مخزن" ہی کے ذریعے سے منصۂ شہود پر آئے - دو سال دو سال ہی کے اندر "مخزن" ہندوستان بھر کے تعلیم یافتہ حضرات کا محبوب ترین ادبی رسالہ بن گیا - شیخ صاحب اردو کے علاوہ انگریزی صحافت کے بھی ماہر تھے - چنانچہ کئی سال تک آبزرور کے ایڈیٹر رہے اور ان کے انگریزی انداز تحریر اور معاملہ فہمی نے اکثر انگریز انشا پردازوں سے بھی خراج عقیدت وصول کیا - وہ انتہائی مصروفیت اور بعض اوقات علالت کے باوجود علمی و ادبی جلسوں کی صدارت پر آمادہ ہو جاتے تھے - اور خدمت ادب کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے - اردو میں ان کے انداز تحریر کی مثال کیاب ہے - اس لئے کہ وہ بے تکلف مخلصانہ اور سلامت آمیز نثر لکھتے۔ کہیں تکلف یا تصنع کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا اور جس کیفیت یا منظر کو بیان کرنا چاہتے اس کا من و عن نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے۔ انہیں لکھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی - تحریر [illegible] مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ کہ جس طرح [illegible] انہوں نے تصنیفات نہیں چھوڑیں - بلکہ [illegible] ان کے جو مضامین چھپے ان کا مطالعہ آج بھی اچھے اچھے [illegible] آپ نے "مقام خلافت" کے نام سے شائع کئے۔ [illegible]

شیخ عبدالقادر نے [illegible]

اپنے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہ ملے گا جس سے یہ معلوم ہو۔ کہ انہوں نے کبھی ملکی یا قومی مقاصد کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہو۔ یہی سلامت روی۔ سنجیدگی۔ اور خودداری اُن کی ہردلعزیزی اور مقبولیت عامہ کی ضامن ہے۔ انتزاع سلطنت مغلیہ کے بعد سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک جس قسم کے مسلمان پیدا کرنا چاہتی تھی ان کا بہترین نمونہ شیخ عبدالقادر تھے۔ اس لئے کہ اعلیٰ درجے کی انگریزی دانی کے باوجود انہیں مشرقی اخلاق۔ مشرقی ادب۔ اپنی زبان۔ اپنی روایات دینی و ثقافتی سے نہایت گہری وابستگی تھی۔ ان کے افعال و اقوال میں کوئی آوارگی کوئی ابتذال۔ کوئی پستی اور بے اصولی زندگی کے کسی حصے میں بھی نہیں پائی جاتی۔ وہ حقیقت میں بڑے ہی پاک باز و پاک نفس بزرگ تھے۔ شر ان کی طبیعت سے بالکل دور تھا خیر کے کاموں میں اور فیض رسانی میں ہمیشہ ان کا قدم معاصرین سے آگے پڑتا تھا۔

ہزاروں انسان موجود ہیں۔ جنہیں شیخ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ سب گواہ ہیں۔ کہ ان کی ملاقات ہمیشہ روحانی خوشی کا باعث ہوتی تھی وہ اپنی اور دوسروں کی پرانی سرگزشتیں اور بعض واقعاتی لطیفے اتنے مزے سے سناتے تھے کہ ان کی صحبت شگفتگی کا ایک چمن زار بن جاتی تھی۔ غرض شیخ عبدالقادر کا انتقال پاکستان کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ کیونکہ ایسے جامع کمالات بزرگ اب پیدا نہیں ہوتے جن میں مشرق و مغرب کی خوبیوں کا اجتماع اور نقائص کا فقدان اس قدر نمایاں ہو۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کو جنت الفردوس میں اپنے حبیب پاک کے سایۂ رحمت میں پناہ دے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور قوم کے اس نقصان عظیم کی تلافی فرمائے۔ آمین۔

(ریڈیو پاکستان سے براڈکاسٹ ہوا)

امتیاز علی تاج

شیخ عبدالقادر (مرحوم)

(اقتباس)

عظمت رفتہ کے کارواں میں آج ایک اور تاباں و درخشاں مشعل کا اضافہ ہوگیا۔

سر عبدالقادر کی عظمت ان اعلےٰ منصبوں کی مرہونِ منت نہ تھی۔ جو انہیں اپنی سرگرمیوں کے ہر میدان میں عموماً حاصل ہوتے رہے انھوں نے کئی اعتبار سے برِعظیم ہند کے مشاہیر کا مرتبہ حاصل کیا۔ وہ کامیاب قانون دان نامور اخبار نویس مستند ادیب اور ہر دلعزیز مقرر بنے۔ وہ پنجاب پر اسیکیوٹر اور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مجلس قانون ساز کے ممبر۔ وزیر اور صدر رہے انھوں نے ملک کی تمام ادبی و معاشی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت حاصل کی۔ وطن میں اور وطن کے باہر اعلیٰ اعزاز پائے۔ لیکن ان کی عظمت ان تمام مراتب و مناصب سے ایک جدا چیز تھی۔ ایک ایسی چیز جس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کا کوئی اعزاز اسے کسی صورت میں کبھی متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور جس کا احساس ہر ایسے شخص کو برابر ہوتا رہا۔ جس نے ان کی صحبت میں چند ساعتیں بھی بسر کرنے کی سعادت حاصل کی۔

اس جاہ پرست اور ثروت پسند زمانہ میں ایک اکیلا وضع دار بزرگ جس کا دروازہ ہر دوست اور ہر اجنبی کے لئے برابر کھلا رہتا تھا، جس کے ہاں ایک گریباں چاک ادیب اور ایک ڈریس سوٹ میں ملبوس خوشحال کا استقبال ایک ہی تپاک و گرمجوشی سے کیا جاتا تھا۔ جس کا اخلاق اعلےٰ و ادنےٰ۔ عالم و جاہل، ضعیف و نوجوان منتہی و نوآموز کسی سے کوئی فرق روا رکھنا نہ جانتا تھا۔ جس کے ساتھ بیٹھکر ہر ایک اسے اپنا اور صرف اپنا ہی دوست، ہمدرد اور مربی سمجھنے کی لذت حاصل کر لیتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر ایک سے اُسی کی سطح پہ آ کر گفتگو کرتے۔ اُس کی بات انہماک و توجہ سے سننے اور اپنی بات گھل مل کر شگفتگی سے سنانے پر حیرت انگیز طور سے قادر تھا۔ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہو۔ کہ بات سننے اور بات کرنے کے فن میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا۔ تجربات زندگی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے ذہن میں ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ وہ اس میں سے ہمیشہ کوئی بہت برجستہ و برمحل بات چن لیتا اور اسے ایسی سادگی، مدلل اور شیرینی سے بیان کرتا کہ سننے والا اس کی دلآویزی میں کھویا سا جاتا۔ اور اگر محویت میں گفتگو جاری رکھنے کے متعلق اپنی تمام ذمہ داریاں بھلا ڈالتا تو اُسی بزرگ کے ذخیروں میں سے ایسے رنگا رنگ واقعات کے مسلسل بول نکلتے رہتے کہ وقت کے متعلق ہر قسم کا احساس ذہن سے خارج ہو جاتا۔ اسی کا خلوص ہر ضرورت مند کے لئے ہمدردانہ مشورے کے بہت موزوں الفاظ رکھتا تھا۔ وہ قابل دلوں میں اپنی شفقت و حوصلہ افزائی سے اعتماد کی روح یوں پھونکتا۔ کہ زندگیاں بنا دیتا تھا۔ ادب کی دنیا میں بے شمار ایسے لوگ

ہیں جن کی اہمیت کے امکانات کو اسی کی جوہر شناس نگاہوں نے دریافت کیا اور انہیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ وہ جسے زمانہ کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھا جیسی جامع اور فیض رساں شخصیتیں قدیم زمانہ کی یادوں سے وابستہ ہیں جو ایک بار اس سے ملتا ہے اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اسے عظمت کو اتنے قریب اور ایسی بے تکلفی سے دیکھنے کا موقع پہلے کبھی نہیں ملا۔

شیخ عبدالقادر کی صحبت میں وقت گذارنے اور ان کی زندہ و دلانہ گفتگو اور وضع دارانہ طرزِ عمل سے ان کا کردار سمجھنے کے بعد عموماً کئی باتوں میں ان کی تقلید کی خواہش بے اختیار پیدا ہوتی تھی۔ ان کے کردار میں انفرادی عزم تھذیب اخلاق اور عقل کے زیر اثر سرگرمی سے مصروفِ عمل نظر آتا تھا۔ کئی اہم مواقع پر انہوں نے اپنا طرزِ عمل جب ایک بار خوب سوچ سمجھ کر تجویز کر لیا تو پھر استقلال سے اس پر قائم رہے۔ ان کی مرنجاں مرنج نے دوسروں کی شخصیتوں کا لحاظ رکھا۔ لیکن اپنی آزادیٔ رائے اور انفرادیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا انہوں نے دنیا کی تعریف و ثنا سے زیادہ اپنے ضمیر کے فیصلے کا احترام کیا۔ اور ارزاں ناموری کی ترغیب کو کبھی احساسِ فرض پر غالب نہ آنے دیا۔

ایسے لوگ جو اپنی روشن مثال سے دوسروں کی زندگیاں سنواریں۔ جس خاک سے بھی اٹھیں۔ وہاں کے جیتے جاگتے خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کو رفعت و علو بخشتے ہیں۔ اور اپنی زندگی اور اپنے کردار کی روشن مثال سے ساری قوم پر ہمیشہ انوار کی بارشیں برساتے رہتے ہیں۔

مولانا صلاح الدّین ایڈیٹر "ادبی دنیا"

نے ایک بیان میں کہا۔ کہ شیخ صاحب کی وفات نے ملک سے ایک بلند پایہ انسان چھین لیا جس نے نصف صدی سے ہر کوچہ سے خراج عقیدت وصول کیا۔ سر عبدالقادر نے تدبی زندگی کی جو اہم ترین خدمت کی وہ اردو کو ترقی دینا تھا۔ انہوں نے بیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی یہ جان لیا۔ کہ اردو میں ایک ماڈرن زبان بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ صرف توجہ اور مدد کی محتاج ہیں۔ اور یہ خیال ان کے لئے تمام عمر ایک رُکن دین بنا رہا۔ انہوں نے راہبانہ وار ایک ایسا کام شروع کیا جس میں دنیاوی نفع تطعی نہ تھا۔ "مخزن" ہماری ادبی صبح کا سروش ۱۹۰۱ء میں نمودار ہوا۔ اور لوگوں کے تخیلات پر قبضہ جما بیٹھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اردو کی ہر دلعزیزی کو پختہ کرنے کے لئے سر عبدالقادر نے اظہار کا پرانا طریق منسوخ کر دیا اور تحریر کو سادہ بنا کر تقریر کے نزدیک لانے کی کوشش میں ایک ایسا اسلوب بیان اختیار کیا۔ جو اپنی سادگی فصاحت اور پُر زور انداز کے لئے مشہور ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا۔ کہ اردو معانی کے باریک ترین نکات اور احساسات کے لطیف ترین منازل کو سادگی اور وضاحت سے بیان کرنے کی اہل ہے۔ ہمارے دل اس کاوش کے لئے جذبۂ تشکر سے لبریز ہیں۔ جو انہوں نے اردو کو دنیا کے نقشۂ زبان پر لانے کے لئے کی۔ یہ سوچنا مشکل ہے۔ کہ جو جگہ انہوں نے خالی کی۔ وہ کبھی پُر ہو سکے گی۔ لیکن یہ پیش گوئی کرنا آسان ہے۔ کہ شیخ صاحب کا نام نامی ہمارے ادب کی راہوں میں ہمیشہ گونجتا رہے گا۔

مولانا صلاح الدّین احمد

(ترجمہ)

چراغ محفلِ ادب

حفیظ محفلِ اَبَد کی جستجو رہی اُسے
جب آنکھ بند کی ملا سُراغِ محفلِ اَبَد
جو شمع بجھ گئی یہاں وہ خلد میں ہے ضوفشاں
"چراغِ محفلِ ادب" — "چراغِ محفلِ اَبَد"

★

حفیظ ہوشیارپوری

ترجمہ انیس جاہ

اقبال فلسفی، شاعر اور مآل اندیش کی حیثیت سے

از شیخ عبد القادر مرحوم و مغفور

آج سے چند ماہ پیشتر پاکستان کے وزیر تعلیم آنریبل فضل الرحمان نے شیخ عبد القادر سے اقبال کی شاعری کے چھ اہم پہلوؤں پر ایک سلسلہ لیکچروں کا سلسلہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی۔ ابھی شیخ صاحب نے چند ہی لیکچروں کی تکمیل کی تھی۔ کہ ان کی صحت پہلے سے بھی خراب ہو گئی۔ ذیل کا مضمون ان کے ایک انگریزی لیکچر سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ جو ان کی آخری تحریروں میں سے ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ شیخ صاحب کے انتقال سے جہاں اور ناقابل تلافی نقصانات ہوئے ہیں ان میں سے یہ ایک نقصان کسی طرح کم نہیں۔ شیخ صاحب مرحوم علامہ اقبال کے سب سے پرانے احباب میں سے تھے۔ اور انہوں نے بقول خود "ستارۂ اقبال کا طلوع دیکھا تھا۔" اگر وہ ان تمام لیکچروں کی تکمیل کر سکتے۔ تو ہمارے ادب میں ہمارے قومی شاعر کی شاعری اور فکر کے بارے میں ایک گہرا اور وسیع اندازِ نظر شامل ہو جاتا۔ جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا۔ ذیل کے مضمون میں علامہ اقبال کے بعض اشعار جو بطور حوالہ شیخ صاحب نے درج کئے تھے نہیں شامل کئے جا سکے کیونکہ مضمون کی جو نقل ہمارے پاس تھی اس میں وہ اشعار نہیں تھے۔ (ادارہ)

فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ہمیں ان کی موت کی اطلاع اسی دن موصول ہوئی جس وقت بنیادی کمیٹی کو اقبال میموریل لیکچرار کی حیثیت سے ان کی فضیلت تعلیم کی توثیق کرنا تھا۔ (فضل الرحمان)

اقبال اور ٹیگور بر صغیر ہند کے (جو اب پاکستان اور ہندوستان کی دو مستقل سلطنتوں پر منقسم ہے) دو بڑے شعراء ہیں۔ جن کی شہرت دنیا میں گونج اٹھی ہے دونوں نے اپنا وطن ہائے حیات پیدا کیا۔ اور مادرِ وطن کو اغیار کی نظروں میں ممتاز کیا۔ دونوں کے دلوں میں محبت کے سرچشمے پھوٹ پھوٹ کر بہتے تھے جن کا وجود حسنِ فطرت کی محبت آرٹ کی محبت۔ مادرِ وطن کی محبت اور سب سے بڑھ کر انسانیت کی محبت میں ظاہر ہوا۔ دونوں نے انسانیت کی خدمت ادب کے ذریعے کی۔ اور اپنے ناظرین کے دلوں پر ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات چھوڑ گئے۔ لیکن دونوں کا اظہار بیان بالکل مختلف تھا۔ ٹیگور زمانۂ قدیم کے رشیوں کی طرح عالمِ تفکر میں محو تھے۔ اور اقبال اسلام کے فلسفے کے ترجمان کی حیثیت سے عمل کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ اس وقت ہمارا مقصد ان دونوں کا موازنہ نہیں۔ بلکہ اقبال کو ایک شاعر فلسفی اور مآل اندیش کی حیثیت میں دیکھنا ہے۔

اقبال کی غزل نگاری کا آغاز ان کی جائے پیدائش سیالکوٹ میں ہوا۔ جہاں وہ طالب علم بھی رہے۔ وہ اپنی غزلیں حضرت داغ کے پاس بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے۔ جو اس وقت نظام دکن کے دربار میں ملک الشعراء تھے۔ داغ نے چند غزلیں دیکھتے ہی اقبال کے عظیم مستقبل کی پیش گوئی کی اور ان دو عظیم المرتبت شعراء میں یہ مختصر سی واقفیت دونوں کے لئے ہمیشہ باعث افتخار رہی۔ ایک مرتبہ جب حیدر آباد میں مجھے داغ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تو انہوں نے بہ مسرت کہا۔ کہ انہیں اس بات پر ہمیشہ ناز رہا۔ کہ اقبال کو ہم اپنے شاگردوں میں شمار کر سکتے ہیں

دوسری طرف جس قدر عقیدت اقبال کو داغ سے تھی اس کا اظہار انہوں نے داغ کی وفات پر اس پُر درد طریقے سے کیا۔

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پہ تیر کون

اقبال کی ابتدائی شاعری اس روایتی انداز میں شروع ہوئی۔ اور حسن و عشق کی کیفیات کے تذکرے انہی تسلیم شدہ اصطلاحوں اور استعاروں کے ذریعے ہوتے۔ جوں جوں ہمارے شاعر کی فطانت کامل تر ہوتی گئی۔ روایتی اصطلاحوں کے مائیۂ معانی میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ لاہور آنے پر اقبال کے اردو شاعری کے متعلق خیالات بدلنے لگے۔ اور ان کا آرٹ ایک متعین مقصد اور پیغام سے لبریز ہوتا گیا۔ حسنِ فطرت کی عظمت ان کی نظم ہمالیہ کی صورت میں رونما ہوئی۔ حسنِ فطرت کے مشاہدہ سے قلب و نظر کے حسن تک پہنچنا ایک ہی جست کا کام تھا اپنی نظم "وطن" میں شاعر کہتا ہے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور پھر یہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بھی تقریباً اسی وقت لکھی گئی اور وطن پرستی کے جذبات کی بنا پر اسے جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اس کی وہ یقیناً مستحق ہے۔ غالباً یہ نظم ایک جرمن قومی گیت سے متاثر ہونے کے بعد لکھی گئی۔ اور اس میں کچھ حد تک میری اس ستدعا کو بھی دخل تھا جو میں نے ان سے کی کہ اپنے ناظرین کو ایک ایسی چیز بھی دیجئے جسے قومی گیت بنایا جا سکے۔ دوسری نظم مسلمانانِ ہند کے التماس اور پیہم تقاضوں کی بنا پر لکھی گئی جن کی خواہش یہ تھی کہ قومی گیت اسلام کے ہمہ گیر نصب العین کا ترجمان ہو۔ چنانچہ علامہ نے یہ گیت

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

لکھا۔ اس سے یہ مراد نہ تھی کہ شاعر اپنے پہلے گیت کے عقیدے سے ہٹ چکا ہے۔ بلکہ اپنے وطن پر جائز فخر کرتے ہوئے اس حقیقت کا بھی معترف ہے کہ مسلمان، مشرق میں چین اور مغرب میں عرب سے اسلام کی ہمہ گیر برادری کے باعث ایک گہرا تعلق محسوس کرتے ہیں۔ یہ دوسرا گیت ہندوستان کی حدود سے بھی آگے جا چکا ہے۔ میں نے اس کا ایک مصری ترجمہ دیکھا۔ اور سننے میں آیا ہے کہ مصری بچے اسے سکولوں میں بھی گاتے ہیں۔

اقبال کی تصنیفات کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۹۵ - ۱۹۰۵ تک تھا۔ جبکہ انہوں نے فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کیمبرج گئے اور وہاں تصوف پر مقالہ لکھا۔ اور کیمبرج سے ڈگری حاصل کی اس مقالے کا جرمن ترجمہ میونخ یونیورسٹی میں بھیجا گیا۔ اور انہیں وہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ جرمنی سے ڈگری لینے کے لئے انہیں جرمن زبان سیکھنا پڑی اور وہاں چھ ماہ کے قیام نے وسیع النظری اور افزائش علم میں مدد دی پہلے دس سال کے کلام کو بانگِ درا میں مرتب کیا گیا۔ اقبال نے اپنے پیغام کو بانگِ درا سے اس لئے تشبیہ دی کہ انہیں خود امید تھی کہ قوم کو ترقی کے راستے پر اپنے احساس کے ہمراہ کامزن کرنا مقصود تھا ان نظموں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ ابتدائی زمانے کے استعمال میں کہیں کہیں غالب کا سا انداز ہے۔ ان میں

"تصویر درد" اپنے سوز اور "شکوہ" خدا کی اپنی مخلوق سے بے نیازی پر بے باک نکتہ چینی۔ "خضر راہ" اپنے اشتراکی رجحان، خستہ حال مزدور کی حمایت اور سرمایہ پرستی کی مذمت کے سبب مشہور ہیں۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" شاعر کے اس عقیدے کی ترجمانی کرتی ہے کہ موت حیات کی ایک منزل سے دوسری منزل کو جانا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک مختصر مضمون میں ان تمام نظموں کے اوصاف اور چیدہ چیدہ حصے پیش کئے جائیں۔ ایک سرسری مطالعہ میں بھی اقبال کے پہلے دور کی شاعری کی وسعت اور حسن کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں تو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان نظموں میں آئندہ پختگی اور ... تنوع کی جھلک نظر آتی ہے۔

اقبال کا یورپ میں پہلا قیام تین برس رہا۔ جبکہ انہوں نے بیرسٹری پاس کی اور کیمبرج کے اس وقت کے سالکان علم و ادب سے فیض حاصل کیا۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ان کے قیام کے پہلے دو سال وہیں تھے۔ جب میں وہاں مقیم تھا۔ ہمیں ہندوستان میں بھی ایک دوسرے کی رفاقت میسر آ چکی تھی۔ جبکہ میں ایک اخبار نویس تھا۔ اور وہ ایک لکچرر۔ اس زمانے میں میں "مخزن" نکال رہا تھا جس کے لیے میں نثر لکھتا اور وہ نظمیں کہتے۔ انہیں یورپ جانے کا خیال بھی میرے وہاں جانے سے ہوا۔ جب میں نے انہیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ تو کہنے لگے کہ آپ چلیے میں اپنے بڑے بھائی صاحب کو خط لکھ کر غیر ممالک میں تعلیم کے اخراجات کا بندوبست کروانے کے لیے کہوں گا۔ اس میں کچھ وقت لگ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے ایک سال بعد ولایت گئے۔ وہاں پروفیسر آرنلڈ بھی مقیم تھے۔ جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ لاہور میں بھی ان کے فلاسفر، رہنما، اور دوست تھے۔ اور یہاں سے انگلستان اور جرمنی میں بھی اسی طرح محبت اور ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ پروفیسر آرنلڈ کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہا کہ اقبال ان کے شاگرد رہے۔

اقبال کا وہ تین سالہ قیام ان کی زندگی اور ادب میں ایک موڑ ثابت ہوا۔ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی اور کیمبرج میں مشرقی نیتوں کے اس مطالعہ نے ان کے دماغ پر یہ ثبت کر دیا کہ ان میں ہمیشہ رہنے والا جوہر ہے جسے صیقل کرنا مفید ہوگا۔ لیکن اس وقت انہوں نے یہ بھی بھانپ لیا کہ مشرقی افکار کو زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے لئے ان کی تشکیل از سر نو کرنا پڑے گی۔ اسی دوران میں مغربی معاشرت کے نقائص دیکھنے کا بھی موقع ہوا۔ اور اس تہذیب کی زر پسندی اور کم ظرفی نے ان کی طبیعت کو متنفر کر دیا۔ ان خیالات کا اظہار قیام یورپ اور وہاں سے واپسی کے دوران میں لکھی ہوئی نظموں میں ہوا۔ یہاں سے ان کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں ان کی شہرہ آفاق مثنوی "اسرار خودی" لکھی گئی۔ یہاں یہ بیان کرنا جملہ معترضہ نہ ہوگا کہ اقبال نے اردو لکھتے لکھتے فارسی کی جانب کس طرح رجوع کیا۔ بظاہر ان کے فارسی کلام کا آغاز حسن اتفاق پر مبنی ہے۔

لندن میں ایک مرتبہ چند دوستوں کے ہاں اقبال ڈنر پر مدعو تھے۔ یہاں ان سے یہ استفسار ہوا کہ کبھی انہوں نے فارسی میں بھی کہا ہے۔ اور یہ سمجھا گیا کہ فارسی زبان کے اس عبور اور کمال کے ہوتے ہوئے وہ فارسی میں نہایت عمدگی سے کہہ سکیں گے۔ اس سرسری گفتگو کا نتیجہ دو فارسی غزلوں میں نمودار ہوا۔ جو دوسرے روز اقبال نے مجھے دکھائیں۔ اس وقت ہم دونوں میں سے کوئی نہ قیاس کر سکا۔ کہ یہ دو چھوٹی سی غزلیں، "اسرار خودی" سی تصنیف کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔ فارسی میں خودی کے معنی

ذات کے ہوتے ہیں - اور اقبال انسان کی ملوی صلاحیتوں میں یقین واثق رکھتا ہے - اس کی نظر نے انسان کی ذات میں ارتقا کے ایسے ایسے امکانات مضمر پائے کہ ان کو عیاں کرنا اسے اپنا فرض محسوس ہونے لگا - اقبال خودی اور ذات کو ان کے محدود تصور سے آزاد کرتا ہے - اور نہیں چاہتا کہ لوگ کم ظرفی اور تنگ نظری میں گرفتار رہیں - اور محض اپنے ہی لئے جئیں - اس کی خواہش ہے کہ زن و مرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق روحانی اور جسمانی طور پر اپنے کردار کے ارتقا کی تکمیل کر سکیں - اور اس قوت کو سوسائٹی کیلئے استعمال کریں - تاکہ ان کی دنیا کمزوروں اور بے بسوں کی دنیا نہ رہے - وہ مرکزی نکتہ "رموزِ بے خودی" میں بیان ہوا ہے جس میں فرد کی مکمل شخصیت کو رفاہ عام کے لئے استعمال کئے جانے کی تلقین ہے - ان دو کتابوں کے چھپتے ہی اقبال کا نام مغربی دنیا میں جانا گیا - ٹیگور نے امریکہ، جاپان اور ایران کے طویل سفروں اور اپنی بنگالی نظموں کا خود نہایت خوبصورت انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد جو شہرت حاصل کی تھی - اقبال نے وہ شہرت اردو نہ جاننے والی دنیا کو اپنے کلام سے روشناس کرانے کی کسی کوشش کے بغیر حاصل کی - یہ کام اس کے مداحوں کی محبت اور ہمت کا منتظر رہا - ڈاکٹر نکلسن نے اسرار خودی کا ترجمہ کیا جس کا تعارف خود اقبال نے لکھا - یہ ترجمہ مغربی علما میں بہت پسند کیا گیا - اقبال کے کلام میں سے چند اور ٹکڑے بھی ترجمہ کئے گئے ہیں - لیکن اس کا پیغام ابھی بہتر اور کامل تر ترجمے کا منتظر ہے - جو اسے ایسی دنیا میں جہاں اردو بولی یا سمجھی نہیں جاتی انگریزی یا دوسری زبانوں کے ذریعے متعارف کروائے -

اقبال کی ایک اور فارسی تصنیف "پیام مشرق" ہے جس کی چند نظمیں انگریزی میں ترجمہ کی گئی ہیں - یہ مشہور المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے - جو مشرقی شاعری کا مداح ہے اور جس نے اپنے دیوان میں مشرقی تفکر اور اس کے طرز بیان کی تعریف کی ہے - اس کتاب کے پیش لفظ میں اقبال نے اپنا اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے کہا -

او چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مردۂ

اس تشبیہ نے ان دونوں کے ماحول میں میسر آنے والے مواقع کی تفاوت بیّن طور پر پیش کی ہے - گوئٹے کی وطنیت کو پھولنے پھیلنے کے موافق موقعے حاصل ہوئے - اقبال کا فن ہندوستان میں ایسے حالات کے نہ ہونے سے تشنہ رہا - اس کے باوجود بھی "پیام مشرق" سی کتاب کا معرض وجود میں آنا اقبال کی صلاحیتوں کو اور بھی نمایاں کرتا ہے -

علامہ کی کتاب "زبور عجم" پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے - کہ یہودیوں کی کتاب زبور سے اس کا مقابلہ بجا طور پر کیا گیا ہے - کیونکہ اس میں وہی سا حسن اور روح افزا ترنم موجود ہے - یہ اقبال کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے - جاوید نامہ ایک اور قابل ذکر کتاب ہے - جو اول الذکر کتابوں کا پیغام زیادہ فصاحت سے دیتی ہے - یہ اس وقت لکھی گئی - جبکہ قدرت نے شاعر کو ایک ہونہار بچہ عطا کیا - جس کا نام جاوید (یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا) رکھا گیا تھا - کتاب میں یوں تو عام پڑھنے والوں سے خطاب ہے - لیکن چند ایک نظموں کا مخاطب اس ننھے بچے سے ہے -

فارسی کی ایک اور تصنیف کا ذکر لازمی ہے۔ جس کا عنوان مخدومے نقل ہے: "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"
اس مختصر نظم میں مشرقی اقوام کی مغربی استحکام کے تحت کمزور حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مقصد ان اقوام کو جھنجھوڑ دینا تھا۔ اور اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ اس نظم سے اقبال کی امتیازی وسعت نظر ظاہر ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اقبال کو شاعر مشرق کہا جاتا ہے۔

جب اقبال نے اپنی توجہ فارسی شاعری کی طرف مبذول کی تو اس کے بہت سے مداحوں اور اردو کے دلدادگان کو افسوس ہوا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس طرح اس کا پیغام بہت سے دوسرے ملکوں میں پہنچ جائے گا۔ اس سے التماس کیا گیا کہ وہ اردو میں چند اور نظمیں بھی لکھے۔ جن کا خوش گوار نتیجہ یہ ہوا کہ آخری دنوں میں اقبال نے پھر اردو کی طرف توجہ دی۔ "ضرب کلیم" اور "بال جبریل" اسی دور کی تخلیق ہیں جن پر اردو بجا ناز کرتی ہے۔

ارمغان حجاز اقبال کی زندگی میں ہی مرتب ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ عنوان کا مطلب "حجاز کا تحفہ" اور "حجاز کے لئے تحفہ" دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ آخرالذکر اس طرح درست ہے کہ اقبال مزار نبوی کی زیارت کی دلی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن طویل بیماری نے عمر کے باقی دن غصب کر لئے۔ اور دل کی دل میں رہ گئی۔ یہ کتاب وہ تحفہ تھا۔ جو شاعر حجاز کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ پہلے معنی یوں ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ کہ ماضی کے مذہب کی طرف رجحانات اور حجاز کو مذہب کا ماخذ سمجھ کر اس کے متعلق احساسات اس کتاب میں خصوصیت سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ جس کا کچھ حصہ اردو میں ہے۔ اور کچھ فارسی میں۔

اقبال کی تصنیفات کا سرسری جائزہ دلینے کے بعد جس میں اس کے فلسفۂ حیات پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اب اس کے پیغام کو ذرا تفصیل سے دیکھنا چاہئے۔ اقبال قوت عمل کی تخلیق کی حمایت اور بے چارگی و بے بسی کی مذمت کرتا ہے اس سلسلے میں کہا ہے۔ *

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اقبال کے فلسفے کا یہ دور مشہور جرمن فلسفی نیٹشے کے مطالعے سے شروع ہوا۔ بلاشبہ اقبال کی قوت و عمل کی تبلیغ اور کم ہمتی کی مذمت نیٹشے کے افکار سے ظاہری مشابہت رکھتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ نیٹشے کے مطالعہ کے دوران میں اقبال کو یہ خیال آیا ہو۔ کہ مشرق کو قناعت کی خواب آور افیم اس مقدار میں دی جا چکی ہے۔ کہ اب خواب غفلت سے جگانے کے لئے انہیں ایک تیز بہدف تریاق کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سوچنے کا کافی جواز ہے کہ وہ جرمن فلسفی سے کس طرح مسحور نہیں ہو گیا۔ جہاں نیٹشے خدا سے منکر تھا وہاں اقبال کے فلسفۂ حیات کا محرک ہی مذہب تھا۔ جس قوت کی وہ تبلیغ کرتا تھا۔ اس کا مصرف انسانیت کی خدمت ہے۔ خود نمائی اور جاہ پرستی نہیں۔ ایک فارسی شعر میں نیٹشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا ہے۔ ع

قلب او مومن دماغش کافر است

---

* نوٹ: مضمون کی اس نقل میں جو ہمارے سامنے تھی۔ اشعار کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی اشعار نہیں تھے۔

اس کی نظر میں نیٹشے کا مسلک ناکام ہے۔ جرمنی کے مصائب و مشکلات اس کے شاہد ہیں۔ اقبال جس قوت اور شعور کو عام کرنا چاہتا ہے۔ اس کی وہ افادیت جو اس کی نظر میں تھی۔ ذیل کے اشعار میں نمایاں ہے۔*
ظاہر ہے کہ جس عشق کے گیت اقبال نے گائے وہی عظیم اور احسن جذبہ ہے۔ جو تمام راہبران کامل کے سینوں میں موجزن ہا اور جس پر عمل کے لئے ایوب کا صبر اور نوح کی چشم دوربین چاہیئے۔ اقبال چاہتا ہے کہ انسان نیٹشے کا فوق الانسان بننے کی بجائے کمالِ کامل کو منتہائے نظر بنائے اور پھر نبی نوع انسان کو صراط مستقیم پر گامزن کردے۔
اقبال نے اپنے فلسفے کے اظہار کے لئے صوفیا کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مگر اس کا اپنا تصوف مروجہ تصوف سے مختلف ہے۔
اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر اعتراضوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ کیونکہ اقبال نے عوام کو حافظِ شیراز کی شراب نغمہ سے خبردار رہنے کی تلقین کی تھی۔ جس کے تار سے قوت عمل ضائع ہوجاتی ہے۔ ایک دوسرے ایڈیشن میں اقبال نے اصل کو بدلے بغیر نکتہ چینی کا انداز ذرا بدل دیا۔ صوفیائے قدیم میں سے اقبال صرف جلال الدین رومی مشہور مثنوی نویس کا معترف اور دلدادہ ہے اور اپنی فارسی تحریروں میں بھی اقبال نے رومی کا سا رنگ اختیار کیا ہے۔ رومی کو اقبال کا روحانی استاد کہا جاسکتا ہے۔ گو وہ ہمارے وقت سے صدیوں پہلے گذرے ہیں۔ ایک نظم میں اقبال قیاس کے پر لگا کر پیر رومی کی رہبری میں جنت کی سیر کرتا ہوا بہت سے بزرگوں سے ملتا ہے۔ اور استفسارات کرتا ہے۔ جن کا وہ جواب بھی دیتے ہیں۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے۔ کہ اس سفر کے آغاز میں پہلی روح جس سے اقبال دوچار ہوتا ہے ایک ہندو رشی ہے جس نے گلے میں مار سیاہ لپیٹ رکھا ہے۔ اور سر پر سپید بُراق بالوں کا ہالہ ہے۔ جس کی چمک رشی کی ہزارہا سالہ زندگی کی عقیدت اور اسرارِ حیات سے آشنا ہونے کی آئینہ دار ہے۔ وہ وشوامتر یا دنیا کا دوست ہے۔ اور رومی سے اس کے نوخیز مصاحب کے متعلق پوچھتا ہے۔ جس کی آنکھوں سے حقیقی معنوں میں جینے کا شوق جھلکتا ہے۔ رومی جواب دیتا ہے کہ یہ حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ اور گو اس کی عقل پختہ نہیں تاہم اس کا عزم محکم ہے اور شاہین کی مانند ہفت آسمان کے گرد اڑنا چاہتا ہے۔ وشوامتر اس نوجوان مسافر کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور اس سے اہلِ مشرق کا احوال پوچھتا ہے۔ اقبال جواب دیتا ہے۔ ان میں بیداری کے آثار ہویدا ہیں۔ جس کے سبب وہ اس قدر لاچار اور بے بس نہیں محسوس کرتے اور نہ ہی اس قدر کاہلی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے موروثی حقوق ان پر عیاں کردیئے ہیں۔ اور اس انکشاف سے ان کے دلوں میں ایک ولولہ پیدا کردیا ہے۔ اب وہ مغربی بتوں کو پوجنے کے لئے تیار نہیں۔ اقبال پھر استدعا کرتے ہیں کہ وشوامتر کوئی پیغام دیں جس پر وہ پیغام عمل دیتے ہیں یعنی عمل اور حقیقت کا عشق۔
اس کے بعد دونوں ساتھی ایک اور بزرگ بھرتری ہری کو ملتے ہیں۔ جس کو گذر کر وہ زرتشت سے جا ملتے ہیں۔ جو اس وقت اہرمن کے ساتھ ایک اخلاقیاتی جنگ میں مصروف ہے۔ اور کامیاب ہوکر نکلتا ہے۔ اس کے بعد وہ ابلیس اور جبریل، بہترین اور بدترین فرشتوں کا ایک مکالمہ سنتے ہیں۔ دوسرا مشہور آدمی جو انہیں ملتا ہے۔ نیٹشے ہے نیٹشے پوچھتا ہے کہ اقبال کس ملک و ملت سے ہے۔ اقبال کے جواب "ہندی" پر وہ ایک حقارت بھری نظر سے دیکھ کر کہتا ہے کہ تم ایک آرام طلب قوم سے

*نوٹ:- یہاں اصل مضمون میں کچھ اشعار کا انگریزی کتابی ترجمہ موجود ہے۔ مگر وقت کی قلت کے سبب ان اشعار کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔

اور مزید کہتا ہے کہ جو قوم ایک عقاب کی مانند جفاکش نہیں وہ ختم ہو جاتی ہے۔ جس قوم کے امیر راتیں عشرت میں بسر کرتے ہیں جب ان کے غریب بھوکوں مر رہے ہوں۔ وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ قومیں حصول عزم اور ناس تک دو دو میں مصروف رہ کر اور عیش و عشرت کو ترک کر کے ہی زندہ رہ سکتی ہیں۔

اس کے بعد ان کی ملاقات لینن سے ہوتی ہے۔ جو لوگوں کو مذہب کے آسرے سے محروم کر دینے کی غلطی پہچان کر اس پہ متاسف ہے۔ اور اس کے لبوں سے یہ پیش گوئی سنائی دیتی ہے کہ

شفق نہیں مغربی افق پر   یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ   کہ دوش و امروز ہے فسانہ

یہ شعر دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا اُن چھ برسوں میں بہنے والے خون کی ندی اقبال کی نظر کے سامنے تھی۔ اور یہ اس کی نظموں میں کی ہوئی غیر مبہم پیش گوئیوں میں سے ایک ہے۔ جیسے کہ آنیوالے واقعات اسے مستقبل کی چلمن میں سے صاف صاف نظر آ رہے ہوں۔ یوں ہم اس کی زندگی کی اس منزل پر پہنچتے ہیں۔ جہاں وہ فلسفی اور شاعر سے گذر کر ایک آں اندیش بن گیا۔

"ادارہ"

مشعلِ راہ

شیخ عبدالقادر مرحوم کو ایک ادبی رہنما کی ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہے۔ ادبی رہنمائی ادب کے دائرے کے اندر ہی ہو سکتی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنا کہ انہوں نے خود کوئی بلند پایہ ادب تخلیق نہیں کیا نہایت غیر منطقی ہے۔ ادب کیلئے ترقی کی راہیں کھولنا اور اپنے قلم سے مشعلِ راہ کا کام لینا ایک ایسے ہی ادیب کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ جس کا ہر لفظ ایک اعلیٰ مقصد کی روشنی میں لکھا گیا ہو۔ ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ادبی رہنمائی کے لئے جس قدر علم، تجربہ، مشاہدہ، تفکر و تجسس درکار ہے محتاجِ بیان نہیں۔ اور جو تحریر یہ عناصر رکھتی ہو اس کی ادبی اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔

شیخ صاحب کے مضامین کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ان کا قلم ہمیشہ ارتقائی اقدار کا محافظ اور وقت کے تقاضوں کا نقیب رہا ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں بہت سی نئی معلومات اور نئے افکار کا اضافہ کیا۔ جو اس وقت اس میں معدوم تھے۔ اس اعتبار سے جو سرمایہ ادب وہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی قیمت ہمیشہ وہی رہے گی جو اعلیٰ درجے کے ادب کی ہوتی ہے۔

شیخ صاحب مرحوم نے ہمارے ادب اور قومی زندگی کو مزین کرنے کے عظیم اور وسیع مقصد کو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں قاری پر لفظی یا معنوی طلسم ڈال کر اپنی ذاتی عظمت کا قائل بنانے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ عام قاری کے لئے اس مقصد کا ادراک اس لئے مشکل ہے۔ کہ وہ اُن کا اس زاویۂ نظر سے بالعموم مطالعہ نہیں کرتا۔

چنانچہ ہم ذیل میں ان کی تحریروں سے کچھ اقتباسات درج کرتے ہیں۔ جو قارئین کو اُس منزل تک پہنچانے کا راستہ مختصر کر دیں گے۔ جہاں مرحوم کے صحیح مقام کی جھلک نظر آسکے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس قلیل عرصے میں اُن کی تمام تصنیفات اور خطبات کو نہیں دیکھ سکے۔ یہ کام ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

"ادارہ"

بناوٹ کا پھندا بڑا زبردست پھندا ہے۔ جسے دیکھو اس کا شکار ہے۔ عشاق ہیں تو زلفوں کے پیچ و خم کے پھیر میں۔ شعرا ہیں تو کلام میں تلازمہ کی تلاش میں۔ واعظ ہیں تو تازہ کرشمہ بر سرِ منبر کے انداز سوچ رہے ہیں۔ مضمون نگار ہیں تو انہیں قافیہ بندی کی دھن لگی

ہوئی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جس کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں۔ وہ بھی کسی ذاتی صفت سے متصف ہے یا نہیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ ضعطا میں نکات بھی دلپذیر ہیں۔ یا محض انداز ہی کی فکر ہے۔ اور کوئی نہیں پروا کرتا۔ کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصل مضمون ہی خراب نہ ہو جائے۔

اردو علم و ادب کو آجتک اس بناوٹ کے شوق نے نہایت نقصان پہنچایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان ابھی ایک نوعمر زبان ہے مگر مقدار کے اعتبار سے اس کے ادب کا ذخیرہ کچھ تھوڑا نہیں۔ پہلے نظم ہی کو دیکھ لیجئے کہ ازسرتاپا بناوٹ ہے۔ اکثر حصّوں کی نسبت تو خود مصنفین اظہار کرتے ہیں۔ کہ ان میں فلاں صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نہ صرف ہماری نظم کی ظاہری صورت میں بناوٹ سے کام لیا گیا ہے بلکہ خیالات بھی اکثر تصنع سے پُر ہیں۔ جن پیچیدہ جذباتِ دلی کے ظاہر کرنے کے لئے یہ ملکہ بعض طبیعتوں میں قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ اُن کو ہمارے شعرا اکثر دل میں ہی چھپائے چلے گئے ہیں۔ وہ لیلےٰ کی صورت پر طعنے دینے اور مجنوں کے ساتھ وحشت میں مقابلہ کرنے۔ فرہاد کو کم ہمت ٹھہرانے اور شیریں کی بے وفائی کی تشہیر میں اپنی ہمتیں صرف کر گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہلِ ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہوا جن کی باہمی محبت کے نقشوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ وہ اس کثیر الوقوع معاملے میں کتبِ فارسی کے دستِ نگر رہے۔

نثر میں بھی آج سے پچیس برس پہلے تک یہی رنگ ہے۔ عبارتیں مقفےٰ۔ الفاظ زیادہ خیالات کم۔ خطوط میں القاب لمبے اور مطالب مختصر۔ ضرورت سے زیادہ مبالغہ۔ ضرورت سے زیادہ لجاجت۔ رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے پلٹا۔ اور اردو نثر کی سادگی میں وہ پُرکاری دکھائی۔ کہ آج تک کسی سے اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد سر سید احمد خاں مرحوم نے اردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ جمایا۔ سب سے پہلے یہ دکھا دیا کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے موثر اور پُرزور ہو سکتا ہے۔ نظم میں سادگی سب سے پہلے اختیار کرنے کے ثواب کے مستحق مولانا الطاف حسین صاحب حالیؔ مرحوم ہیں۔ اور اب شعر میں سادگی اصلیت اور جوش دکھانے والے شعراء ہندوستان میں موجود ہوتے جاتے ہیں۔

بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے دلدادوں کی تعداد کی گھمنڈ ہے۔ اور بجا ہے۔ مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے۔ اور درست ہے۔ اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے۔ کہ زمانہ کی رفتار اس کے موافق ہے۔"

"بناوٹ اور سادگی"

تیغ و آتش فاتحانِ دنیا کے ہاتھ میں بڑی طاقتیں رہی ہیں۔ ان سے انہوں نے سرکشانِ جہاں کو نیچا دکھایا۔ زبانِ تیغ نے بڑے بڑے بدزبانوں کے منہ پر مُہرِ سکوت لگائی۔ زبانِ تیغ کا اثر دو پر چار پر دس پر ہوا تو تیغِ زبان نے دو ہزار۔ چار ہزار۔ دس ہزار کو ایک وقت میں مطیع کیا۔ جو فتوحات پیغمبروں کی مبارک زبانوں کی آب دار تلواروں نے "دنیا کے مختلف حصّوں اور مختلف زمانوں میں حاصل کی تھیں وہ آجتک قائم ہیں۔ بلکہ دن بدن بڑھتی جاتی ہیں۔ حالانکہ فاتحانِ دہر کے نام و نشان تک رفتہ رفتہ صفحۂ دہر سے محو ہوتے جاتے ہیں۔ یوں تو ہر زبان میں مادۂ فصاحت ہے۔ اور ہر زبان کو فصاحت سے بولنے والے گزرے ہیں مگر ایشیائی

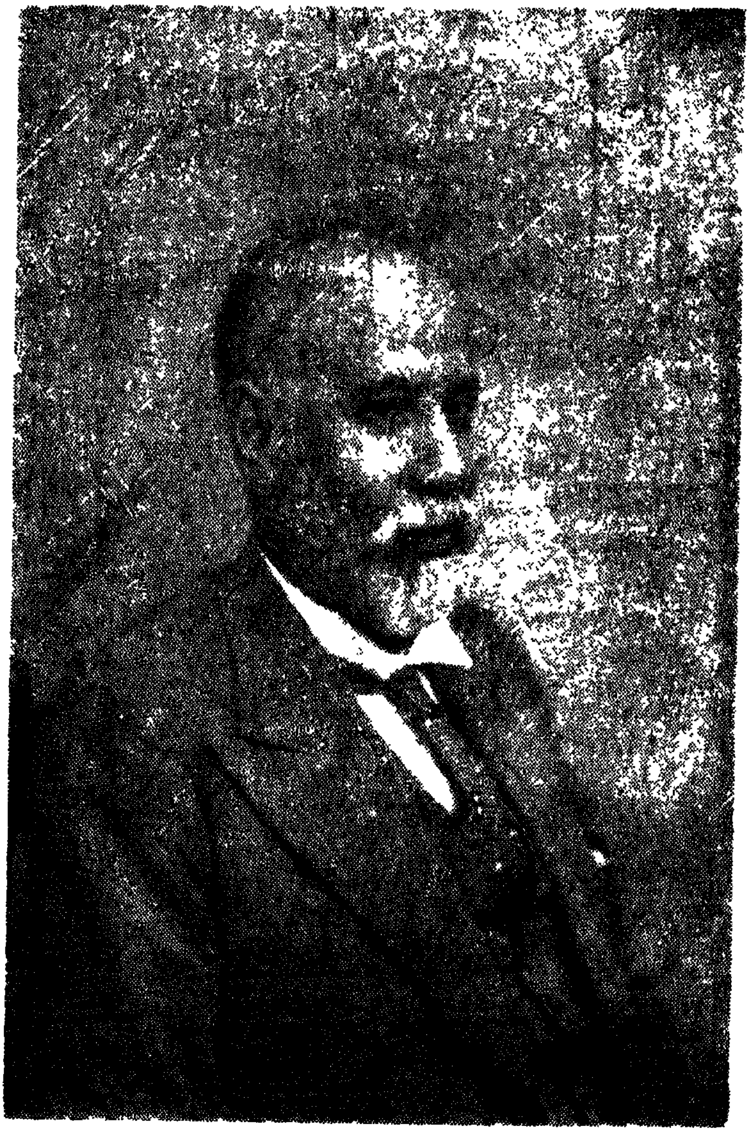
زبانوں میں یہ قوت بالطبع دوسری زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ قدیم روما کے ایک مشہور فصیح کا قول ہے۔ کہ "فصاحت آزادی کا ایک بہترین ثمر ہے"۔ یہ وہ درخت ہے جو اسی سرزمین میں جڑ پکڑتا ہے جس پر آزادی کی حکومت ہو۔ اور جسے آزادی ہی کی آب و ہوا راس ہے" مغربی ممالک کی ترقی فنِ فصاحت میں اُن ممالک کی آزادی کے مطابق ہے۔ اور یہاں کی ترقی یہاں کی آزادی کے تناسب سے ہے۔ یورپ میں قدردانی کی یہ نوبت ہے۔ کہ مشہور آدمیوں کے ایک ایک لکچر کے لئے پانچ پانچ ہزار روپیہ اور دس دس ہزار روپیہ دینے کو لوگ تیار ہیں۔ وہ لکچر کا ٹھیکہ لے لیتے ہیں اور ٹکٹ لگا دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ابھی قدردانی نام کو نہیں۔ مفت لکچر سننے والے بھی پانچ دس ہزار آدمی ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی اس ضروری اور قابل قدر فن کو فن سمجھ کر اختیار کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں اور قومی مفید کاموں کے واسطے ترغیب و تحریص کے لئے کارآمد ہوں"

"فنِ تقریر"

انسان بالطبع مدنی یعنی سوسائٹی پسند واقع ہوا ہے۔ جب تک یہ وحشی ہے اس وقت تک تو مثل حیوانوں کے دوسرے انسان سے بھاگتا ہے۔ مگر جہاں اُسے تمدن کی ذرا سی بھی چاٹ لگی پھر تو یہ ہم صحبتوں کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ تنہائی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شائستہ دنیا میں قیدِ تنہائی سزاؤں میں صعب ترین شمار کی جاتی ہے۔

آپ ہندوستان کے کسی گاؤں میں شام کے قریب جائیں جب کسان دن بھر کی محنت سے تھکے ماندے آکر کسی کوچہ کے موڑ پر یا کسی گاؤں کے پاس کے میدان میں حقہ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہوں۔ اور حقہ ایک سے دوسرے کی طرف گردش کر رہا ہو۔ یہ کیا ہے؟ ایک کلب لیکن ساتھ ہی نہایت کم خرچ اور ہندوستان کی حالت کا سچا نقشہ۔ اسی کے مقابل میں ذرا اپنی عنانِ خیال کو یورپ کی طرف موڑ دیجیے۔ اور انگلستان کے کسی گاؤں کے اسی طبقہ کے لوگوں کے کسی مجمع کی تلاش کیجئے۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ ایک مختصر سا مکان ہوگا۔ اُس میں گو کسی قدر بھدی مگر خاص آرام دینے والی کرسیاں ہوں گی۔ جو ایک میز کے گرد قرینے سے سجی ہوئی ہوں گی۔ میز پر کچھ چوٹ پڑے ہونگے اور ہر شخص اپنا اپنا چوٹ پی رہا ہوگا۔ خاموشی کا شیدا چپ چاپ بیٹھا ہوگا۔ اور باتوں کا مشتاق اپنی بذلہ سنجی سے دوسروں کے دلوں کو لبھا رہا ہوگا۔ گو دن بھر حاضرین میں سے ہر شخص مزدور یا کاشتکار تھا۔ اور گو گھر میں جا کر اس کو خدمتگار میسر نہ ہو۔ مگر کم از کم اس تھوڑے عرصے کے لئے ہر شخص اُس پُر آسائش مکان کو اپنا مکان اور...... خدمتگار کو اپنا خدمتگار سمجھنے سے ایک قسم کی راحت پائے گا جاڑوں میں اگر آپ کسی ہندوستانی دیہاتی کلب کو ملاحظہ کرنا چاہیں تو آپ اہلِ دیہہ کا ایک اچھا معقول مجمع کسی تکیہ میں یا شبود وارہ میں یا پٹوار خانے میں غرض ایسی جگہ میں جس کو سب کی جگہ کہہ سکیں اور کسی خاص شخص کا مکان نہ ہو۔ پائیں گے۔ وہ بدستور حلقہ باندھے ہونگے اور درمیان میں آگ جل رہی ہوگی۔ کبھی ہاتھ لمبے کر کے آگ کے قریب لے جائیں گے۔ کبھی ان کو مل کر پھر چادر میں لپیٹ لیں گے۔ جو بے چاروں کے لئے دوشالہ یا اوورکوٹ کی قائم مقام ہوتی ہے۔ یورپ کے دیہات کے کچھ نمونے تو ہندوستان کے دیہات میں موجود ہیں۔ گو بہت کم درجے کے ہیں۔ دل بہلانے کے سامان وہاں تو مختلف ہیں۔ علاوہ انواع و اقسام کے کھیلوں کے جو محض تفریح کا کام دیتے ہیں...... مثلاً "عمر خیام کلب" کو لیجئے جو لوگ اخبارات دیکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص اس کی لمبی لمبی رپوٹیں بھی دیکھی ہونگی۔ اس کا آغاز چند ایسے علم دوست انگریزوں سے ہوا۔ جو فارسی زباندانی کے شوقین تھے۔ اور فارسی شعراء





دیده بیذا

میں "عمر خیام" کی مشہور رباعیات پسند کرتے تھے۔ جیسا کہ گریڈن نے عمر خیام کے ترجموں سے اپنے اہل ملک کو مستفید کیا۔ شمع شیکسپیئر اور ملٹن کی نازک خیالیاں اپنے دیسی بھائیوں تک پہنچاتے۔ مگر یہ تو دور کی باتیں ہیں...... یہاں کسی کو ہمت نہیں کہ شیکسپیئر کلب نہ سہی ایک سبھا ہی کا اب تو بنا دے...... انگلستان میں شیکسپیئر کی یہ قدر ہے کہ گو بچپن میں بھی وہ وہی کتابوں میں ہوتا ہے۔ گو مرتے وقت وہاں کے ملک الشعرا ٹینی سن کی انگلی بھی اسی شیکسپیئر کی ہی کتاب پر تھی۔ ہمارے خیال میں نہ صرف ایران بلکہ ایشیا سعدی پر ویسا ہی نازاں ہو سکتا ہے۔ جیسے انگلینڈ بالعموم شیکسپیئر پر"

"مجالس تفرقہ"

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ رہی ہے۔ کہ یہاں فن تنقید کا رواج نہیں تھا۔ آجکل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہو گیا ہے.... مدرسوں میں بعض نیم ملا "کرٹسزم" کے معنے "نکتہ چینی" پڑھاتے ہیں یا بہت پڑھے تو "رازنی" لکھ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس لئے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں...... فن تنقید کے رواج کے لئے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں۔ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا۔ دوسرے فن تنقید کے اصول کے موافق آجکل کی بعض مشہور تصنیفات کو تنقید کے ترازو میں تولنا۔ اور نتیجہ بلا کم و کاست ظاہر کرنا..... یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے۔ کوئی پرانا دیوان یا کتاب اٹھا کر دیکھیے۔ قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا۔ آخر میں صفحوں کے صفحے تقریظوں سے پر ہیں۔ ہمیں یاد نہیں کہ آج تک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں۔ ایک آدھ نقص بھی بتا دیا گیا ہو...... آپ ذرا کسی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجئے۔ مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائے گی۔ مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔

"فن تنقید"

"فن تقریر کی نسبت یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر کوئی دل سے اس کا شوق کرے۔ تو یہ اسے کچھ نہ کچھ بنا دیگا اس کا خاصہ ہے کہ میدان سخن میں بزدلوں کو دلیر کرتا ہے اور دلیروں کو شیر کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فن تقریر شائستہ ممالک کیلئے ضروریات زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔

.. بغیر سخت محنت کے کوئی مناسب دلیل مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک فرانسیسی مصنف کا قول ہے اور میرے خیال میں بہت درست قول ہے۔ کہ فصاحت اصلی اس کا نام ہے۔ کہ آدمی سب باتیں جو مناسب ہوں کہہ دے اور ان کے سوا اور کچھ نہ کہے۔ یہ آخری شرط سب سے مشکل ہے۔"

"جوہر فصاحت"

"خدا جانے کس مقبول گھڑی سر سید احمد مرحوم کی زبان سے "زندہ دلان پنجاب" کا فقرہ نکلا تھا۔ کہ تیر کی طرح نشانہ

پر پڑا اور جزو زبان اردو بن گیا۔ سر سید مرحوم نے جو بڑے کام اپنی زندگی میں سرانجام دئے۔ اُن میں یہ بھی کم قابلِ تعریف نہیں کہ انہوں نے ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک ربطِ خاص پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی حضرات کو بجائے پنجابیوں سے نفور ہونے کے اُن کا مداح بنا دیا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ملک کا یہ چھوٹا سا حصہ پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ یہاں کی زمینیں شروع سے حاصل خیز رہی ہیں۔ اور یہاں کے کسان محنت اور مشقت میں ضرب المثل ہیں۔ ستلج اور بیاس کے درمیان ایک دوابہ ہے۔ جو خوبیٔ آب و ہوا اور کثرت باغات و اشجار کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ کشمیر کا قرب اور اس کے ساتھ پنجاب کا قدیم اور موجودہ تعلق اس صوبہ کے لئے باعث رونق ہیں۔ بعض اضلاع پنجاب کی حد ریاست کشمیر کی حد سے ملتی ہے۔ یہ اضلاع زبان حال سے ؎

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد!

پکار رہے ہیں۔ ان سب قدرتی سامانوں کا مجموعی اثر باشندگانِ پنجاب پر پڑتا ہے۔ کسی ملک یا حصۂ ملک کی جغرافیائی حالت ہمیشہ ایک خاص اثر اہلِ ملک پر رکھتی ہے۔ اہل عرب کی ترقی کا راز اُن کے صحرائی ملک میں مستور تھا۔ اگر انہیں گھر میں کھانے کو مل جاتا۔ تو مشکل تھا کہ وہ دنیا کے مشارق و مغارب کو چھان مارتے۔ اہلِ انگلستان بہ حیثیت قوم اچھے جہاز ران ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ قدرت نے ان کو دنیا سے اس قدر الگ تھلگ ڈال دیا تھا۔ کہ بغیر جہاز رانی کے وہ شائستگی کی نعمت سے بہرہ ور ہی نہ ہو سکتے تھے۔

پنجاب میں لکھے پڑھے اشخاص اکثر اوقات لمبے لمبے قدم مار کر چلتے۔ مستعدی سے کام کرتے۔ اور حسب ضرورت میلوں پیادہ چلنے کو آسان سی بات سمجھتے دکھائی دیں گے۔ ممالک مغرب و شمال میں معمولی سفید پوش بھی تھوڑی دور تک بغیر سواری کے چلنا عار سمجھے گا پنجابی کے دسترخوان پر سیدھی سادھی روٹی اور سیدھا سادھا سالن ہوگا اور بس۔ ہندوستان میں دسترخوان دسترخوان نہ سمجھا جائیگا جب تک اُس پر کم از کم چار پانچ رکابیاں نہ ہوں۔ یہاں تکلف سے خالی ہونا ہنر اور وہاں پُر تکلف ہونا اصلِ خوبی شمار ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ پنجابی کے لئے ضرورت ہے کہ کبھی کبھی اپنے ہندوستانی بھائی سے تکلف کی کتاب کے بہت نہیں تو ایک دو ورق پڑھ لیا کرے اور ہندوستانی کو چاہیئے کہ بے تکلفی کا سبق پنجابی سے سیکھ لے۔ شائستہ زندگی کے لوازم پنجابی کو ذرا پُر تکلف ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اپنی اصلی سادگی نہ کھو بیٹھے۔ ہندوستانی اگر زندہ دلوں کے وطن کی پیروی کرے۔ اور پنجابیوں سے بے تکلف ربط اور میل جول بڑھائے تو بہت سی وہ مردانہ اور مفید عادتیں سیکھ سکتا ہے۔

پنجاب کی اگر کوئی سیر کرے تو وہ جا بجا صحت بخش زندہ دلی کے ثبوت پائیگا...... اس صوبہ کی آبادی گلہائے رنگا رنگ کا ایک عجیب گلدستہ ہے۔ ہر شہر میں ایک معقول تعداد ملک کے دیرینہ باشندوں کی ہے۔ جو آریہ نسل سے ہیں۔ پنجاب کے آریہ اصل والے باشندے رنگ و روغن میں اپنے اُن بھائیوں سے اچھے ہیں جو گنگا کے کنارے جا بسے ہیں۔ اور جن کے رنگ کو پورب کے آفتاب کی زیادہ سخت حدت نے قدرے سیاہ کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ ہر شہر میں ایک خاص حصہ مسلمانوں کی مختلف اقوام کا ہے۔ جن میں سید عربی الاصل مغل تاتاری۔ پٹھان۔ افغانستان سے آئے ہوئے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں ایک کثیر تعداد کشمیری الاصل باشندوں کی ملتی ہے۔ جن میں سے بعض ٹھیٹھ پنجابیوں میں مل گئے ہیں۔ اس ملاپ نے پنجاب کے بعض مقامات کو

کا حسن و ملاحت بنا دیا ہے۔ اور وہ صورتیں پیدا کی ہیں جن کی نظیر ہندوستان کے اور بہت کم حصوں میں پائی جاتی ہے۔ پنجاب میں کئی گھر ایسے ہیں جہاں زن و مرد ایرانیوں اور افغانیوں سے فارسی میں گفتگو کرتے اور ان کے ساتھ قہوہ پیتے ہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ قیمانی چائے اڑاتے ہیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ پان کھاتے ہیں۔ اور اردو میں باتیں کرتے ہیں۔ اور خالص پنجابی مجلس ہو تو پنجابی بولی جاتی ہے۔ اور حقہ تو بھری مجلس میں یوں پھرتا ہے جیسے گوپیوں میں کاہن۔ اور اردو زبان کو یوں بولتے ہیں جیسے ان کی اپنی ہو۔ بایں ہمہ بلا ضرورت کم بولتے ہیں اور خموشی پسند واقع ہوئے ہیں یہاں تک کہ ہندوستانی انہیں عموماً گھمی کہتے ہیں۔ کوئی پنجابی آپ کو سفر میں ملے تو بہت کم ایسا ہوگا کہ خود بخود آپ سے مستفسر حالات ہو۔ لیکن اگر اتفاق سے گفتگو شروع ہو جائے تو پردہ جلد درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ دوست بننے میں پنجابی بہت مستعد اور زود باد نہیں۔ مگر دوست بن جائے تو یکتا دوست ہوتا ہے۔ پنجابی گھر کا ایسا عاشق ہے جیسا ہندوکا کوئی اور باشندہ لیکن جب گھر سے نکل کھڑا ہو تو افریقہ اور آسٹریلیا اور امریکہ سب ایک ہے۔ دنیا کے دور دور حصوں میں پنجابی کا سُراغ ملتا ہے۔ اور جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جائے گی۔ زندہ دلوں کا وطن اپنے ہونہار بیٹوں کو ہر ملک دو یار اور ہر آب و ہوا میں جاگزیں ہوتا اور پھلتا پھولتا دیکھے گا۔"

"زندہ دلانِ پنجاب"

"اس سے بڑھ کر تعجب کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہ ہوا۔ جن کی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ چنانچہ ہم اپنے ملک کے دو جانبازانِ عشق کا ذکر کیا چاہتے ہیں۔ اور ایک ایسے شاعر کا نام لیا چاہتے ہیں جس نے ان کے حسن و عشق کی داستان کو دوام کا خلعت بخش دیا ہے۔ افسوس ہے تمامنا کہ اس شاعر نے زبان ایسی اختیار کی جو بدقسمتی سے علمی زبان نہیں ہے۔ ورنہ سرزمین پنجاب کا یہ دلفریب قصہ شہرت کے پر لگا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گیا ہوتا ...... پنجاب میں تو اب بھی کوئی ایسا بے خبر نہ ہوگا جو علاقہ جھنگ سیال کی مشہور جمیلہ ہیر اور تخت ہزارہ کے چوہدری میاں رانجھا کے نام سے ناواقف ہو۔ مگر چونکہ ان کی محبت کے افسانے صوبہ پنجاب کی ٹھیٹھ بولی میں ہی منظوم ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ انہی حدود کے اندر محدود رہ گئے ہیں۔

یوں تو پنجابی شاعری کا جزو اعظم ہیر اور رانجھے کے معاملہ کی طرف اشارات سے پُر ہے۔ مگر دو مشہور پنجابی شاعروں نے اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت کو صرف اسی قصے کے نظم کرنے پر صرف کیا ہے۔ اور ان کی مدت العمر کی کمائی اصل میں ان کی وہی کتابیں ہیں جو **ہیر وارث شاہ** اور **ہیر فضل شاہ** کے نام سے موسوم ہیں۔ وارث شاہ یا جیسا کہ عوام میں پکارا جاتا ہے "وارے شاہ" ایک فقیر منش اہل دل گزرا ہے جس کا کلام جو ہر قبول ساتھ لے کر آیا ہے۔ اور جسے ہر دلعزیزی حاصل کرنے میں اتنی کامیابی ہوئی ہے۔ کہ اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی۔ "وارے شاہ" کا کلام پنجاب کی دیہاتی زندگی کا ایک جزوِ ضروری ہے۔ کسی گاؤں میں آپ جائیں۔ آپ "وارے شاہ" پڑھنے والے اور سننے والے پائیں گے۔ کہیں دھوپ کے وقت آدھے دن کی سرتوڑ محنت کے بعد کسی درختوں کے جھنڈ کے تلے کسی کنوئیں کے قریب چند دیہاتی جمع ہیں۔ اپنی اپنی روٹی کھا چکے ہیں۔ ذرا حقہ پینا اور سستانا چاہتے ہیں۔ کہ ان میں سے ایک ہیر وارث شاہ کے ابیات گانے لگا۔ دم بھر میں سب کے سب حلقہ باندھ لیتے ہیں...... جب رات کو کام کاج سے نپٹ کر

گاؤں والے شاملات وہ کے میدان میں یا کسی فقیر کے تکئے یا ٹھاکر دوارہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک خوش الحان آدمی سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہیر پڑھ کر سنائے۔ سالہا سال سے یہ قصہ اسی طرح دہرایا جا رہا ہے۔ بوڑھے جوان سب اسے سنتے ہیں۔ اور قصہ میں یا زبان میں یا طرز بیان میں کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ اکتاتے نہیں۔ اس خاصیت میں "وارث شاہ" دنیا کے مشہور شعرا سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور اگر پنجاب میں سعدی یا شیکسپیئر سے کسی کو تشبیہ دینی ہو تو وارث شاہ سے زیادہ مستحق اس تشبیہ کا کوئی نہیں مل سکتا۔ گو بہت سے اسباب سے وارث شاہ اس مرتبۂ عالی کو جو بزرگان موصوف کو حاصل ہے کبھی نہ پہنچ سکے۔ تصانیف کی رنگا رنگی کے اعتبار سے بہادی کچھ اعتبار سے تو سعدی اور شیکسپیئر جیسے ناموران جہاں ایسے بلند پائے پر ہیں کہ اور مصنفین کو ان سے نسبت دینا گستاخی ہے۔ مگر اپنی صداقت میں وارث شاہ کئی باتوں میں ان سے مشابہ ہے۔ وارث شاہ اپنی سہ و داد نامال ان گھر زبان کا ویسا ہی استاد ہے جیسا سعدی فارسی جیسی فصیح اور شیکسپیئر انگریزی جیسی وسیع زبان کا۔ الفاظ اور لغات کی کثرت وارث شاہ میں اپنی زبان کی بساط کے موافق ویسی ہی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال وارث شاہ نے بھی اس کثرت سے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ کہ ان کے مجموعہ سے پنجابی زبان کی ایک خاصی "کتاب الامثال" تیار ہو سکتی ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف قماش کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جس خوبی کے ساتھ وارث شاہ نے اسی قماش کے لوگوں کی زبان ادا کی وہ اسی کا حصہ ہے۔ اور اس کی نظیر شیکسپیئر میں ملتی ہے۔ ملّا کی طرف جو گفتگو ہے اس میں مسجد کی صفت کی رٹیاں صاف جلوہ گر ہیں۔ رانجھے کی گفتگو میں سادگی۔ ناتجربہ کاری۔ چوہدری زادہ ہونے کا گھمنڈ۔ عشق کی چوٹ اور گداز سب مل کر پر تو فگن ہیں۔ ہیر کی باتیں دلفریبی کے ساتھ الہڑ پن کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ ہیر کی نند کی باتیں شوخی اور شرارت کا پہلو برابر نباہتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں وہ اپنی روانیوں کے خواص بتا رہا ہے۔ اور کہیں جوگی مختلف پنتھوں کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ ایک طرف کوئی اہل اللہ رموز معرفت سنا رہا ہے۔ تو دوسری طرف کوئی خود غرض فقیر و لوبھ طمع کی آڑ میں دنیا طلبیوں کو شکار کرتا ہے۔ ملاح ملاحوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اور بازاری مردوں اور عورتوں کے الفاظ اور خیالات کی سچی تصویریں موجود ہیں۔ یہ مرقع بے عیب ہوتا اگر اس میں بعض جگہ فحش عبارتیں نہ آ جاتیں...... کاش زبان کا کوئی نامور مصنف اس قصہ کو وارث شاہ کے خیالات کے ساتھ اردو میں منتقل کر لے۔ اور اس طرح اس زمانہ کی ابتدا ہو گی جس میں پنجابی زبان علمی زبانوں کے زمرہ میں داخل ہو گی۔ اور وارث شاہ کے ماہ تاباں کے گرد اور بیسیوں خاص خاص اختر چمکیں گے۔ اعلیٰ خیالات کے لکھنے والے اور قدرتی جذبات کی تصویریں کھینچنے والے مصنفوں کی پنجابی میں کمی نہیں۔ مگر ان میں کئی ایسے ہیں جن کا کلام بعض آوارہ گرد فقیروں کی زبان پر ہے۔ بعض ایسے ہیں جن کی شاعری عوام کے مقبول گیتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ نہ کوئی ان گیتوں کو جمع کرتا ہے۔ حالانکہ اہل پنجاب کی زندہ دلی کا اور ان کی مردانگی کا جلوہ ان کے ان قومی گیتوں میں نظر آتا ہے۔"

"ہیر رانجھا"

درد محبت چوں زن ہندی کسے مردانہ نیست

سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

حب حکومت سامانیہ برطانیہ نے سرزمین ہند سے رسم ستی کی بیخ کنی کر دی۔ مردہ خاوند کی لاش کے ساتھ بیوی کا جل مرنا قانوناً جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ تاہم یہ معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے۔ کہ رسم ستی فی الحقیقت مسدود بھی ہو گئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ

جہاں تک ظاہری کا جل مرنے کا تعلق تھا وہ تو رک گیا۔ مگر ایک اور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے۔ ستی بذات خود ایسی بُری رسم نہ تھی کہ اسے جرم کہا جا سکے۔ اس کو معیوب اس بات نے بنا دیا کہ عورتیں جلنے پر مجبور کی جانے لگیں۔ ورنہ باختیار خود محبت کے اثر سے آگ میں کود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو محض وحشیانہ حرکت نہ تھی بلکہ انسانی طبیعت کے ایک زبردست جذبہ کا پُرزور ظہور تھا۔ ہندوستان کی بے شمار ستی ہونے والی بیوائیں امیا تھا ایک نیک نہاد اور پاک طینت ہوئی ہوں گی۔ کہ ان کی مردانگی کی یاد میں بُت سپیں بنائے جائیں۔ شعر مندرجہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی شاعر کے دل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ افسوس کہ وہ چتائیں تو دُور ہوئیں تو ختم ہو گیا۔ مگر تمام عمر آتش غم پر کباب ہونا نہ گیا۔ اگر اسی فیصدی مجبوراً کودتی تھیں تو یہاں سو سے فی صدی مجبوراً زُرہ زُرہ کر مر جاتی ہیں۔ ہندوستان کے ہر گھر میں۔ ہر گھر میں نہیں تو ہر گلی۔ ہر گلی نہیں تو ہر محلہ میں ایسا بھاڑ موجود ہے۔ جس میں کوئی باعصمت خاتون بیگناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ دھواں تک نہیں اُٹھتا۔ اور اگر اُٹھتا ہے تو کوئی دیکھتا نہیں۔ پس سب امتیاز چھوڑ کر اس ستی اور آجکل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ وہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی۔ اور اس قربانی میں کئی ایسی نیک بخت عورتیں بھی ہیں جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرایہ میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ جیسے پروانہ شمع پر نثار ہو کر مر جاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آتی ہیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے۔ جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صفت خاص میں دنیا بھر کی عورتوں میں ہندی عورت اپنا جواب نہیں رکھتی۔"

"کیا رسم ستی بند ہو گئی ہے؟"

(انگلستان کے مشاہیر کا مرقد ویسٹ منسٹر ایبے)

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک　　دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز　　(حالیؔ)

دلی مرحوم (خدا اُسے دوبارہ زندہ کرے) ایک زمانے میں مشاہیر عالم کا مرجع تھی۔ بڑے بڑے باکمال دُور دُور سے اس کی طرف کھنچے ہوئے آئے اور آخر وہیں کے ہو رہے۔ وہیں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔ خود وہاں کی مردم خیز زمین سے کئی نامور اٹھے۔ اور بالآخر وہی سرزمین ان کی آرامگاہ بنی۔ لندن کے مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے کو دیکھ کر مجھے مولانا حالیؔ کا شعر یاد آیا۔ اور دہلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ بھی ایک خزانہ تھا۔ اور یہ بھی ایک خزانہ ہے۔ کیونکہ جو دہلی ہندوستان کا بڑا شہر تھا۔ اور لندن اس وقت دنیا کا بڑا شہر ہے۔ اس خزانے کے قدردان دنیا سے اٹھ گئے۔ اور اس خزانے کے محافظ اور قدرشناس موجود ہیں۔ ایک بات جو خاک دہلی کی خاصیت ہے۔ وہ خاک ویسٹ منسٹر کو حاصل نہیں۔ ایک چیز جو ویسٹ منسٹر میں ہے وہ دہلی کو میسر نہیں۔ خاک دہلی ہے مہماں نواز۔ عرب ہو یا ترک۔ ایرانی ہو یا ہندی اسے سب عزیز ہیں۔ اور سب کو اپنے آغوش شفقت میں لیتی ہے۔ مگر ویسٹ منسٹر کی چار دیواری میں جگہ پانا مشکل ہے۔ اور دن بدن مشکل ہوتا جاتا ہے۔ وہاں ویسٹ منسٹر کو جو امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبے میں سینکڑوں ناموروں کے جسد خاکی مدفون ہیں۔ بمقابلہ دہلی میں میلوں کا چکر لگانے پر بھی اتنا مجمع یکجا نہیں مل سکتا۔ وہاں گوہر سنگریزوں میں ملے ہوئے پڑے ہیں۔

...... یوں تو اس مدفن کا ہر حصہ تاریخ انگلستان کا ایک باب ہے۔ مگر وہ حصے عام زائرین کے لئے سب سے زیادہ

دلچسپ ہیں۔ ایک وہ جس میں مشہور مدبران ملک کی تعداد یادگاریں ہیں۔ اور وہ سرا وہ جسے "گوشۂ شعرا" کہتے ہیں۔ زندگی میں تو یہ لوگ مختلف شعبوں میں ممتاز تھے ہی مگر خدا جانے کس بلا کا جادو ان کے ضمیر میں تھا کہ بعد مرگ ان کی خاک بھی دامنگیر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ایک ایک کے سرہانے چشمِ عبرت کھولے بیٹھے رہیں۔ مدبروں میں سے بعض کو شاندار یادگاریں اور شاندار کتبے نصیب ہوئے ہیں۔ گلیڈسٹون کا کتبہ اس خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس سے سادہ کتبہ ایسے بلند پایہ وزیرِ دولت کے لئے بن نہیں سکتا تھا۔ اس پر اس کے نام اور سنہ ولادت و انتقال کے سوا یہ الفاظ ہیں:۔

"چار دفعہ وزیرِ اعظم انگلستان"

اگر کوئی غور سے دیکھے تو ان کتبوں کے الفاظ میں۔ ان پتھروں کی سلوں میں۔ ان کے رنگ میں۔ ان کی شکل میں ان بزرگوں کی تاریخ اور خصائل کا خلاصہ موجود ہے۔ شعراء اور مصنفین کے مدفن عام طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کی قبر پر تو کوئی پھول چڑھانے نہیں آتا۔ مگر چارلس ڈکنز، گولڈسمتھ کی قبر پر اکثر پھول نظر آتے ہیں۔ اور بعض لوگ ساتھ رقعے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مصنفین کی قبروں پر ان کے مداح کبھی کبھی پھول چڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ اقلیمِ عقل و ذہانت کے بادشاہ گزرے ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ قلوبِ انسانی پر جو دیرپا حکومت اور اثر ان کو حاصل ہے وہ ان بادشاہوں کو نہیں۔ جن کی قوت تیغ و سنان سے تھی۔

"مدفنِ بزرگان"

ذیل کی تحریر شیخ عبدالقادر مرحوم کے ایک مضمون "حریت اور آزادی" سے اقتباس کی گئی ہے۔ جو انہوں نے لندن میں لکھا تھا۔ بعض دوسرے مضامین کی طرح خاص طور پر اس مضمون سے اُن کی حب الوطنی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لندن جیسے بارونق اور عظیم الشان شہر میں بھی رہ کر اپنے غریب ملک کو نہیں بھولے۔ اور ہر وقت اُس کی فلاح و بہبودی کے لئے بےتاب رہے

"ادارہ"

ہندوستان میں کئی دل سوختہ اس وقت ایسے ہیں۔ کہ وہ اپنے ملک سے قطعی مایوس ہیں۔ ان میں ایک میرے دوست ہیں۔ جو ان دنوں واپس وطن گئے ہوئے ہیں۔ یہاں تھے تو ان سے بحث رہتی تھی۔ اور وہاں ہیں تو خطوں میں وہی بحث چلتی رہتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے وہ زن و فرزند کے علائق سے اب تک خالی ہیں۔ اس لئے وہ اکثر خواب دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے حرکت کر جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کدھر جائیے گا؟ یہ تو فرمائیے۔ کہیں آپ کی قدر بھی ہے؟ ذرا جنوبی افریقہ میں آسٹریلیا میں تشریف لیجا کر دیکھئے حریت کے تمغے کے بغیر کون پوچھتا ہے۔ آپ کے بھائیوں کی جو تواضع ہو رہی ہے وہ سارے زمانے کو معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایران یا روم کو جا بسائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی تحقیر وہاں بھی رفاقت کرے گی۔ جب تک اپنے ملک کی عزت نہ بناؤ گے باہر کہیں عزت نہ ہو گی۔ انہوں نے مجھے خط میں لکھا۔ "ہندوستان جہنم ہے"۔ میں نے جواب عرض کیا۔ کہ "اسے جنت بنائیے۔ اور مجھ سے پوچھئے تو میں اسے باہمہ نقائص آب و ہوا اچھا سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ اپنے ذاتی علائق کی محبت ہے یا قدرتی الفت وطن بہر حال ہندوستان جو کچھ ہے ہمارا ہے۔ اور ہم اس کے ہیں۔ جو عزت ہم اس سے جدا ہو کر حاصل کرنا چاہیں۔ جو آرام ہم اس سے

بھاگ نکلے ڈھونڈیں۔ وہ اوّل تو ملیگا نہیں۔ اور اگر ملا تو اس کا لطف نہیں آسکے گا۔ عزّت وہی جو وطن کی عزّت کے ساتھ ہو۔ اور وطن کی عزّت اہل وطن میں حرّیت کے پیدا ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہ جب ہی پیدا ہوگی کہ ہر کار رو وطن اُسے اپنی آبرو۔ اپنے نفع سے بڑھ کر عزیز رکھے"۔

"حرّیت اور آزادی"

یوں تو ہر ملک کے میلے تماشے اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ مگر مجھے بولوِن علاقہ فرانس میں ایک نہایت اُجلا میلا نظر آیا۔ اس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ تو "پھولوں کی لڑائی" ہے۔ مگر چونکہ اس میں ایک پرانے ایشیائی کھیل کا اصول موجود ہے۔ اس لئے ہم اسے "گل بازی" کہہ سکتے ہیں۔ میں اس میلے کو دیکھ کر آیا۔ تو ایک ہجوم خیال ساتھ لایا۔ گل بازی کی پہلی جھلک دیکھی تو خیال آیا۔ کہ کیا اچھا ہو اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں اسی طرح پھول برسا کریں۔ میلے کی بے تکلفی نے اپنے ملک کی ہولی یاد دلائی۔ عجب نہیں کہ ہندوستان کے اس تہوار کے بانیوں نے ایسی ہی بے ضرر دل لگی اور چہل پہل کے لئے ہولی کی رسم جاری کی ہوگی۔ جس میں مصفا آب گلرنگ ایک دوسرے پر چھڑکنا ابتدائی دستور ہوگا۔ میں نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے گروہ میں دیکھا۔ تو خیال کیا کہ برابر کے جوڑ ہیں جبھی تو ان دونوں میں ملاپ ہو رہا ہے۔ صدیوں کی لڑائی اور مخالفت کے بعد ایک کے دل میں دوسرے کی وقعت پیدا ہوگئی ہے۔ اور دونوں نے محسوس کیا ہے۔ کہ ناحق لڑنے جھگڑنے سے بہتر ہے۔ کہ دونو ہمسایہ قومیں صُلح سے رہیں۔ اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے کی بجائے ایسے جلسوں میں جمع ہو کر ایک دوسرے پر گل باری کیا کریں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اپنی طرف خیال گیا۔ اس مجمع اغیار میں ایک میں اور ایک میرا رفیق دو ہندوستانی تھے۔ سوچا کہ ہم کیا کریں اور کہاں ہیں۔ ع شلِ گل بازی نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔ ہم پر کیا موقوف جاپان کو چھوڑ کر ساری ایشیائی قومیں اقوامِ یورپ کے ہاتھ میں گل بازی بنی ہوئی ہیں۔ وہ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہاں اگر انہی گلوں میں قوت اجتماع پیدا ہو جائے۔ تو شاید ادھر اُدھر پھینکے جانے سے محفوظ ہو جائیں۔ فرانس اور انگلستان کی مصالحت آج سے دس برس پہلے کون باور کر سکتا تھا کہ ممکن ہوگی۔ اس کو دیکھ کر سعدیؒ کا قول یاد آیا۔ کہ "ختن و فتا صلح کردند۔ اما زید و عمر را ہنوز خصومت باقی است" فرانس اور انگلستان جیسے صدیوں کے دشمن مل جائیں۔ اور ہم ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے ملاپ کو ترسا کریں" ؎

بیا تا گُل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

"گلبازی یا گل باری"

"کتنا ہی دلچسپ مقام کیوں نہ ہو۔ آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اُکتا جاتا ہے۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیلِ آب و ہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً سیر سے انسان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور گھر میں گھسے رہنے کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے۔ رفع ہو جاتی ہے۔

تُوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ جو بیس مختلف حصّوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلاتِ حرب اور طریقِ جنگ میں قدیم زمانوں سے لے کر آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں۔ ان سب کے بعد صلح کا

محل نظر آتا ہے۔ ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبر کی تصویر کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ارفع الدولہ مرزا رضا خاں دانش (پرنس صلح) اہل یورپ نے آجکل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبروں کی صف اوّل میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔ اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا مختلف زبانوں میں صلح کے متعلق کتابیں۔ رسالے اور اخبارات رکھے تھے۔ جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے تھے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے۔ اور ان کے برخلاف اہل یورپ کو اکسانے والے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی انہیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صلح ایسی ہی تدابیرِ صلح پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصودِ اصلی فقط اسی قدر ہے۔ کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے۔ اور وہ سب مل کر باقی سب دنیا پر غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں۔ لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جب تک دلِ یورپ اور اُن کے مدبّروں کے دماغ سے اپنے ملک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال فساد کی بنا اور جنگ و جدال کی جڑ ہیں۔ اس صلح و جنگ کے عجائب خانے۔ آلاتِ حرب اور نمائشِ جنگ کو اسبابِ صلح سے جو نسبت ہے۔ غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوقِ جنگ و شوقِ صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں۔ اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ سے زیادہ روپیہ سامانِ جنگ پر صرف کر رہی ہیں۔ اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے کہ وقتِ جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے ہیں۔ اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے۔

میلان میں ایک بڑی نمائش انہی دنوں میں ہو رہی تھی۔ اور یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوام تھی۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ بلگیریا۔ کینیڈا۔ چین۔ کیوبا۔ ڈنمارک۔ فرانس۔ جرمنی۔ جاپان۔ انگلستان۔ ہالینڈ۔ پرتگال۔ سوئٹزرلینڈ۔ ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک اس نمائش میں شریک تھے۔ ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈتی تھیں۔ کہ کہیں اس کا بھی شمار بین الاقوام ہے یا نہیں۔ آخر بہت سی تلاش سے خیمۂ انگلستان کے سایۂ عاطفت میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دوپٹے ایک الماری میں سجے ہوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصہ اس نمائش میں بہت خفیف تھا۔ پس اس حصے میں سے ہندوستان کے حصہ میں کیا آتا۔ ہاں جو موجود ہو گیا وہی غنیمت ہے۔ لیکن ہمارے ملک کو آئندہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے اور ہندوستان کی مصنوعات کو دنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی بہت سی صنعتیں مٹ گئیں اور مٹتی جاتی ہیں۔"

"یورپ کے بعض دلچسپ اور تاریخی نظارے"

سر عبدالقادر کی ایک مختصر نظم

ذیل کے چند اشعار جنہیں ایک مختصر نظم بھی کہا جا سکتا ہے ہیں شیخ عبدالقادر کے ایک پرانے مضمون "گھر سے نکل کے دیکھو" میں ملی ہے۔ اس ضمن میں اُن کے چند فقرے بھی درج کئے جاتے ہیں "ادارہ"

بس اگر محبت وطن کا ہندیوں پہ یہ اثر ہو کہ وہ اپنا گھر گھسنا پن چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے۔ نئے مقامات میں رزق ڈھونڈنے کی مشکلات کا سامنا کرنے . . . بلکہ یں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ وطن سے نکل کر وطن کو یاد رکھیں۔ اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس کے حق سے غافل نہ ہوں۔ اگر ڈھب سے آدمی نکلنے لگیں تو تجارت۔ زراعت۔ صنعت۔ اشاعت مذہب کئی اسباب تحریک کے لئے موجود ہیں۔ موجودہ حالت کے مصداق مجھے دو چار مصرعے سوجھے ہیں۔ لکھے دیتا ہوں۔ شاعر ہوتا تو اس طرح تحریک کے بجائے مختصر اور پُر زور نظم لکھ دیتا جسے لوگ گاتے پھرتے۔ اب ان مصرعوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور اپنے ہم خود احباب سے عرض کرتا ہوں ع۔ اگر "شاعری" یک اشارت بس است۔

بخت آزمانے نکلو　　جنگل بسانے نکلو

گڑیاں اُٹھانے نکلو　　جانیں لڑانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

دولت کمانے نکلو　　حکمت اُڑانے نکلو

مذہب سکھانے نکلو　　ہر سر بہانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

شیخ عبدالقادر کا ایک شعر

شیخ عبدالقادر شعر نہیں کہتے تھے لیکن راحل ہوشیارپوری نے اُن کا ایک شعر حفیظ ہوشیارپوری کی روایت سے نقل کیا ہے۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ شعر ایک موقع پر بے ساختہ اُن کی زبان سے نکل گیا تھا۔

اب درِ دولت پہ بھی ملنا ہو تو ان سے محال
آپ ملنے آئے تھے پچھلے برس کی بات ہے

اقتباس از روزنامہ احسان لاہور

۱۱ فروری ۱۹۵۰ء

تعلیم اور تہذیب نفس

شیخ سر عبدالقادر مرحوم

مرحوم شیخ سر عبدالقادر نے ایک موقع پر تقسیم اسناد کی تقریب پر طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ

میں خود اپنی عمر کے ستر سے زیادہ برس بسر کرنے کے باوجود بھی محتاج نصیحت ہوں۔ تو میں نوجوانوں کو کیا نصیحت دوں۔ جوانی کا عموماً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر چیز کو آزمائے اور غلطیاں کرنے کے بعد تجربہ کے راستے سے صحیح نظریئے قائم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کے تجربوں پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ میں چند ایسے اصولی امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ جن کو آپ دلیل راہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ رواداری ہے۔ یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے۔ اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پڑھ لوگ اور کم پڑھے ہوئے زیادہ تر تنگ خیال ہوتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب اعلےٰ تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں۔ انہیں روشن خیالی سیکھنی چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ ان کی اپنی رائے نہ ہو۔ یا ہوا کا ہر جھونکا ان کی رائے کو بدلتا رہے۔ اگر دوسروں کی رائیں سننے کے بعد اپنی یا اپنی جماعت کی رائے کو قابل ترجیح سمجھیں تو اس پر ضرور قائم رہیں۔ اور دوسروں کو دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ نامناسب ہے۔ کہ اختلاف رائے کی وجہ سے دوسروں کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں یا ان کی نیتوں پر حملے کریں۔ یا ان سے میل جول منقطع کر دیں۔

دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی عداوت یا نفرت سے زیادہ مہلک اور تباہ کن نہیں ہو سکتی۔ ہم آجکل ہندوستان کی تاریخ کے جس دور سے گذر رہے ہیں۔ اس میں بدقسمتی سے یہ تباہ کن دوروں پر ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب سے فرقہ وارانہ فساد اور کشت و خون کی خبریں آرہی ہیں اور کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں اس وقت تک ہزاروں جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہو کر ہسپتالوں میں چلے گئے ہیں اور بعض جگہ اب بھی مذموم قسم کے حملے ہوتے ہیں۔ جابجا لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ کہیں تقریروں اور جلسوں کی ممانعت ہے کہیں پانچ سے زیادہ آدمی مل کر نہیں نکل سکتے۔ کہیں شام کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتے۔ از راہ انصاف کہئے کہ یہ بھی کوئی زیست کا طور ہے۔ ہم چلے تھے سر پہ آزادی کو بٹھانے اور ہم سب کو بھی کھو کر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم آزادی کی ایک ضروری شرط کو بھول گئے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آزادی تب حاصل ہوتی ہے کہ انسان اسے اپنے ہاتھ سے محدود رکھنا سیکھ جائے۔ اور کسی معاملے میں حد سے نہ گذرے۔ نہ دوسروں کو برا بھلا کہکر انہیں اشتعال دے۔ اور نہ اشتعال سے دست درازیوں کا حوصلہ بڑھائے اس جلتی آگ پر پانی ڈالنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر اس جامعہ سے سند پانے والے نوجوان اور اسی طرح کے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ عزم کر لیں کہ وہ اپنی تقریر و تحریر سے اور اپنے مجموعی اثر سے باہمی صلح کی کوشش کریں گے اور لڑائی جھگڑے کو مٹانے میں ساعی ہونگے۔ تو ملک کی زہریلی اور مکدر فضا صاف ہو سکتی ہے۔

اس کوشش میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا وہ طبقہ جو اخبارات سے تعلق رکھتا ہے۔ یا تعلق پیدا کرنے کو ہے خاص طور پر مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اخبارات اس زمانہ میں عوام کی رائے پر بڑے اثر ڈال سکتے ہیں اور ڈالتے رہتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے ہر اخبار کا ایڈیٹر اور اس کے نائبین اور اس کے خبر رساں رپورٹر اور نامہ نگار ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی ایک رپورٹر کی غلط یا مشتبہ خبر جو کافی چھان بین یا تحقیقات کے بغیر شائع کر دی گئی ہو۔ بعض اوقات ملک بھر میں آگ لگا سکتی ہے۔ اور مختلف جماعتوں کو آپس میں لڑا سکتی ہے۔ . . . . جن ناگوار حالات کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور جو آگ ان سے لگی ہوئی ہے۔ وہ اخبارات کے بجھانے سے بجھ سکتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجھانے میں کوشاں ہوں۔

اغلب ہے کہ آپ میں سے کئی فن اخبار نویسی کو جو ایک معزز اور آزاد مگر غریبانہ پیشہ ہے۔ اختیار کریں گمان ہے بعض ایسے ہونگے جنہوں نے اخبار نویسی کی غریبانہ زندگی کو دوسرے زیادہ کمائی والے پیشوں پر اس کی آزادی کے لحاظ سے ترجیح دی ہے۔ تو کسی لالچ یا طمع کو اپنے منصفانہ و آزادانہ طرز عمل کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں اور یہ نہ پرواہ کریں۔ کہ آپ کے اخبار کے ایڈیٹر کو کسی قسم کی رپورٹ پسند ہوگی۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ صداقت کا کیا تقاضا ہے آپ اپنے آپ کو صداقت کا مزدور سمجھیں۔ نہ کہ زید عمر کا ملازم اس سلسلہ میں یہ جتا دینا بیجا نہ ہوگا کہ اخباری زندگی میں تا حال مسلمانوں کا حصہ جتنا ہونا چاہئے۔ اس سے بہت کم ہے۔ اور اس میں زیادہ نوجوانوں کی شمولیت کی ضرورت ہے۔ حقیقی مفید تحریکیں ملک یا ملت کی ترقی کے لئے درکار ہیں۔ وہ اخبارات اور ان کے خبر رساں کارندوں کے بغیر نہیں چل سکتیں۔ اور جو لوگ اخباروں کو صحیح واقعات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ وہ ایک بھاری

خدمت کر سکتے ہیں۔ خواہ اس خدمت کا معاوضہ نسبتاً قلیل ہو۔

اخبارات اور ان کے نامہ نگار اگر رواداری اور صلح پسندی کی راہ اختیار کریں تو وہ اپنے وطن عزیز کے ایک مشکل یعنی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کے حل میں معقول امداد دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ اہمیت رکھتا تھا اور ملک کی قسمت کا فیصلہ اس کے انعقاد و عمل پر موقوف ہے۔ مگر اس بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں یوں تو بہت سی قومیں آباد ہیں۔ مگر یہ دو تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور اپنی اپنی تاریخی اور تمدنی روایات کی مالک ہیں۔ ان میں اگر اتفاق ہو۔ تو ہندوستان بڑی سے بڑی [illegible] شان میں شمار ہو سکتا ہے۔ اور ان میں اگر اندرونی مخاصمت رہے۔ تو ہندوستان باوجود اپنی جغرافیائی بڑائی اور اپنی زمین کی [illegible] زرخیزی کے کمزور ملک ہوگا۔ اس لئے قوم و ملت کے بہی خواہوں کی یہ کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ باہمی اتفاق اور محبت کی تلقین کریں۔ تاکہ ہر کہ و مہ سمجھ جائے کہ سیاسی نظریئے اگر مختلف بھی ہوں تو بھی باہمی میل جول پر ان کا اثر نہیں پڑنے دینا چاہیئے۔ کیونکہ ہندو مسلمان دونوں اسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہیں انہیں ایک دوسرے سے دیوار بہ دیوار رہنا ہے۔ اور یہیں پر پیوند زمین ہونا ہے۔ نہ ہندوؤں میں سے وہ لوگ جو پہلے وسط ایشیا یا عرب ایشیا سے یہاں آئے تھے۔ پھر وہاں جا کر آباد ہو سکتے ہیں۔ اور نہ مسلمانوں کے وہ حصے جو عرب یا ایران یا افغانستان یا بخارا اور سمرقند سے آئے تھے۔ پھر وہاں جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نسل اور خون کے لحاظ سے بھی یہیں کی پیداوار ہے۔ اس لئے حق ہمسائیگی کا یہ تقاضا ہے۔ کہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں۔ اور ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ اور ایک دوسرے کی دل آزاری اور توہین و تضحیک سے گریز کریں۔

اخباروں کے عارضی مضامین کے سوا پائدار علمی خدمات بھی آپ میں سے اکثر کو مرغوب ہونگی اگر آپ یہ چاہیں کہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ ملک کی خدمت کریں۔ اور عزت کی روزی کمائیں تو یہ بھی بہت اچھا راستہ ہے۔ بشرطیکہ یہ کام اس عزم کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ جو کتابیں تصنیف کی جائیں یا شائع ہوں۔ ان سے ملک کے تمدنی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی حالات بہتر ہو سکیں اور جو میلان بعض حلقوں میں اخلاقی پستی پیدا کرنے والی تحریروں کی طرف ان دنوں ہو رہا ہے۔ اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بازار میں اس دوسرے قسم کے مال کی گاہکی ضرور ہے۔ مگر اعلےٰ تعلیم والوں کو نہ چاہیئے کہ کسی عارضی نفع کے لئے خود بھی بداخلاقی کے بڑھانے کی ذلت گوارا کریں۔ اور جو ان کی کتابوں کو پڑھیں انہیں بھی یہی راستہ دکھلائیں۔ کتابوں میں تراجم کی طرف جامعہ ملیہ کے مکتبہ نے بھی توجہ کی ہے۔ اور عجب نہیں کہ آپ میں سے کئی نوجوان اس طرف مائل ہوں کہ دوسری زبانوں سے اردو میں کتابوں کے ترجمے کریں یہ بہت ضروری کام ہے اور کتابوں کے پڑھنے اور خریدنے کا شوق ملک میں بڑھ رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شغل آمد کے لحاظ سے بھی اچھا ہوگا مگر اس سے ملک کو فائدہ اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ جو کتابیں ترجمے کے لئے چنی جائیں۔ ان کا انتخاب صحیح ہو۔ بعض کتابیں ایسی ترجمے کے ذریعہ ملک میں پھیل رہی ہیں۔ کہ ان سے فائدہ کی جگہ نقصان کا احتمال ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک نصیحت یاد آتی ہے۔ جو ایک معمر خاتون نے مجھے

دی تھی۔ جب میں پہلے پہل طالب علمانہ حیثیت سے انگلستان گیا تھا۔ میں اس سے پہلے کئی سال مسلمانوں کے ایک انگریزی اخبار موسومہ "پنجاب آبزرور" کی ایڈیٹری میں صرف کر چکا تھا۔ اور اردو میں رسالہ مخزن بھی شائع کر رہا تھا۔ جب اس لیڈی نے یہ سنا تو مجھ سے دریافت کیا۔ تم انگلستان سے بھی کچھ مضامین لکھ کر اپنے ملک کو بھیجا کرو گے۔ میں نے کہا "ہاں"۔ وہ کہنے لگی یہاں اچھی چیزیں بھی ہیں۔ اور بُری بھی۔ تم وہ چیزیں یہاں سے بھیجنا جو تمہارے اہل وطن کے لئے مفید ہوں۔ اور ان کا ذکر نہ کرنا جو بُری نظر آئیں۔ کیونکہ برائی کا حصہ ہر ملک میں کافی ہوتا ہے۔ باہر سے اور لے جانے کی کیا ضرورت۔ میرے دل پر اس خاتون کے اس مشورہ کا بہت اثر ہوا۔ اور میں نے حتی الوسع اس مشورے پر کاربند ہونے کی کوشش کی۔

علمی اور قلمی پیشوں کے سوا بھی بہت سے ذرائع جائز معاش کی تلاش کے ہیں۔ اور اسی لئے اس درس گاہ میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دستکاری اور ہنر پر زور دیا گیا ہے۔ آپ میں سے کئی اپنے اپنے سیکھے ہوئے ہنر سے کام لیں گے۔ اس جامعہ نے دستکاری کے درجے کو پہلے سے بلند کر دیا ہے۔ اور اگر اس ارادے کی تکمیل میں کامیابی ہو۔ اور موجودہ دستکاری کی جماعتوں کی ترمیم کر کے اپنے صنعتی شعبے کو ایک پالی ٹیکنیک بنا دے جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ تو دستکاری کا رتبہ اور بھی بڑھ جائیگا میں چاہتا ہوں کہ اس جامعہ میں پڑھے ہوئے طالب علم نہ صرف خود اپنے اپنے ہنر کو ذریعہ معاش بنائیں۔ بلکہ اس اصول کی تبلیغ کریں۔ اور وہ جھجک جو اب تک بعض دلوں میں ہے۔ کہ وہ پیشۂ قلم کو نسبتاً بہتر اور ہاتھ سے کام کرنے کو کم معزز سمجھتے ہیں۔ لوگوں کی طبائع سے نکل جائے۔ کسی ملک کے عوام میں وہ خودداری جو آزادی کی بنیاد ہے پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اہل حرفت و [illegible]ت سے دیکھنے کا رواج ہو۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آکر حکومت کی ہے [illegible] یہی تھا۔ کہ وہ حرفت و صنعت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے۔ جس شخص نے دُخانی انجن ایجاد کر کے قوموں کی قسمت اور نظام کو بدل ڈالا۔ وہ معمار ہی تھا۔ ان کے ملک میں بہت سے گھرانوں کے نام ان کے پیشوں سے متعلق ہیں۔ "سمتھ" بہت [illegible]س کے معنی لوہار کے ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگوں نے انگلستان میں اور دیگر حصص یورپ میں اپنے گلڈز یعنی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں نے اپنی برادری کی مجالس شوریٰ کے لئے بڑے عالیشان ایوان قائم کئے [illegible] جن میں بہت سے اب تک موجود ہیں۔ اور ان کے جلسوں میں جب اس ہنر کے پیشہ ور شامل ہوتے ہیں۔ تو ایک دوسرے کا ادب کرتے ہیں۔ ہر رکن دوسرے کو آنریبل کہکر خطاب کرتا ہے۔ اور قابل عزت سمجھتا ہے۔ ان میں بعض انجمنیں زمانہ بھر کی دولت جمع کر کے ایسی مالامال ہو گئی ہیں۔ کہ ان کے ہاں دعوتوں کے موقع پر چاندی سونے کے برتنوں کا مجموعہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ اور مزدور۔ معمار اور ترکھان کا یہ حال ہے۔ کہ وہ جب کسی کے ہاں مزدوری کرنے آتا ہے۔ تو گھر والوں سے تن کر بات کرتا ہے۔ اور ذرا سی اونچی آواز یا جھڑک برداشت نہیں کرتا۔ گویا وہ مساوات کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی سے صرف اس لئے کم نہیں سمجھتا۔ کہ دوسروں کا کام اچھے کپڑے پہن کر کرنے کا ہے۔ اور اس کے کپڑے کام کرتے وقت میلے ہیں۔ یہی میلان میں نے اپنے سفر استانبول کے زمانے میں ترکوں میں پایا۔ ان کے ہاں لفظاً فندی معزز لوگوں

کے لئے مخصوص ہے۔ میں نے دیکھا کہ دکاندار کو اس کی دکان کا گاہک آفندم کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ گاہک کو آفندم کہہ کر جواب دیتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا۔ کہ وہ دکانداروں اور اہل صنعت میں سے بیشتر لوگ اس لئے آفندی کہہ کر بلائے جاتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ فوجی تربیت پا چکے ہیں۔ اور وہ ایسے سپاہی ہوتے ہیں۔ کہ جب ضرورت ہو۔ وہ فوجی خدمت میں حصہ لے سکیں۔ استانبول میں مسلمانوں کی بہت سی دکانوں پر چوکھٹوں میں لگے ہوئے قطعات آویزاں تھے جن پر "الکاسب حبیب اللہ" لکھا ہوتا تھا یعنی کسب حلال کرنے والا خدا کا دوست ہے۔ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی قوموں کی بڑائی ان کی مصنوعات کی بڑائی پر موقوف ہے اور ان کی دولت کا راز ان کی تجارت ہے۔ اپنی مصنوعات باہر بھیجتے ہیں۔ اور دوسرے ممالک سے کھانے پینے کی چیزیں اور کچا مال اپنے ہاں منگواتے ہیں۔ تجارتی کاروبار سے جن لوگوں کو واقفیت ہے انہیں معلوم ہے۔ کہ آجکل کی تجارت اپنے سرمایہ کے لئے بنکوں کی محتاج ہے۔ اور جس تجارتی کارخانہ کے پس پشت بوقت ضرورت آسان شرائط پر کسی بنک سے روپیہ حاصل کرنے کا سہارا نہ ہو۔ وہ کارخانہ بہت مشکل سے چلتا ہے۔ جہازوں کے ذریعہ جو مال باہر سے آتا ہے۔ اس کی قیمت کی ادائیگی اور اس کے مال کا حصول بنکوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو مال اس ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس کی قیمت کی وصولی بھی ان کے بنکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تجارتی ترقی بنکوں کے نظام اور عمل سے واقفیت اور بنکوں کے وجود کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ملت اسلامیہ بنکوں کی اہمیت سے بے پرواہ ہے اور نہ ہی بیمہ کمپنیوں میں ان کا کوئی متناسب حصہ ہے۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طلبا کو اس مضمون سے آشنا کرنے کے لئے اپنے مدرسوں میں سیونگ بنک اور باہمی تعاون کی سوسائٹیاں قائم کی ہیں۔ اور طلبا کو خود ان کا انتظام کرنے کا موقع دیا ہے۔ مگر اس مضمون کی وسعت کے لحاظ سے یہ ابجد خوانی اور کنڈرگارٹن کی تعلیم کا درجہ سمجھا جانا چاہیئے۔ اب یہ کام فارغ التحصیل طلبہ کا ہوگا۔ کہ وہ اس خشک مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ اور اس راستہ پر اپنے ہم عمروں اور دوستوں کی رہنمائی کریں۔ بنکوں میں حساب کتاب کی مہارت درکار ہے۔ اور کئی مسلمان طلبہ اس کو روکھا پھیکا کام سمجھتے ہیں۔ لیکن یہی روکھا پھیکا کام جب کسی کو آجاتا ہے۔ اور وہ اس کے ذریعے سے اپنے کاروبار کو بڑھا کر خوشحالی پیدا کرتا ہے۔ تو اس مضمون میں خود بخود دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ہر مضمون کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ اس کی ابتدائی منزلیں محنت طلب اور دشوار ہوتی ہیں۔ مگر آگے جا کر دلچسپ ہو جاتی ہیں۔

میں نہیں چاہتا۔ کہ میرا یہ مختصر خطبہ اتنا طویل ہو جائے۔ کہ آپ اکتا جائیں۔ اس لئے ایک اور مضمون کا ذکر کر کے آپ سے رخصت ہوں گا۔ وہ مضمون سائنس ہے۔ آپ کی جامعہ میں جو پہلا خطبہ تقسیم اسناد پڑھا گیا۔ اس میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا۔ اور یہ بتایا گیا تھا۔ کہ سائنس کی ترقی سے دنیا میں کیا کیا نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ اور ابھی کتنے بڑے امکانات باقی ہیں۔ انہوں نے آپ کو مسلمانوں کی تاریخ سے بہت سے حوالے دے کر یہ بھی بتایا تھا۔ کہ ایک وقت میں مسلمان علوم فلسفہ اور سائنس کی مشعل لے کر گھر سے نکلے تھے۔ اور انہوں نے اس وقت یورپ کی جہالت اور تاریکی کو علم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور شاگرد عالم فاضل بن گئے۔ اور استادوں کی اولاد جاہل بن گئی۔ اب زمانہ نے پھر کروٹ لی ہے۔ اور آپ لوگوں میں جو طلبہ سائنس

پڑھ چکے ہیں۔ انہیں اس کی قدر و قیمت کا کافی احساس ہوگیا ہے۔ اب ان کا کام ہے جستجو اور تلاش کی لا انتہا منزلوں سے کہ اس مضمون کی گہرائیوں تک پہنچیں۔ اور اس میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کریں۔ بعض لوگ ان تباہیوں کے مناظر دیکھ کر اور سن کر جو سائنس کی بعض ایجادات کی بدولت گزشتہ ہولناک جنگ کے دوران میں دیکھے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ سائنس اتنی ترقی نہ کرتی اور دنیا اس مہلک خونریزی سے بچی رہتی جس سے لاکھوں جوان ہلاک ہوئے اور ان سے زیادہ عورتیں اور بوڑھے اور بچے اور بیمار بھی آسمان سے برسنے والے گولوں کی زد سے نہ بچ سکے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے برے نتائج پہلی نظر میں انسان کو سائنس سے بیزار کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے نفس علم میں کوئی برائی پیدا نہیں ہوتی۔ علم کے صحیح اور غلط استعمال میں بہت فرق ہے۔ یہ برے نتائج اس کے غلط استعمال کے ہیں۔ ورنہ وہی علم بہتر نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ہوائی جہاز اڑانے لگے۔ تو آپ مہینوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی مسافت گھڑیوں میں طے کر لیتے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھینچ گئی ہیں۔ اور نئی دنیا اور پرانے زمانے کی پائمالی اب آپ کے لئے دوسرا ملک نہیں۔ دوسرے محلے بن گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ایٹم بم جس سے آجکل ساری تہذیب دنیا گھبرائی ہوئی ہے۔ اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ کہ جیسے جاپان کے دو شہروں کو دو بموں نے خاک کا ڈھیر بنا دیا اور کانت الجبال کالعھن المنفوش کا عینی مشاہدہ کرا دیا۔ اگر اسی طرح کے دو چار اور کسی دوسری جنگ میں پھینکے گئے۔ تو دنیا اور اس کے تمدن و تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر یہ یاد رکھیئے کہ ایٹم بم کو محض نگاہ خوف سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بالکل ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنا رعب دوسروں پر جمانے کے لئے یا اپنا عقدہ جلد حل کرنے کے لئے اس قوت کا بے جا استعمال کرے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ ڈر بھی رہے گا۔ کہ اگر کسی دوسری قوم نے بھی اس کا راز پا لیا ہے۔ اور اس کے بنانے کی ترکیب سمجھ لی ہے۔ اور وہ جواب میں بم پھینکے گی۔ تو کیا حشر ہوگا۔ اور اس ڈر کی وجہ سے وہ بم پھینکنے سے رکی رہے گی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت رد و کد کے بعد اقوام عالم اس شرط کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گی۔ کہ ایٹم بم سے جنگ میں ایک قوم دوسری قوم کو ہلاک کرنے کا کام نہ لے بلکہ اس قوت میں جو امکانات انسان کے نفع کے لئے استعمال ہونے کے ہیں۔ ان سے کام لے کر تہذیب کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔ اس لحاظ سے شائد وہ دن بہت دور نہیں۔ جب ایٹم بم کا عجیب دیو انسان ضعیف کی عقلمندی اور سائنس دانی کی بدولت اس کے سامنے جھکتا ہوا لایا جائے۔ اور ہاتھ باندھ کر اس کی خدمت کا وعدہ کرے۔ اور جس طرح بجلی کی زبردست قوت انسان کی زر خرید لونڈی بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے لئے چکی پیستی ہے۔ اور اسے گرمی میں پنکھا کرتی ہے۔ اور شب تار میں روشنی دیتی ہے۔ اسی طرح ایٹم کی قوت انسان کی خادم بن جائے گی۔ عزیزو آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے ہیں۔ جس میں انسان کی قوت کے امکانات بے حد وسیع ہو گئے ہیں۔ بہت سے پوشیدہ حقائق آپ کے گرد و پیش موجود ہیں۔ اور ان کے خزانوں کی کلید سائنس کے ہاتھ میں ہے۔ اور سائنس کی کتابیں اور تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ قفل کھول لئے اور خزائن سے دنیا کو مالا مال کر دیجئے۔

اس طولانی تمہید کا اختصار یہ ہے۔ کہ آپ نے جو علوم یہاں حاصل کئے ہیں۔ اب ان کا استعمال اور صحیح استعمال کا

وقت آیا ہے۔ لہٰذا راہ سے اور ہر مرحلے کو درس گاہ سے باہر قدم رکھئے اور یاد رکھئے کہ آپ کا اصلی فرض یہ ہے۔ کہ جو کام کریں اور جو فن اپنائیں اس میں مصروفیت کے ساتھ یہ مدنظر رہے کہ ملک وملت کی خدمت آپ کے ذمے ہے۔ ملک وملت کے لئے سچی محبت آپ کے دل میں ہو اور ان کی فلاح کے لئے ہر قربانی اور ہر ایثار کے لئے آپ تیار ہوں۔ ایک بہت بڑے ادیب اور سیاح جو ترکی کے علاوہ عربی فارسی خوب جانتے تھے۔ لاہور میں وارد ہوئے میں شاید اس وقت سکول کے کسی درجے میں پڑھتا تھا۔ میں ان کی تعریف سن کر انہیں دیکھنے گیا۔ اور میں نے ان سے کہا۔ کہ کوئی ہدایت مجھے دیئے جائیں۔ انہوں نے ایک شعر پڑھا۔ جو میں آپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کرتا ہوں ؎

من نمی گویم سمندر باش یا پروانہ باش
گر بہ[1] سوختن باشی برو مردانہ باش

---

[1] ، جس اخبار سے یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ یہ لفظ وہاں چھپائی میں اُڑ گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس شعر کے ماخذ سے واقف ہوں اور اس کی تصحیح فرما سکیں۔ تو ہم ان کے ممنون ہوں گے

میں نے ستارۂ اقبال کا طلوع دیکھا ـــــ

چند ابتدائی منازل ترقی میں اقبال کا ہم نشین اور ہم سفر تھا" عبدالقادر

"جب شیخ محمد اقبال کے والد بزرگوار اور اُن کی پیاری ماں اُن کا نام تجویز کر رہے ہوں گے۔ تو قبولِ دعا کا وقت ہوگا۔ کہ اُن کا دیا ہوا نام اپنے پورے معنوں میں صحیح ثابت ہوا ...... جناب داغ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے۔ جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے دکن میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات اُن کی زبان سے سنے ...... ابتدائی مشق کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ شیخ محمد اقبال نے اپنی وہ نظم جس میں ہمالہ سے خطاب ہے ایک جلسے میں پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے۔ اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی ...... اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ کہ میں نے ...... رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ میں نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے ...... (جب) پہلا پرچہ شائع ہونے کو تھا ...... میں نے کہا کہ وہ ہمالہ والی نظم دے دیجئے... ..... انہیں خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا۔ کہ وہ نظم بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے (مخزن کے پہلے نمبر کے لئے) لے لی۔

..... اول اول جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں وہ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں۔ اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار ترنم میں پڑھنے کے لئے کہا۔ اُن کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے ...... ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا ...... پہلے تو صرف خواص ہی ان کے کلام کے قدرداں تھے اب عوام بھی کھنچ آئے ...... (اب) جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے ہیں وہ بھی محو ہوتے ہیں۔

شیخ عبدالقادرؒ



عام دوست

قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

(شیخ عبدالقادر مرحوم)

بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کے جنازے ہماری عمر میں اُٹھے۔ بہت سی بڑی شخصیتوں کے گذر جانے پر اُنکے مدّاحوں کو ہم نے روتے اور بلکتے دیکھا مگر جس شان سے قائدِ اعظم کا جنازہ اُٹھا اور جس دلی اندوہ وغم کا اظہار کروڑوں بندگانِ خدا نے پاکستان کے ہر گوشے میں کیا ہے اسکی مثال ملنی محال ہے۔ پرانے زمانے میں ملک اطالیہ میں ایک عجیب رسم تھی کہ کسی مرنے والے کے عزیزوں اور دوستوں کے آنسو جمع کئے جاتے تھے۔ میں نے جب اٹلی کے سیاحت پمپیائی کا مشہور اُجڑا ہوا شہر دیکھا تو وہاں بعض گھروں کی الماریوں میں چھوٹی چھوٹی شیشیاں نظر آئیں جنہیں پانی سا بھرا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مرنے والے کے ماتم میں اسکے جو دوست شریک ہوتے تھے وہ اپنے آنسو شیشیوں میں ٹپکاتے تھے۔ اور جسکے مرنے پر بہت سی شیشیاں آنسوؤں سے پُر ہوتی تھیں اُن کی تعداد کی کثرت اُس کی ہر دلعزیزی کا معیار ہوتی تھی۔ اگر ہماری قوم میں کوئی ایسا رواج ہوتا اور وہ سب آنسو جو مسلمانوں نے جابجا اس پُر افسوس واقعہ پر بے اختیار بہائے تھے۔ جمع کئے جا سکتے۔ تو ایک طوفانِ آنسو بپا ہو جاتا۔"

(ریڈیو پاکستان لاہور)

"مخزن" دورِ سوم کا آغاز

افراد کی طرح قوموں میں بھی زندگی اور موت ہوتی ہے لیکن مر مر کے جینا افراد کو بیان تو نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ قوموں کا بھی بسا اوقات یہی حال ہے۔ کہ مر کر مٹ جاتی ہیں۔ مگر بعض قومیں یا جماعتیں اور ان کے اصول و عقائد ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے زوال ہے مگر فنا نہیں۔ اسلام اُن عقائد اور اصولوں کا نمونہ ہے۔ اور مسلمانوں کی قوم ایسی قوم ہے جو گر گر کر سنبھلتی ہے اور مر کر زندہ ہوتی ہے۔ یہی حال زبان اردو کا ہے۔ جو پیدا تو مسلمانوں کی خاطر نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ اور مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھی۔ مگر مدت سے ہندوؤں کا ایک طبقہ اس فکر میں تھا۔ کہ اسے مسلمانوں کی خاص زبان قرار دیا جائے۔ اور اس حد تک فی الحال وہ طبقہ کامیاب ہوا ہے کہ اس نے ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں سرکاری دفاتر سے اس زبان کو نکال دیا ہے اس سبب سے مسلمانوں پر علی الخصوص اور اردو کے حامیوں پر علی العموم اردو کی حمایت اور بھی زیادہ واجب ہو گئی ہے۔ باوجود اس دشمنی کے جو طبقۂ مذکورہ کی طرف سے اردو کے خلاف ظاہر کی جا رہی ہے مجھے یقین ہے۔ کہ اردو زبان ہندوستان میں بہت حد تک باقی رہے گی۔ اور بیرونی دنیا میں بھی پھیلے گی۔ کیونکہ اس میں بہت سی اندرونی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ اب ہر قسم کے خیالات اور مطالب کے اظہار پر قدرت رکھتی ہے۔ اور اُن کو خوبی اور عمدگی سے بیان کر سکتی ہے۔

اردو زبان کی وہ قوت جس سے زخموں سے چور ہو جانے کے باوجود یہ سخت جانی سے ہر زد کا مقابلہ کر رہی ہے اور نئی زندگی کی علامات دکھا رہی ہے۔ اس کے ادبی رسالوں میں موجود ہے۔ مخزن کے نام سے اُسی رنگ کے ایک نئے رسالے کا مخزن کی ابتداء سے تقریباً نصف صدی بعد جاری ہونا اس کا مر کر جی اٹھنا ہے"

شیخ عبدالقادرؒ

گورنمنٹ کالج لاہور میں!

افتتاحِ اُردو

۱۹۴۸ء میں سر عبدالقادر مرحوم نے گورنمنٹ کالج میں ایم اے کی اُردو جماعت کا آغاز فرماتے ہوئے ایک مقالہ افتتاحیہ بعنوان "پنجاب میں اُردو کا ارتقاء" پڑھا۔ اس یادگار تقریب پر جناب حفیظ ہوشیارپوری نے چند تواریخ کہی تھیں۔ جن میں سے دو ذیل میں پیش کیجاتی ہیں

ادارہ

(۱) پنجاب میں اُردو کا ارتقاء مقالہ از سر عبدالقادر

۱۹۴۸ء

(۲) نویدِ افتتاحِ اُردو از دستِ قادر

۱۹۴۸ء

از شیخ محمد اکرام مرحوم　　　　　　　　　　　　　　　　　　ترجمہ وحید الدین احمد

مولانا شبلی نعمانی

کسی وسیع تر اور زیادہ ترقی یافتہ زبان کا مورخ زبان کے خالصتہً ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے غالباً مولانا شبلی کی تصانیف کو اعلیٰ پایہ کے ادب میں شمار نہ کرتا۔ گو انہیں سوانح اور تاریخ کے صیغے میں ایک بلند مقام کا مستحق ضرور سمجھتا۔ اردو زبان ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی کوششوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے جنہوں نے ہمارے ادب کی بنیادوں کو استوار کیا ہے ہم تنقید کے وہی معیار نہیں استعمال کر سکتے جن کی روشنی میں ہم کسی قدیم اور متمول زبان کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں اس نقطہ نگاہ سے شبلی کو اردو ادب کے معماروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ پیدائش اور وطنیت کے اعتبار سے ان کا تعلق نہ دلی سے تھا اور نہ لکھنؤ سے۔ جو اس وقت اردو زبان کے دو بڑے مرکز تھے ادبی حیثیت سے بھی انہیں دلی یا لکھنؤ کی روایات سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ گو اپنی زندگی میں انہیں دبستانِ لکھنؤ سے بھی واسطہ رہا اور دلی سکول سے بھی۔ اور غالباً انہوں نے ان دونوں مقامات کے بہترین عناصر اخذ کئے۔ انہوں نے مولوی فیض الحسن سے تعلیم پائی۔ جو اپنے زمانے کے ایک نامی اور صاحب کمال استاد تھے۔ بہت سی سربرآوردہ ہستیوں کو انکی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ مولوی فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ اور عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہ چکے تھے۔ فیض الحسن صاحب چونکہ دلی کی ادبی روایات کے پیرو تھے۔ اس لئے مولانا شبلی نے بھی ان اثرات کو قبول کرنا شروع کیا اس کے بعد دلی سکول سے ان کا براہِ راست تعلق اس وقت قائم ہوا جب سید احمد خان نے انہیں علی گڑھ کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر مامور کیا۔ سر سید کی باوقار شخصیت نے جلد ہی انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کے علاوہ انہیں دلی سکول سے دوسرے مصنفوں مثلاً حالی اور مولوی نذیر احمد سے بھی قریبی تعلق رہا۔ میری نظر میں انہی تاثرات کی وجہ سے ان کی انشا میں لکھنوی اسلوب کی نسبت دہلوی طرزِ تحریر زیادہ نمایاں ہے۔ آخر عمر میں جب انہیں لکھنؤ کی ادبی شخصیتوں سے قریبی طور پر ملنے جلنے کا موقع ملا تو ان کی تحریر میں بھی لکھنوی نفاست اور بانکپن کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔

ہمیں چونکہ صرف ان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرنا ہے۔ اس لئے ان دلچسپ تفصیلات کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ وہ ایک غیر معمولی قابلیت رکھنے والے مستقل مزاج اور باہمت انسان تھے اور انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی استعداد کے جوہر دکھائے۔ انہیں ایک ایسے بلند مرتبہ معلم کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل تھی جس نے اپنے شاگردوں کو قابلِ قدر خیالات اور اعلیٰ مقاصد سے روشناس کیا۔ آج بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت سی ایسی ممتاز شخصیتیں ہیں جنہیں مولینا

کی تربیت نے ایک بلند مقام پر پہنچایا ہے۔ شروع میں وہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے حامی اور مددگار تھے۔ بہت سی ایسی انجمنیں جن کی بنیاد سرسید نے ڈالی تھی مولانا شبلی کی کوششوں سے پھلتی پھولتی رہیں۔ سرسید کی موت کے بعد وہ علی گڑھ کالج سے مستعفی ہو کر ندوۃ العلماء میں شامل ہو گئے۔ ندوۃ العلماء کا تعلیمی نصب العین سرسید کی تحریک سے کسی قدر مختلف تھا اس نقطۂ نظر کے حامی مشرقی علوم کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور مذہب و دینیات کی تعلیم و تدریس پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی تھی۔ اپنی عمر کے چند سال انہوں نے حیدرآباد دکن میں بھی گذارے اور مملکت آصفیہ کے ادبی اور تعلیمی شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔ حیدرآباد سے ایک معقول پنشن حاصل کرنے کے بعد وہ لکھنؤ لوٹ آئے اور یہاں اپنی زندگی کے باقی دن اپنے محبوب ادبی مشاغل میں گذار دیے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے سیرۃ النبیؐ کی تصنیف کا کام شروع کیا۔ جسے ان کا عظیم ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اس تصنیف کا ارادہ انہوں نے مدت سے کر رکھا تھا لیکن ہز ہائینس بیگم بھوپالی کی مالی اعانت کے سبب ہی یہ ارادہ تکمیل کو پہنچ سکا۔

شبلی نے جس زمانے میں اپنی ادبی زندگی شروع کی مسلمان شرفا فارسی کو اردو پر فوقیت دیتے تھے۔ مولینا کو طبعاً شاعری سے لگاؤ تھا۔ اس لئے انہوں نے شروع سے فارسی میں شعر گوئی اختیار کی اور زندگی بھر اسی زبان میں مشق سخن کرتے رہے۔ ان کا فارسی کلام بے حد شیریں ہے اور انہیں ہندوستان کے بہترین فارسی گو شعراء کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے فارسی کلام کے چار مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان شبلی۔ دستہ گل۔ بوئے گل اور اگر اوائل عمر میں شبلی کی توجہ اردو کی طرف منبذول کرادی جاتی اور وہ اردو کو شعر گوئی کا ذریعہ بنا لیتے۔ تو یقیناً وہ اردو کے ایک نہایت کامیاب اور بااوصف شاعر ہوتے۔ مثنوی صبح امید اور بعض دوسری نظموں سے قطع نظر وہ آخر عمر تک اردو میں شعر کہنے کی طرف مائل نہیں ہوئے اور نہ انہیں اس بات کا خیال آیا۔ کہ وہ اردو میں نہایت فصیح اور مؤثر اشعار کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اردو انشا پردازی ناموران اسلام کی سوانح نگاری سے شروع کی۔ ایک عالم ہونے کی حیثیت میں انہیں تحقیق و تفتیش کا شوق تھا۔ اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ تھا۔ عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی آشنا ہونے کے سبب وہ تاریخ کے اصلی ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک یورپین علوم مشرق کے پروفیسر ٹی۔ ڈبی آرنلڈ نے انہیں اسلامی تاریخ میں نئی تحقیقات کی ترغیب دلائی۔ یہ دونوں علماء جو علی گڑھ کالج کے سٹاف سے تعلق رکھتے تھے گہرے دوست بن گئے۔ اور اپنے فیضان صحبت سے ایک دوسرے پر بہت حد تک اثر انداز ہوئے مسٹر آرنلڈ نے عربی فارسی اور اردو میں درس لینا شروع کیا اور مولوی صاحب فرانسیسی سیکھنے لگے۔ انہوں نے فرانسیسی میں خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ گو وہ فرانسیسی بول نہیں سکتے تھے لیکن وہ اس زبان کی کتابیں بآسانی پڑھ لیتے تھے۔ چنانچہ بڑی کاوش سے انہوں نے اسلامیات اور مشرقی علوم سے متعلق فرانسیسی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مصر، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کا سفر بھی انہوں نے اختیار کیا۔ جس سے ان میں ایک خاص وسعت نظر پیدا ہو گئی۔ اپنے سفر کے حالات و تاثرات کو انہوں نے سفرنامہ روم میں قلمبند کیا ہے یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور

اردو زبان کے بہترین سفرناموں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ناموران اسلام کے متعلق اچھی کتابیں اردو زبان میں نایاب ہیں۔ اور اس سلسلہ میں بھی تحقیق و تفتیش کی بہت گنجائش ہے۔ شبلی نے عالم اسلام کی بعض مقتدر ہستیوں کی سوانح حیات لکھنے کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے خلیفۂ عمرؓ کا انتخاب کیا جو آنحضرتؐ کے بعد دوسرے امیر المؤمنین ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ ایک عادل اور باوقار حاکم تھے۔ ایک جری سپہ سالار اور فاتح اور ایک مدبر اور ایک منتظم اعلیٰ اور ایک عدا ترس النساد۔ شبلی نے ان کی حیات اور کارہائے نمایاں کی تفاصیل۔ اپنی مشہور کتاب الفاروق میں جمع کر دی ہیں۔ اس کتاب نے شبلی کو ایک محقق کی حیثیت سے ہی شہرت نہیں دلوائی بلکہ انہیں اردو زبان کے ایک باکمال انشا پرداز کی حیثیت سے بھی روشناس عالم کیا۔ موجودہ نظام حیدرآباد کے والد میر محبوب علی خان نے اس تصنیف کی سرپرستی قبول فرمائی۔ اردو داں طبقے میں اس کتاب کو بہت مقبولیت ہوئی اور وسیع پیمانہ پر اس کی اشاعت ہوئی اس کے بعد چند اور سوانح عمریاں شائع ہوئیں۔ مثلاً المامون جس میں خلیفہ بغداد المامون کے حالات زندگی ہیں جو اپنے عہد میں علوم و فنون کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ الغزالی میں امام غزالی کے حالات و واقعات ہیں۔ سیرۃ النعمان امام ابو حنیفہ کی سوانح عمری ہے۔ جو سنی مسلمانوں کے حنفی فرقہ کے بانی ہیں۔ اور اس میں الفاروق اور المامون کی سی روانی اور شگفتگی نہیں۔ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ سوانح مولانا روم میں ہے۔ یہ مولانا جلال الدین رومی کی حیات ہے جو اسلام کے اولین صوفیوں میں سے تھے۔ مختصر تصانیف میں بیانِ خسرو قابل ذکر ہے۔ جو امیر خسرو دہلوی کی سوانح عمری ہے۔

جن کتابوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ سب اپنے طور نہایت قیمتی اور قابل رفعت تصانیف ہیں۔ اور صرف ان کتابوں کی وجہ سے شبلی کو ادب میں دوامی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ان اوّل تالیفات سے ایک بلند تر منصوبہ ان کے پیش نظر تھا۔ انہوں نے بانیٔ اسلام کی زندگی کے مکمل حالات ضبطِ تحریر میں لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس مطلب کے لئے انہوں نے وسیع پیمانے پر اپنے موضوع کا مطالعہ شروع کیا اور بہت سے نوجوان علماء کو اس عظیم الشان تصنیف کے لئے مواد فراہم کرانے پر مامور کیا۔ اس تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ تحقیق و تفتیش کے متعلق طریق کار مقرر ہوا۔ اور شبلی کی زیر نگرانی بعض دوسرے علماء بھی اس کام میں شریک ہوئے۔ وہ سب اعتراضات جو یورپین ناقدوں نے آنحضرت صلعم پر کئے ہیں شبلی کے ذہن میں تھے۔ شبلی نے اعتراضات کے جواب لکھے اور مختلف قسم کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ انہوں نے بتایا۔ کہ اکثر یورپین ناقد غیر معتبر اور ضعیف ماخذوں پر بھروسہ کئے ہوئے غلط نتائج مرتب کر لیتے ہیں۔ اس تصنیف کے سلسلے میں شبلی مالی طور پر اتنے زیر بار ہو گئے کہ کتاب کی تکمیل کی امید نہ رہی۔ علم و ادب کی خدمت کا جذبہ ان میں اتنا قوی تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام آمدنی ادبی مشاغل کی نذر کر دیتے تھے۔ نایاب نسخوں کا قیمتاً فراہم کرنا۔ ایران اور مصر سے کتابیں منگوانا۔ معاونین کو معاوضہ دینا۔ کتابوں کو خوشنما اور دیدہ زیب بنانے میں رقم صرف کرنا یہ سب اخراجات وہ زندگی بھر خندہ پیشانی سے اٹھاتے رہے۔ ہز ہائینس بیگم بھوپال کو جب معلوم ہوا کہ مولوی شبلی سیرۃ النبوی کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے تمام اخراجات کی کفالت کا ذمہ لے لیا۔ چنانچہ پوری یکسوئی اور جوش و خروش سے یہ کام شروع ہو گیا اور کئی برس تک جاری رہا۔ پہلی

جلد کے مکمل ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی شبلی وفات پا گئے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں ایک بار آور اور مفید زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اور ان کے تمام ادبی منصوبے ادھورے رہ گئے۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ان کے لائق شاگرد اور معاون مولینا سلیمان ندوی نے اس کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد دوسری جلد شائع ہوئی۔ اور اب حال ہی میں تیسری جلد کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کو مجموعی طور پر کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ چونکہ یہ عوام کے مذاق کے مطابق نہیں لکھی گئی۔ اس لئے بعض حلقوں میں اس کا سنجیدہ اور عالمانہ طرزِ بیان پسند نہیں کیا جاتا۔ وہ لوگ جو اس کتاب کو علمی تحقیق و تدوین اور تاریخی صحت کے سبب پسند کرتے ہیں۔ کتاب کے ان حصوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ جن کی خوبی محض دلکش طرزِ ادا اور حسنِ بیان ہے۔ لیکن انصاف پسند نقادوں کی رائے میں مولینا شبلی اپنی زندگی کی اس آخری تصنیف سے اردو دان طبقہ کو ہمیشہ کے لئے زیر بارِ احسان کر گئے ہیں۔ نہ صرف انہوں نے اردو کے ادبی سرمایہ میں ایک بیش بہا عطیہ کا اضافہ کیا ہے بلکہ مذہب اسلام کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔

مولینا شبلی کی ایک اور شہرۂ آفاق تصنیف شعر العجم ہے۔ یہ کتاب ادبیاتِ ایران کی تاریخ ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد فیض عام پریس علی گڑھ سے سنہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ اس جلد میں عباس مروزی سے لیکر نظامی تک مختلف شعراء کا تذکرہ درج ہے۔ اس کے علاوہ شاہنامہ کے مصنف فردوسی کا تذکرہ بھی ہے۔ اس کے بعد تین جلدیں اور شائع ہوئیں۔ جنہیں ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل ہوئی۔ انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی نے ہر سال کسی دیسی زبان کی بہترین تصنیف پر پندرہ سو روپیہ کا انعام دینا منظور کیا تھا۔ یہ انعام مولینا شبلی کی شعر العجم کے صلہ میں دیا گیا۔ شعر العجم کی اشاعت سے پہلے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران شائع ہو چکی تھی۔ یہ کتاب مولینا شبلی کی نظر سے گذری تھی اور انہوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر براؤن کی کاوش اور تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے مختلف شعرا کے متعلق براؤن کے آرا سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ غالباً شبلی کو اپنے علم و فضل پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس لئے انہوں نے پروفیسر براؤن سے اختلافات ظاہر کرتے ہوئے انتہا پسندی اور قطعیت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک نوجوان محقق پروفیسر محمود خان شیرانی نے بڑی شد و مد سے براؤن کی تائید کی ہے۔ ان کا ایک مضمون "اردو" میں شائع ہوا ہے۔ جو حیدرآباد دکن کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ شعر العجم کی معلومات اور خاص طور پر فردوسی کے متعلق بیانات غیر معتبر ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں پروفیسر براؤن کے اخذ کردہ نتائج زیادہ صائب اور قرینِ قیاس ہیں۔ یہاں پر شعر العجم اور براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران کا موازنہ مقصود نہیں۔ یہ بات کیا کم باعثِ فخر ہے کہ ایک ہندوستانی عالم اردو زبان میں ایک ایسی تنقیدی کتاب لکھے جو مغربی محققین کی لکھی ہوئی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشہور یورپین عالم نے مولوی شبلی کی کتاب کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ کہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایک شخص کیونکر اتنی پُر از معلومات کتاب لکھ سکتا ہے۔ جبکہ اُسے وہ تمام سہولتیں

میسّر نہیں جو یورپ کی تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کو آسانی سے مہیا ہو سکتی ہیں۔ اور اس کا ذریعہ اظہار محض ایک غیر ترقی یافتہ ہندوستانی زبان ہے۔ صرف اسی نقطہ نظر سے میں شبلی کی شعر العجم کو ایک معرکۃ الآرا کتاب سمجھتا ہوں اور تمام نقائص کے باوجود جن کا پروفیسر محمود شیرانی نے حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب نے مستقبل میں اسی نوعیت کی تصانیف کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ خاص طور پر اردو کی ایک جدید تاریخ ادب کے لئے شعر العجم مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔

شبلی کے تحقیقی کارناموں میں علم الکلام کی نشو ونما کی تاریخ قابل ذکر ہے۔ علم الکلام کا مقصد مذہبی عقائد کے عقلی جواز پیش کرنا تھا۔ جن کی مدد سے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے شکوک و شبہات رفع کئے جائیں اور غیر مسلموں کے مخالفانہ اعتراضات کا جواب دیا جائے علم الکلام کے عنوان سے شبلی نے ایک پُر از معلومات کتاب لکھی ہے۔ جو بارہا چھپ چکی ہے۔ مختصر مضامین رسائل شبلی کے عنوان سے ایک مجموعہ میں چھپ چکے ہیں۔ ان سب مضامین کا ذکر بے سود ہوگا لیکن ان میں سے دو ایک ایسے ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک ۲۷ صفحہ کا کتابچہ ہے جو سکندریہ کے قدیم کتب خانہ کے متعلق ہے۔ مولینا نے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ مصر کے مسلمان فاتحوں نے سکندریہ کے قدیم کتب خانے کو جلا ڈالا تھا۔ اپنے بیان کے ثبوت میں جرمن۔ فرنچ اور انگریز مصنفوں کے حوالے دے کر انہوں نے ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ان کا ایک مضمون شاہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق ہے۔ اس میں انہوں نے تاریخ کے مسلّمہ حقائق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب کے مذہبی تعصّب اور جانبداری کے الزامات سراسر غلط اور بے جا ہیں۔

شبلی کے نثری کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں موازنۂ انیس و دبیر کو نہیں بھولنا چاہیئے یہ کتاب مصنّف کی تنقیدی صلاحیتوں کی شاہد ہے۔ مغربی ادب کے تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے دو لکھنوی شعرا کے کلام کے محاسن و معیوب کا باہمی موازنہ کیا ہے۔ یہ دونوں شاعر فن مرثیہ گوئی کے امام تھے ہمعصر ہونے کی حیثیت سے باہمی رقابت لازمی تھی۔ اسلوب فن میں دونوں کمال رکھتے تھے اور سر مجلس اپنے مراثی پڑھا کرتے تھے۔ دونوں کے مداحوں کے فرقے الگ الگ تھے۔ ان ادبی فرقوں کا اختلاف ایک مذہبی تنازعہ کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ دبیر کے مدّاح اپنے آپ کو دبیری کہتے تھے۔ اور انیس کے حواری انیسی کہلائے جاتے تھے۔ مولوی شبلی نے انیس کے حق میں فیصلہ صادر کیا ہے اور اپنے فیصلہ کے جواز میں دلائل پیش کی ہیں۔ جو انیس و دبیر کے کلام کے حوالوں پر مبنی ہیں، یہ کتاب مفید عام پریس آگرہ سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

تاریخ ہائے وفات

شیخ عبدالقادر مرحوم

مثنوی غلام مصطفیٰ تبسم

بادِ مغفورِ ایزدِ وہاب

۱۳۶۹ھ

غمِ شیخ

۱۹۵۰ء

یوسف ظفر

شیخ عبدالقادر کی یاد میں

خونابہ فشاں ہے پھر دلِ زار — پھر ٹوٹ پڑا ہے غم کا کہسار
وہ درد اٹھا ہے دل میں جس کو — یارائے بیاں نہ تابِ اظہار
احساس کی رہبری کرے کون — الفاظ سے چھوٹتا ہے انکار
آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو — سینے پہ برس رہے ہیں اشعار
ہر ایک نظر بنی ہے نشتہ — ہر سانس کھنچی ہوئی ہے تلوار
کیسے کہوں عالِ بے زبانی — شعلوں میں بجھی ہوئی ہے گفتار
کہہ دوں تو بھڑک اٹھیں دو عالم — سہہ لوں تو حیات خود ہو بیزار

ہے جائے ادب کہ سب ہیں خاموش
یارائے ادب کے لب ہیں خاموش

خاموش نہ رہ سکا دلِ زار — چھڑنے لگی کس کی؟ اس کی گفتار
یادوں کا نزول ہو رہا ہے — آنکھوں میں ہے اک جہانِ سرشار
اُردو کو زباں مل رہی ہے — مخزن کا طلوع ہے گہر بار
ہے مرکزِ ملک شیخِ مخزن — یا مخزنِ علم و حسنِ کردار
پنجاب کا دل ہے شیخِ مخزن — اور شیخ کا دل ہے قلبِ بیدار
اقبال، ہمایوں، حالی، نیرنگ — اس قلب کے دام میں گرفتار
ہر بات سے پھول جھڑ رہے ہیں — ہر پھول بہارِ تازہ بردار

یہ پھول مہک رہے ہیں لیکن
غارت ہوئے وہ بہار کے دن

دیکھو اے دلِ زار، اے دلِ زار! — خاموش ہے آج ادب کا معمار
رونے کا ہے اور بھی زمانہ — پھر ہو نہ سکے گا اس کا دیدار

نازاں ہیں کہ ہوں کفن سے محجوب   لے دامن دل میں لے یہ انوار
مٹی میں مِلے نہ یہ گہر دیکھ   سینے میں چھپا یہ حسن سرشار
دے رُوح کو دعوتِ زیارت   دے آنکھ کو فرصتِ نگہدار
ہونٹوں پہ گمانِ گفتگو ہے   گالوں پہ تمازتِ فسوں کار
داڑھی پہ ضیائے مہر و اخلاص   ماتھے پہ شگفتہ رنگِ کردار

چہرے پہ فروغِ حسنِ ذاتی
آنکھوں میں جہاں کی بے ثباتی

آنکھوں سے نہاں ہوا دلِ زار   وہ جوہرِ ذات، کا پرستار
وہ مایۂ ناز و فخرِ اردو   وہ چرخِ ادب کا نورِ سیّار
وہ معدنِ گوہرِ معانی   وہ پیکرِ خلق و علم و ایثار
تحریر کا حرف، موجِ طوفاں   گفتار کی لہر، بحرِ ذخار
اسلوب میں دلکشا و رنگیں   انداز میں سادہ اور پُرکار
الفاظ شرافتوں کے پتلے   اظہار لطافتوں کے انبار
ہر بات میں نرم نرم شوخی   ہر شوخی مگر کلیدِ اسرار

وہ نکتہ وری وہ نکتہ دانی
افسوس! کہ بن گئی کہانی

ناپید ہوا ہے اے دلِ زار   وہ سُلجھا ہوا طریقِ اظہار
دُنیا میں کہاں رہا ہے کوئی   اب اُس کا مثیل، اُس سا غمخوار
وہ دوست، وہ سرپرست و ہمدرد   رخصت ہوا ہم سے آخرکار
اب کس سے ادب کی داد چاہیں   اب کس کو سنائیں اپنے اشعار
اب اُس کی عنایتوں کا غم ہے   اب اُس کی نوازشوں کا اقرار
اب اُس کا سخن سخن کی جاں ہے   اب جان کے ساتھ اُس کے افکار
اب اُس کی نگاہ کی طلب ہے   بیٹھے ہیں گہر لئے گہربار

وہ جانِ بہار کیا گیا ہے
ہر سمت اندھیرا چھا گیا ہے

نواب جعفر عباس

مزارِ عبد القادر قصرِ فردوس

۱۳۶۹ھ

رفتِ آں ذاتِ گرانقدر ز عالم ہیہات | کہ ز انفاسِ خوشش بود سکونِ خاطر
فاضلِ عصر و ادیبِ ہمہ دانِ دوراں | واقف و شیفتۂ جملہ فنونِ نادر
دلِ بیدار کہ دانائے رموزِ باطن | طبعِ ہشیار کہ سرمست علومِ ظاہر
نثر تشریفِ نوی یافت ز فیضِ کلکش | بہ نہانخانۂ جاں راہنمائے شاعر
شہرۂ خاص بدنیائے وکالت میداشت | شد حجی از شرفِ حسنِ قبولش فاخر
گاہ در مجلسِ آئین بہ صدارت فائز | گاہ اورنگِ وزارت بقدومش حاضر
گہ پئے نائبِ سلطان مشیرِ اعلیٰ | گاہ در محفلِ اقوام رفیقِ شاطر
گاہ رکنے بوز ارتگہ ہندی بفرنگ | گاہ در منزلِ اعیان واکابر آمر
ز خطاباتِ مشرف بمناصب ممتاز | پایۂ خویش رسانید بہ اوجِ آخر
محرمِ رازِ جہاں واقفِ ادیان و ملل | رمز آگاہِ حکومت ز سیاست ماہر
یادگارے ز مشاہیرِ سلف بود بدہر | فردِ بیمثل و یگانہ بزبانِ حاضر
ہستیش مجمعِ اوصاف و صفاتِ محمود | بہرۂ داشت ز اخلاقِ گرامی وافر

دستگیرِ همه احباب به آئینِ حسن — پئے مخلوقِ خداوند معین و ناصر
تابشِ نیرِ اقبال هویدا ز رخش — عظمت و سطوتِ شاهی ز جبینش ظاهر
عاشقِ سیدِ لولاک رسولِ عربی — حنفی مسلک و پروانۂ آلِ طاهر
حیف آں قصرِ فلک بوس که از پرتوِ او — بهرِ اربابِ نظر بود حریمِ نادر
بود از دیر به آں دردِ علالت محزوں — که بجز مرگ نه شد کس به علاجش قادر
بانوئے او بغمش زخم به دل خوں بجگر — پسرانِ اشک بر خسار و پریشاں خاطر
جعفرِ غمزده ایں قطعۂ تاریخ نوشت — حیف ماند است به اظهارِ عقیدت قاصر
چوں کسے سالِ وفاتش ز مزارش جوید — از سنِ هجرتِ پیغمبرِ دورِ آخر

گو ملائک ز درِ خلد به پایش دادند
که به گلزارِ جناں باش سرِ عبد القادر

سنه ۱۳۶۹ھ

تاریخ ہائے وفات

(راحل ہوشیارپوری)

چراغِ محفلِ ادب

۱۳۶۹ھ

آہ عبدالقادر مدیرِ مخزن

۱۳۶۹ھ

حفیظ ہوشیارپوری

آفتابِ انجمن شیخ عبدالقادر

۱۹ ۶ ۵۰

۱

انجمن جس کے دم سے روشن تھی، بجھ گئی آج اس کی شمعِ حیات
زندگی اس کی انجمن کا چراغ انجمن کا چراغ سالِ وفات
۱۳ ھ ۶۹

۲

اُسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں وہ تھا قلب و دماغِ شہرِ لاہور
ہُوا بے تاج "فرقِ انجمن" جب کہا میں نے "چراغِ شہرِ لاہور"
۱۹۵۱ - ۱ - ۱۹۵۰

۳

آنکہ شمعِ انجمن افروز بود رونق افروزِ جہاں امروز نیست
با دلِ زار از پئے سالش حفیظ گفت "شمعِ انجمن افروز نیست"
۱۹۶۸ + ۱ = ۱۳۶۹ ھ

۱

نَوَّرَ اللّٰہُ تُربَتَھُم

وَاَدخَلنَاھُم بِجَنَّاتٍ وَّنَعِیمٍ

۶۹ ھ ۱۳

وردا سر عبد القادر کرد از دار فنا رحلت
اُردو را از بدو شباب کردہ تا آخر خدمت
خامۂ او ابرِ دُربار نامۂ او بحرِ ندرت
یارب بر قبرش بفرست لکّہ از ابرِ رحمت
اطہر سال نقلش گفت
رفتہ ادیبے در جنّت

دیگر

اے وا سر عبد القادر مُرد شد تیرہ بزمِ شعر و سخن
آں کہنہ ادیب اُردو بود آں مہنہ نوا سنجِ مخزن
دُرباری طبعش ابرِ نیساں گل ریزی فکرش صحنِ گلشن
خود موسیٰ طورِ اوجِ ادب شمعِ سخنش برقِ ایمن
اطہر سال نقلش گفتہ
آمرز یلے آں را قُدالمن

۶۹ ھ ۱۳

(مولانا) اطہر ہاپڑی از راولپنڈی

تری خدمات سے واقف ہیں زمانے والے خوشہ چیں جتنے تھے سید کے بنے آپ ہو الے

خراجِ عقیدت

سارا پنجاب ہے نازاں تری ہستی پہ آج
تجھ سے حاصل ہوا اُردو کو کمالِ معراج
تیری تیماری کا شیدا ہے زمانہ سارا
آج تو اُردو و ہندی کا ہے شاہِ بے تاج

گلیڈ اسٹون زماں تجھ کو کہیں گر ہے بجا
تو نمونہ ہے ہمارے لئے سرسیّد کا

ترے احسان سے اُردو کا وقار اور بڑھا
رشکِ طوسی ہے تو اور ثانیِ ابن سینا
تیری تحریک سے اقبال ہوا یا اقبال
تجھ کو اب کہتی ہے اردو کا مسیحا دنیا

عسکرِ اُردو کا جانباز سپاہی تو ہے۔
" مذہبِ اُردو " کا پیغمبر و داعی تو ہے

تیری تحریروں سے جذبات میں طوفان تھا بپا
آب زر و زر سے ہوئی قوم میں ہمت پیدا

تیرے ہی دم سے زمینِ سخن آباد ہوئی
سکۂ مخزن کا ہر اک شہر میں ٹکسالی تھا

تیرے پنجاب کے میخواروں میں اک ہم بھی ہیں —
تیرے مخزن کے پرستاروں میں اک ہم بھی ہیں —

سرپرستی ہے تری علم و ہنر میں مشہور
حسنِ اخلاق کے چرچے ہیں ترے دور دراز دور
شمع ہے علم کی تو۔ ہم ترے پروانے ہیں،
ذات پر تیری ہمیں فخر ہے "داتائے قصور"

تیری خدمات سے واقف ہیں زمانے والے
خوشہ چین ہونگے ترے بعد کے آنے والے

تجھ سے حاصل ہے ہمیں ایک طرح کی قوت
زندگی تیری ہمارے لئے حق کی رحمت
تجھ سے امیدیں ابھی ملک کی وابستہ ہیں
ہے ضرورت کہ ابھی قوم لے تجھ سے خدمت

یوں ہی تو صاحبِ اجلال و جواں سال رہے
عہدِ ماضی سے درخشندہ ترا حال رہے

۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء (مولوی سید احمد اللہ قادری)

عبدالعزیز خالد

ایک نوجوان کا

خراجِ عقیدت

چمن میں نوحہ کناں ہیں نوا گرانِ چمن — بچھڑ گیا ہے مگر میرِ کاروانِ چمن
کہاں وہ پہلی سی شادابِ نزہت افشانی — کہ پائمالِ خزاں ہے بہارِ سرو و سمن
حیات و مرگ کا پیچاک حلقہ در حلقہ — فراغ عرصۂ ہستی، فروغِ رنج و محن
سراب ہے یہ جہاں بے ثبات ہے دنیا — فریبِ رنگ ہے نظارہ سازیٔ گلشن
وہ بذلہ سنج و شگفتہ دماغ و حق آگاہ — متاعِ نازشِ پنجاب و افتخارِ وطن
وہ جس کے ہاتھوں نے شعر و ادب کو سینچا تھا — وہ جس نے شاہدِ اردو کا بھر دیا دامن
وہ جس کو شاعرِ مشرق سے ربطِ محکم تھا — وہ رندِ بادۂ دوشیں حریفِ بزمِ کہن
وہ یادگارِ کمالاتِ ماضیٔ مرحوم — وہ جس کے دم سے پرانے چراغ تھے روشن
قضا کے دستِ ستم نے اسے بھی چھین لیا — فغاں کہ برقِ جہندہ سے جل گیا خرمن
کہاں سے آئیگا ایسا مبصّر و ناصر — کہاں پہ ڈھونڈینگے ایسا ادا شناسِ سخن

مزارِ شیخ پہ ابرِ کرم کی بارش ہو
فضائے عرش سے انوار کی تراوش ہو

فلک پیما

شیخ عبدالقادر

مضامین فلک پیما کے صفحہ ۸ سے چند سطریں نقل کرتا ہوں۔ مضمون کا عنوان تھا۔

"کبھی تھے"

"زندگی کی طغیانیوں نے ان دو چار کو ایک ناؤ میں ہمسفر نہ بننے دیا پورا نہ ہونے دیا۔
ان میں ایک کچھ بڑھ گیا تھا۔ مگر تیرِ حسد کا نشانہ بنا۔ اب پھر ابھرنے کو ہے اور شہرت
کا نقیب منتظر ہے کہ اس کے حق میں غلطیئنا کا بری کا اعلان کرے"

شہرت کا اشارہ شیخ عبدالقادر کی طرف تھا۔ اور مضمون اس وقت لکھا تھا جب ہائی کورٹ سے انہیں غلط طور پر سبکدوش کیا گیا۔ شیخ عبدالقادر ساری عمر رسمی خراجِ تحسین سے بہت حد تک بے نیاز رہے۔ اور اس بے نیازی میں تصنع کا پہلو ہرگز نہ تھا۔ ان کے خلاقی شعار میں عظمت محض کھلونا اور خلوص "عمل ایمان تھے" جس کا ثبوت یہ تھا کہ مرحوم نے اپنی زبان سے ایک تذکرہ شاید ہی دہرایا ہو۔

انجمن حمایتِ اسلام کے اسلامیہ کالج میں ایف اے کلاس آٹھ نو سال سے چل رہی تھی۔ مگر بی اے کلاس نہ کھلتی تھی۔ کالج اس وقت شیرانوالہ دروازہ کی عمارت میں تھا اور مولوی حاکم علی صاحب پرنسپل تھے۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں میرے ایم اے پاس کرنے پر ارشاد کیا۔ کہ دو گھنٹے چالیس روپیہ ماہوار پر تھرڈ ایئر کلاس کو پڑھا دیا کرو۔ خود پچاس روپیہ ماہوار پر وائس پرنسپل ہوئے اور خانصاحب شیخ عبدالعزیز مرحوم نائب مدیر "آبزرور" کو بھی منا لیا کہ وہ بھی چالیس روپیہ ماہوار پر دو گھنٹے پڑھائیں۔ اس تھرڈ ایئر کلاس کے پہلے طالب علموں میں جناب مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج تھے۔ و شیخ صاحب ہمت کرتے نہ اور برسوں بی اے کلاس کھلتی، ہونہار مسلم طلباء جو مہنگی تعلیم کے کفیل نہ ہو سکتے تھے محروم رہتے۔ بظاہر بات قابلِ ذکر نہیں۔ مگر شیخ صاحب نے اعلیٰ تعلیم کی دھنسی ہوئی گاڑی کو خلوص کے کندھے سے اٹھا لیا ؛

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاب میں کامیابی زیادہ تر شیخ صاحب کی وجہ سے تھی۔ طالب علموں پر ان کا جادو چلتا تھا اور جس کا حوصلہ وہ بڑھاتے اس کے لئے ناممکن تھا کہ شیخ صاحب کسی کام کو کہیں اور کام نہ ہو بظاہر تو انجمن حمایتِ اسلام کا سالانہ جلسہ اور کانفرنس کا اجلاس قومی میلہ کی صورت رکھتے تھے۔ مگر یہ میلے نہ ہوتے تو قوم مزید آٹھ دس سال فتوٰی فروشوں کی لونڈی بنی رہتی۔ انجمن اور کانفرنس کے مقابل لاہور کی مشہور انجمن نعمانیہ تھی جس کا تلفظ بعض عربی ندہ انگریز ایسی طرح کرتے "نوایلا"

ستائیؔ صفحہ) دہلی کی کرزن دربار والی کانفرنس، لکھنؤ کی ۱۹۰۳ء والی کانفرنس اور پھر علیگڈھ کی ۱۹۰۵ء والی کانفرنس میں ہم سب اکٹھے تھے۔ لکھنؤ میں علامہ اقبال مرحوم بھی ہمراہ تھے اور وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے پہلی دفعہ کی شناسائی ہوئی۔ وہ اس وقت ریاست بڑودہ میں ملازم تھے۔ ۱۹۰۷ء والی کراچی کانفرنس میں شیخ صاحب موجود نہ تھے۔ یہ وہ دل چسپ کانفرنس تھی جس میں لاہور کی دو سالہ دو ٹیمیں، ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونک کر کشتی گیری میں مصروف تھیں۔ یعنی ایجوکیشنل کانفرنس سیاسی منہم آزماؤں کے لئے میدان خالی کرنے والی تھی۔ ۱۹۱۱ء تک انجمن حمایت اسلام کے ساتھ جلسے پرانی طرح چلتے رہے۔ اور شیخ کے پاۓ طریقت کا رنگ نہ بدلا۔ یعنی تعلیم کے علمبردار بنے رہے۔ مگر جنگ طرابلس کے متعلق چندہ فراہم کرنے والوں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم تعلیم سے قدرے بے پروا ہو کر سیاسی دھندوں میں مبتلا ہو گئی۔ شیخ صاحب کو سیاسی دل چسپی ضرور تھی، مگر طرابلس، جنگ بلقان اور پھر جنگِ عظیم کے ساتھ تحریک خلافت نے قومی رجحان کا رخ بدل دیا۔ سیاست نے پر پرزے تیز کئے اور نئے لیڈر نئے نعروں کی ہوائیاں اڑاتے قوم میں برسرکار ہوئے۔ انگریز کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ مسٹر ۵۰۰۲۵۵ کے معاون پیدا کرے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کے فسادات کے بعد میاں فضل حسین مرحوم پنجاب میں وزیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہند میں کونسلر ہوئے۔ انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق شیخ عبدالقادر سے پنجاب کونسل، سیکرٹری آف سٹیٹ کی کونسل اور جنوبی افریقہ میں کام لیا۔ شیخ صاحب مجسم شرافت، سیاست والوں کا کہنا کرتے رہے۔ مگر مجھ سے ایک دفعہ یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے کہ کھیل ہو رہا ہے۔

قومی سیاست گذشتہ چالیس سال میں کئی روپ بھر چکی ہے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک انگریز کو خلافت سے دھمکایا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک انگریز نے خطاب یافتگان کو آلہ کار بنایا۔ ۱۹۲۸ء کے خاتمہ پر نہرو رپورٹ نے مسلمان کو ہند کا حاشیہ نشین در صف نعلین کرنے کا فیصلہ کر دیا اور قوم مجبور ہو گئی کہ خطاب کو ٹھکرانے والے محمد علی جناح کی قیادت کی طرف جھکے۔ ۱۹۴۳ء تک خطاب والوں نے سخت مقابلہ کیا۔ مگر عبدالقادر مرحوم نے اپنے ذاتی شرافت کو خطاب سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ وہ سیاسی شورش سے بچتے ہوئے صلح کل کے مسلک پر قائم رہے۔ اُن کی دل چسپی اردو ادب کے ساتھ جیسی مخزن کے اجراء کے وقت تھی ویسی آخر دم تک رہی۔

شعر کا چسکہ ایسا تھا کہ پھڑکتا ہوا شعر سنتے تو انہیں گویا خزانہ مل جاتا۔ ابتداء میں ارشد گورگانی سے مرحوم نے سفارش کر کے شعر کہلوائے، قافیہ سمجھا دیتے اور شعر کے انتظار میں بے تاب رہتے۔ جب ارشد مرحوم نے یہ مصرع چسپاں کیا۔ تو شیخ صاحب ہفتوں اس کا لطف اُٹھاتے رہے۔

ع "اب تو وہ بُت ہے کسی دن کو خدا ہو جائے گا"

وہ دُنیا بدل گئی۔ اب مغرب میں اور مغرب کی تقلید میں مشرق میں ایسے شاعر بھی ہیں جن کے نزدیک شعر میں کیا ساری نظم میں معانی پریشانی آہو۔:

شیخ عبدالقادر کے جاننے والوں پر ہمیشہ سے یہ روشن رہا۔ کہ وہ لیڈری کے حریص نہ تھے۔ ورنہ اس قدر کند ذہن نہ تھے کہ یہ نہ سمجھے ہوں کہ لیڈری کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ انسان کوئی بڑا چندہ جمع کر کے اخباروں کے ذریعہ نام آور بنے۔ انہیں اس پرانے مقولہ سے کہ

زر فروع کن تا میر شوی ۔۔۔۔ چوں میر شوی زر بسیار

بے انتہا نفرت تھی۔ انہوں نے اس مقولہ کے ماننے والوں کو بڑھتے دیکھا اور نوکِ پاپوش سے اس زر دوزی عروج کو ٹھکرا دیا۔

جن سے دِل ملتا اُن سے مِل کر خوش ہوتے اور خوش رہتے۔ شخصی زندگی کا بہاؤ ذاتی آرزوؤں کی نہروں میں کم و بیش ہی چلتا ہے۔ جس حلقہ میں شیخ عبدالقادر کی دِلی عزت تھی اس حلقہ کا اور شیخ صاحب مرحوم کا کم و بیش مسلک یہ تھا سے

بکیشِ اہلِ وفا مدعا نگنجد ۔۔۔۔ امید در دِل و در سر ہوا نگنجد

ڈاکٹر تاثیر

ایک مکمل شخصیت

شیخ عبدالقادر کی وفات ایک فردِ واحد کی وفات نہیں، یہ ایک پورے اور ایک مکمل طرزِ زندگی کے گزر جانے کا نشان ہے۔ شیخ صاحب کوئی بہت بڑے ادیب، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے سیاست دان یا لیڈر نہ تھے، مگر ان کا تعلق ادب، تنقید، سیاست، اور لیڈری سے بہت گہرا تھا:

ایڈیٹر، وکیل، جج، وزیر، وائسرائے کی کونسل کے ممبر، سیکرٹری آف سٹیٹ کے معاون، مسلم لیگ کے صدر:

انہوں نے ہر نمایاں کام میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ لیکن کسی ایک مقام میں محدود نہ ہوئے۔

اُن کی شخصی اور پبلک زندگی میں طرح طرح کے نشیب و فراز آئے لیکن ان کی شخصیت کی سطح ہموار رہی۔ انہوں نے میخانۂ حیات کے گوناگوں جام چکھے لیکن کبھی بدمست نہ ہوئے۔ میں نے اپنی عمر میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کا ایسا واضح کردار ہو۔ شیخ صاحب ایک مکمل شخصیت کے مالک تھے۔

آپ نے کتنے ایسے جج یا وزیر دیکھے ہیں جنہیں علم و ادب کا اتنا ذوق ہو؟ آپ نے کتنے ایسے ادیب دیکھے ہیں جنہیں امورِ عامہ میں ایسی دسترس حاصل ہو؟ آپ نے کتنے ایسے اہم لوگ دیکھے ہیں جن سے اتنے کم لوگ برہم ہوئے ہوں؟ شیخ عبدالقادر ہمہ گیر قسم کے شخص تھے۔

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس میں اس قسم کی مکمل ہمہ گیر شخصیتوں کے نشوونما کی گنجائش کم ہے۔ اقدار میں کچھ اس طرح کا الجھاؤ ہے، حالات میں کچھ اس طرح کا پیچ ہے کہ مکمل شخصیت اور ہمہ گیری کے حصول کے اسباب مفقود ہو رہے ہیں۔ قدم قدم پہ دوراہے ہیں، روش روش پہ موڑ ہیں، راہرو دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں بیک وقت اتنے نقارخانے شور مچا رہے ہیں کہ قمری اور زاغ کی آواز میں فرق کرنا محال ہوتا جا رہا ہے۔

میں نے شیخ صاحب کو خلوت و جلوت میں بارہا دیکھا، گھر میں دیکھا، دفتر میں دیکھا، صدارت کرتے دیکھا، چپڑاسی سے گفتگو کرتے دیکھا، دیس میں دیکھا، پردیس میں دیکھا، انہیں جس حالت میں دیکھا ایک ہی طرح کا پایا۔

چلا کے بات نہیں کرتے تھے مگر ہر جگہ سنے جاتے تھے، اکڑ فوں نہیں تھی مگر رعب قائم تھا۔ شفقت کرتے تھے اور عقیدت کا مرکز تھے۔ اُن کی محفل ایک دربارِ عام تھا۔ یہاں سے ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق متمتع ہوتا تھا۔

اُن کی گفتگو کا ایک مخصوص لہجہ تھا۔ اُن کی زندگی کی ایک خاص روش تھی۔ جیسے ٹھہری ہوئی جھیل کی سطح پہ نسیم

ہچکا ہی پریشاں ہو۔ بہت آندھیاں آئیں، بہت طوفان اُٹھے۔ مگر ان کا توازن برہم نہ ہوا۔
ان کی موت بھی ایک لہر کی طرح آئی، انھیں دنیوی زندگی سے جاودانی زندگی کے کنارے بہا کر لے گئی۔ یہ حادثہ نہیں واقعہ تھا
میر تقی کا ایک شعر انھیں بہت پسند تھا۔ ان کے حسبِ حال ہے۔ ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے ٭ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

جب ہم دوسری دنیا میں پہنچیں گے تو وہ ہمیں مسکراتے ہوئے ملیں گے۔ جیسے کوئی ایک ہی گھر میں ایک کمرے سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا ہو۔ میں جب لاہور سے لندن گیا تو وہاں وہ اسی طرح ملے تھے۔ اب کیوں نہ اسی طرح ملیں گے۔ اُن کی شخصیت موت سے نہیں بدل سکتی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

طرزِ نشست

اس قوم کی ناداری کی انتہا نہیں جس کے اندر سوجھ بوجھ رکھنے والی شخصیتوں کا قحط ہو۔ اقبال کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کی کمی کے احساس کو تازہ رکھنے کے لئے سر عبدالقادر کی شخصیت ایک سہارا تھی۔ کم سے کم مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ سر عبدالقادر وہ بات سمجھائیں گے۔ جس سے گم کردہ راہوں پہ چلنے والے کارروانوں کی آواز درا کانوں میں گونجنے لگے گی۔ اور وہ منزل نظر آنے لگے گی جو اقبال نے دیکھی تھی اور اقبال چاہتا تھا۔ کہ اس کی قوم بھی اسے دیکھ پائے اور اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے۔ سر عبدالقادر اور سر اقبال کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو کچھ کہے اور کچھ دکھائے اور جس سے ایک طرف قوم کی ناداری اور اس کے ساتھ ہی ساتھ امکانِ ارتقاء درست تعبیر دکھائی دینے لگیں اور کوئی عجب نہیں کہ یہ احساسِ ناداری۔ یہ اعترافِ عیب شائد ان تمام حالات کو جھٹلا دے جن کے سبب حب الوطنی بھی کبھی کبھی ملک اور قوم کے مستقبل سے مایوس ہونے لگتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ میں سر عبدالقادر کو لندن میں ملا تھا۔ اسی طرح سنہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے کہ جب اقبال راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے تو میں لندن میں موجود تھا۔ اور ان سے ملا تھا۔ لندن اور اسی طرح یورپ کے کئی اور شہروں میں مجھے اپنے ہموطنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور سوائے ان دو شخصیتوں کے میں نے اپنے ہر ہموطن کو انگریز اور لندنی پایا۔

سر عبدالقادر کو جب میں لندن میں ملا تو پہلا احساس جو مجھے ان کی ملاقات سے ہوا وہ یہ تھا کہ میں ان سے لاہور میں کسی جانی پہچانی جگہ پر بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔ اور وہ اپنی عادت کے مطابق مختلف شخصیتوں، یادوں اور ملاقاتوں کا ذکر جوشِ مسرت اور پر خلوص الفاظ میں کئے جا رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ وہ زبان بن چکی ہے۔ کل ہی تو اتوار ہے۔ آیئے ہم آپکی ملاقات ان اردو بولنے والوں سے کرائیں جو لندن میں رہ کر بھی اردو بولتے ہیں، اردو لکھتے ہیں۔ اور دعوے کرتے ہیں۔ یہ زبان محض ہندوستان کی زبان نہیں۔ اس کا تسلّط جہاں جاؤ ملتا ہے۔ اس ملاقات میں سب سے زیادہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دلآویزی جو کبھی نہ بھولے گی وہ یہ تھی کہ اس موقعے پر سر عبدالقادر نے وطن کی دوری کے احساس میں طبیعت کی جولانی میں پنجابی کے بھی چٹخارے لیتے تھے ؎

اقبال، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں لندن میں تھے۔ ان کے سامنے ایک پروگرام تھا۔ خاص مصروفیتیں تھیں مگر ان کے کمرے میں جو ایک ہوٹل کا کمرہ تھا۔ پُر جوش۔ پُر وقار آوازیں اس طرح سنائی دیتی تھیں۔ جیسے اقبال لاہور میں میکلوڈ

روڈ کی کوٹھی کے صحن میں بیٹھے۔ جیسے کہ اُن کا معمول تھا۔ جو موضوع سامنے آ جاتا، اُسے اپنا کر اس طرز بیان کی چاشنی سے جو انہیں گویا ودیعت کی گئی تھی اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں پندرہ پندرہ بیس بیس آدمی جمع رہتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کی صورتیں نظر پڑتی تھیں۔ ہر کسی کی نظر ان کے چہرے پر جمی رہتی تھی۔ اقبال ٹھیٹھ پنجابی میں ہی سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ اور حرکات و سکنات کے لحاظ سے ٹھیٹھ پنجابی ہی معلوم ہوتے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ان کے سامنے حقے کی بجائے سگریٹ کی ڈبیا دھری ہوتی تھی۔

لندن کو "ہم محسوس کرنے کے وہ بیش قیمت لمحے پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ ہم ان کی آواز سن نہ سکیں گے۔ مگر جب تک بانگ درا زندہ ہے اقبال اور سر عبدالقادر کیطرح اپنی طرز نشست کی یاد دلاتے رہیں گے۔

سید نذیر نیازی

بیادِ عبدالقادر

میں نے اقبال کا نام پہلے سُنا یا عبدالقادر کا۔ یہ طے کرنا دشوار ہے۔ میرے ذہن میں ان دونوں ہستیوں کی یاد کچھ اس طرح باہم مربوط ہے۔ اقبال کا نام سُنتا تو عبدالقادر کا ذکر آجاتا۔ عبدالقادر کا ذکر آجاتا تو اقبال کی باتیں ہونے لگتیں یہ ناممکن تھا کہ عبدالقادر کے ساتھ مخزن کا ذکر نہ آئے۔ میں اپنے ذہنی ورثے کا جائزہ لیتا ہوں تو اقبال، عبدالقادر مخزن اور اربابِ مخزن ایک ناقابلِ تقسیم رشتے میں اس طرح منسلک پاتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اقبال کے لیے مخزن کی حیثیت ... اور مخزن کے صفحات پر اس محفل کی جھلک نظر آتی ہے جس کی یاد سید احمد شاہ اور ان کے باہمت ساتھیوں سے وابستہ ہے۔ گویا مخزن کی تاریخ ایک پورے دور کی تاریخ ہے اور عبدالقادر اس کی روح رواں یہی وجہ ہے کہ مخزن کی موجودگی تک ... اور اس وقت تک جب اس کی اشاعت ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ اگرچہ ... رسالے ادب اور زبان کی خدمت کے لیے نکلے مگر جو بات مخزن میں تھی کسی میں پیدا نہ ہو سکی۔ ... مخزن تب تک مخزن تھا جب تک اس کی ادارت عبدالقادر کے ہاتھ میں تھی۔ ... وہ اس سے الگ ہوئے ... مخزن کی ساری خصوصیات ... دراصل مخزن ایک شاہراہ تھی جسے عبدالقادر کے دل و دماغ نے اردو زبان و ادب کے لیے نکالا اور جب یہ کارواں اس شاہراہ سے ہٹا تو پھر کسی مرکز پر جمع نہ ہو سکا۔ ... ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ہماری زبان کی ارتقا میں عبدالقادر کا حصہ کچھ کم نہیں۔ لیکن ادب شناسی اور ادب پروری کے اس جوہر کے ساتھ وہ خود بھی نظم و نثر کا نہایت صحیح ذوق رکھتے تھے۔ مخزن کی جلدیں مدیرِ مخزن کے ادارتی شذرات اور مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ ... اور مقدمہ خلافت ان کے سلجھے ہوئے اندازِ تحریر، سلاستِ زبان اور پاکیزگیٔ خیال کا زندہ جاوید نمونہ ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے ذہن میں کوئی اُلجھن ہوتی نہ طبیعت پر کبھی بوجھ۔ بلکہ اس کے قدرت نے انہیں خاص طور سے یہ ملکہ دیا تھا کہ جو بھی خیال ہو ایک فطری ترتیب اور روانی کے ساتھ بلا تکلف ادا کرتے چلے جائیں۔ مخزن کو دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ چمنِ اردو کی آبیاری ... مخزن نے کس محنت اور جانفشانی سے کی۔

میں نے صاحبِ مخزن کو اپنے زمانۂ طالب علمی میں بارہا دیکھا اور جب بھی دیکھا ان کی وجاہت، سلیقہ مندی، وقار، متانت، خوش طبعی اور خوش مزاجی سے بے حد متاثر ہوا۔ ان کی خدمت میں یوں تو حاضر ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جلسوں اور محفلوں میں البتہ ان کی شوخیٔ تقریر اور گرم گفتاری سے ... اٹھانے کا موقع مل جاتا۔ ایک محفل کی یاد آج تک

ذہن میں محفوظ ہے۔ لاہور کے ایک ماہرِ تعلیم ولایت جا رہے تھے۔ تھے بھی ولایت ہی کے رہنے والے ان کو الوداع کہنے کے لئے
ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت شیخ صاحب نے فرمائی۔ رسمی تکلفات۔ سپاسنامے اور تقریریں ہو چکیں تو شیخ صاحب
اُٹھے۔ اوّل مہمان کی رعایت سے چند کلمے انگریزی میں کہے۔ اور پھر اہلِ محفل سے اردو میں خطاب کیا۔ لیکن شیخ صاحب بول
کیا رہے تھے میٹھے میٹھے دل نشین الفاظ تھے جو ایک آہستہ خرام ندی کے خوش آیند نغموں کی طرح لگاتار کانوں میں پہنچ
رہے تھے۔ آخر میں پھر شیخ صاحب نے جب غالب کی بہار آمد و رفت، یار آمد و رفت، بکنار آمد و رفت والی غزل کے
چند اشعار مزے لے لے کر پڑھے تو ساری محفل جھوم اٹھی۔ ایسی ہی محفلیں اور جلسے تھے جن میں ان کی دل کش شخصیت،
پُر لطف گفتگو اور زندہ دلی کا اندازہ ہوا۔ وہ جلسوں اور محفلوں میں کیا آتے — بزم کا رنگ ہی بدل جاتا۔ مشاعروں
اور ادبی اجتماعات کی رونق کچھ انہیں کے دم سے تھی۔ لاہور میں کون نہیں جانتا کہ ادھر شیخ صاحب نے جلسہ گاہ میں قدم
رکھا اور ادھر محفل میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مسرت و شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

لیکن ان محفلوں اور جلسوں میں گویا دُور ہی سے ان کا نیاز حاصل کرنے کے باوجود پہلی مرتبہ جب مجھے ان کی خدمت میں حاضر
ہونے کا موقع ملا تو ان دنوں شیخ صاحب سنٹرل پبلک سروس کمیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے شملے میں مقیم تھے۔ میں
نے شاید ٹیلیفون پر اجازت طلب کی تھی۔ فرمایا تیسرے پہر جب فرصت ہو چلے آؤ۔ چنانچہ اس روز شام سے پہلے
میں نے ان کی بلند و بالا کوٹھی میں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کی تو فوراً ہی اندر بلا لیا۔ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے
خیریت پوچھی۔ میں آداب بجا لایا۔ ان کی اس غیر معمولی نوازش اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن ابھی وہ ہی چار کلمات (بر سبیلِ
تعارف) اپنے متعلق کہنے پایا تھا کہ روک دیا۔ جیسے وہ مجھ کو ہمیشہ سے جانتے تھے۔ اس پر مجھے تعجب ہوا اور آج تک
ہے۔ بہر حال میں جس غرض سے حاضر ہوا تھا۔ بیان کی۔ انہوں نے بڑی توجہ اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ اور پھر دیر تک
اسلامی تہذیب، تمدن، اس وقت کی ہندی۔ اسلامی سیاست اور ادب اردو کے نئے رجحانات پر گفتگو کرتے رہے
کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بڑے مزے کی نشست رہی اور شیخ صاحب کی خوش خلقی اور وسیع القلبی کا نہایت گہرا نقش میرے
دل پہ بیٹھ گیا۔ میں نے اس زمانے میں انگریزی کی ایک مختصر سی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ تیسرے چوتھے روز جب میں
دہلی واپس آیا۔ تو ان کا ایک عنایت نامہ ملا جس میں بعض ضروری مشوروں کے علاوہ از رہِ حوصلہ افزائی اس ترجمے کی تعریف
بھی کی گئی تھی۔

دس گیارہ برس گذر گئے اور پھر شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو وہ انگلستان سے واپس لاہور
تشریف لا چکے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے۔ میرے کرم فرما اور شیخ صاحب کے ایک دیرینہ نیازمند سالہا سال کے
بعد جب ان کی زیارت کے لئے ماڈل ٹاؤن گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ان دنوں شیخ صاحب کو فرصت تھی اس لئے دو ڈھائی گھنٹے
پُر لطف باتوں میں گذر گئے۔ باتیں کیا تھیں، پرانی صحبتوں کی یاد، یارانِ محفل کے تذکرے، زمانے کی تبدیلی، حوادث و انقلابات،

جنگ اور پھر وہ ہماری شاعری کی زلف گرہ گیر کی طرح ایک الجھا ہوا افسانہ یعنی اسلام اور مسلمان۔ اسلام کیا ہے۔ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئیے۔ اسلامی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم کیا تھے۔ کیا بن رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں شیخ صاحب نے ایک مزے کا واقعہ یہ بیان کیا کہ انگلستان میں ان کے انگریز احباب جب کبھی اپنی ذاتی گفتگوؤں میں اسلام کے متعلق اظہار خیال کرتے تو ان کا مدعا تعریف و ستائش ہی ہوتا لیکن ایک مرتبہ ان کے ایک دوست یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلام کے اصول اور ارکان یوں تو خیر بہت ٹھیک اور عقل کے مطابق ہیں۔ مگر روزے کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ صاحب کہنے لگے۔ میں نے ان کی اس بات کو سنا تو کہا۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آ سکے۔ دیکھئے آپکے یہاں چھٹی کا خیال عقیدہ تک پہنچا اور نتیجہ یہ کہ اب آپ بالالتزام ہر اتوار کو چھٹی مناتے ہیں۔ چھٹی اچھی چیز ہے۔ انسان کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپکی معاشرت میں چھٹی کا مطالبہ کچھ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ آپ کو چھٹی کی ضرورت ہے۔ آپ کے نوکروں اور خدمت گذاروں کو چھٹی کی ضرورت ہے، مزدور چھٹی مانگتے ہیں۔ کلرک چھٹی چھٹی چلاتے ہیں۔ دفتروں میں چھٹی ہے۔ کارخانوں میں چھٹی۔ غرضیکہ یہ چھٹی اور وہ چھٹی، لیکن کبھی آپ کو اس کا بھی خیال آیا کہ یہ غریب پیٹ بھی جس کو چھٹی کے معنے علم کے دنوں سے بھی سوا زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ تھوڑے بہت آرام کا مستحق ہے۔ روزہ اصل میں پیٹ کی چھٹی ہے۔ آپ اپنے اس خادم کو ذرا سی چھٹی دے کر اندازہ تو کیجئے۔ یہ کس خوبی سے اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ اس پر شیخ صاحب کے ایک انگریز دوست نے قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگا بات تو ٹھیک ہے۔ بات واقعی ٹھیک تھی۔ شیخ صاحب بھی ہنس ہنس کر بیان کر رہے تھے۔ ہم بھی ہنسنے لگے۔

پاکستان بنا اور لاہور کے بچھڑے ہوئے لاہور واپس آ گئے۔ لہٰذا پچھلے دو تین سالوں میں شیخ صاحب سے آئے دن ملاقات کی کوئی نہ کوئی تقریب پیدا ہو جاتی۔ مثلاً کوئی جلسہ یا مشاعرہ۔ یوم اقبال کے اجتماعات یا ایسی ہی کوئی ادبی محفل۔ پھر اس زمانے میں شیخ صاحب کو بوجہ پیرانہ سالی اگرچہ نسبتاً آرام کی ضرورت تھی مگر اس کے باوجود ہر صحبت میں پابندی سے تشریف لاتے اور آخر تک شریک رہتے۔ ان کی خوش طبعی اور خوش مزاجی کا اب بھی وہی عالم تھا۔ معلوم ہوتا ہے اپنی جسمانی یا ذہنی تھکن کا انہیں زیادہ خیال نہیں تھا۔ وہ بوڑھوں کے ساتھ بوڑھوں اور جوانوں کے ساتھ جوانوں کی طرح پیش آتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو نوجوانوں کو ان کی زندہ دلی پر رشک آتا تھا ۱۹۴۸ء میں یوم اقبال کی تقریب پر انہیں کوئی ڈیڑھ یا دو گھنٹے ریڈیو سٹیشن پر ٹھہرنا پڑا۔ یہ محفل شاید گیارہ بجے ختم ہوئی، اور باوجودیکہ شیخ صاحب کی عمر کے کسی اور بزرگ کے لئے اتنی مدت تک جاگتے رہنا شاید ناگوار ہوتا۔ وہ بڑے اطمینان اور دل جمعی سے بیٹھے اپنے دوستوں اور نیازمندوں سے گفتگو کرتے رہے پھر اسی سال اور ۱۹۴۹ء کے آغاز میں انہوں نے دو ایک مرتبہ اکیڈیمی کے مشاعروں کی صدارت بھی فرمائی۔ پچھلے چند مہینوں سے البتہ ان کا مزاج کچھ ناساز رہنے لگا تھا۔ اور اس لئے بعض ایسی صحبتیں جن میں شیخ صاحب کی تشریف آوری ضروری تھی۔ ملتوی ہونے لگیں۔ بایں ہمہ ایک امید سی لگی تھی کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ اور گلشن اردو کو ابھی دیر تک اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کا موقع ملیگا۔

لہٰذا ۹ فروری کو دفعتہً جب میں نے شیخ صاحب کے انتقال کی خبر سنی تو دل تھام کر رہ گیا۔ اس لئے کہ ابھی رات ہی کو سن چکا تھا کہ ایک آدھ دن سے انہیں کافی افاقہ ہے۔ بہر حال میں نے یہ خبر سنی اور ایک لحظے کے لئے اس دنیا میں پہنچ گیا۔ جو گویا شیخ صاحب ہی کے دم سے آباد تھی۔ پھر جب اس حقیقت کا احساس ہوا کہ شیخ صاحب بھی ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گئے تو مجبوراً یہ ماننا

پڑا کہ زمانے کے بے رحم ہاتھ نے ہم سے وہ زبردست شخصیت چھین لی جس کی ذات میں تنہا ایک دبستان مجسم منعکس ہو کر رہ گیا تھا۔ افسوس ہے شام کو جب میں ان کے جنازے میں شرکت کے لئے دل کشاں پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ میت قبرستان جا پہنچی ہے۔ میں نے قبرستان کا رخ کیا۔ لیکن وہاں پہنچکر بھی جنازہ نہیں ملا۔ کیونکہ لوگ ان کو سپرد خاک کرکے واپس آ چکے تھے۔ اس پر میں نے وہیں کھڑے کھڑے دعائے مغفرت کی اور بصد حسرت واندوہ واپس آ گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

عبدالقادر اور انکی ادبی تحریک

از

(مولانا صلاح الدین احمد)

اُنیسویں صدی کا ربع آخر اسلامی ہند میں انگریزی تہذیب۔ انگریزی تمدن۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کے تسلط اور نفوذ کا زمانہ تھا۔ سرسید احمد کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں اپنی ہمسایہ قوم سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور وہ اس پسماندگی کو کم سے کم وقت میں دور کر دینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی بیشتر توجہ اس امر پر مرکوز کر دی کہ مسلمان نوجوان پورے انہماک سے انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ اور اسی کے بل پر ان اعزازات و مناصب تک پہنچ جائیں جن تک برادران وطن بہت پہلے سے پہنچ رہے تھے۔ اور جنہیں وہ اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق قومی ترقی کے اہم ترین وسائل میں شمار کرتے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ جس عہد میں ہمارے ہندو ہموطنوں نے چند آزاد خیال انگریزوں کی رہنمائی میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھدی تھی اور اس جماعت کے محدود نصب العین میں بھی ایک قومی رنگ کی جھلک صاف نمایاں تھی اور سودیشی کا فروغ اور ایک قومی کلچر کا احیاء اس کے پیش نظر تھا۔ لیکن سرسید نے مسلمانوں کو اس کی طرف مائل نہیں ہونے دیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اُن کے سامنے تھے اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج نے مسلمانوں کو جس خلفشار اور مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور جس طرح بحیثیت قوم اُن کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ ان کیفیتوں کو وہ بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے اور قوم کی فلاح اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ کمترین مقاومت کے خط پر ادھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھی چلتی جائے۔ اور کم از کم وقت میں اپنی وہ کمی پوری کرے۔ جو ایک بدلتی ہوئی سیاست اور بیگانگی اور نفرت کے اس جذبے کا نتیجہ تھی جو ان کے دل میں فرنگی کے خلاف اُن کے مذہبی رہنماؤں نے پیدا کر دیا تھا۔ سرسید اور ان کے تابعین برابر اور پیہم اس جذبے کے مٹانے اور مسلمانوں کو انگریزوں اور انگریزی زبان و ادب سے قریب تر لانے میں مصروف عمل رہے۔ یہ اُن کی تعلیمی اور تہذیبی تحریک کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے بیشتر حضرات انگریزی دان نہیں تھے۔ لیکن انگریزی کی طرف اُن کا میلان اس قدر زیادہ تھا کہ اعلیٰ درجے کی اردو نثر میں بھی وہ اکثر انگریزی کے الفاظ بے ضرورت استعمال کر جاتے تھے۔ چنانچہ حالی کی شستہ نثر میں اگر کوئی نقص ہے تو یہی ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کے بے ضرورت اور بے محل استعمال سے داغدار ہے۔

سرسید نے اردو پر زبان برائے زبان کے نقطۂ نظر سے چنداں توجہ نہیں کی۔ اور انہوں نے اسے ہماری قومی تعمیر کے منصوبے میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں دیا۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کے بعد وہ اردو کے سب سے پہلے نثر نگار ہیں اور انہوں نے اردو میں بہت

ست مطالب کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ لیکن وہ اسے محض اپنے مخاطبین کو اپنے خیالات پہنچانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ غالب کی طرح انہوں نے اسے دلکش اور خوبتر بنانے پر کوئی توجہ صرف نہیں کی۔ انہیں دنیا کے اور بھی بہت سے کام تھے۔ اس لئے وہ ہماری تمہید کے جس پہلو کو نظر انداز کر گئے۔ میری ناقص رائے میں اگر وہ انگریزی دان ہوتے تو آج اُن کے مضامین کا ایک خاصہ حصّہ، خصوصاً اُن کے وہ مباحث جو اس وقت کے نوجوانوں سے متعلق تھے۔ آج اردو کی بجائے انگریزی ہی میں ملتے۔ سرسیّد کی اپنی نثر خاصی بھدی ہے اور یہ بھدا پن آج کے ترقی یافتہ معیار سے نہیں۔ بلکہ اُن کے اپنے زمانے کے اس معیار سے بھی متعین کیا جا سکتا ہے جو نثر جدید کے معمار اعظم غالب نے اپنے اردو مکاتیب کے ذریعہ سے قائم کیا تھا۔ زبانِ اردو اور نثرِ اردو کے سلسلے میں مَیں نے سرسیّد کا ذکر بالخصوص اس لئے کیا ہے کہ وہ نہ صرف مسلمانانِ ہند کی جدید تعلیمی تحریک کے بانی تھے بلکہ جدید نثر اردو کا آغاز بھی اُنہی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انہوں نے نہ تو خود اردو کو اپنے تعلیمی منصوبے میں کوئی قابلِ ذکر مقام دیا اور نہ نثرِ اردو کی تہذیب و تربیت پر کوئی توجہ صرف کی۔ اُن کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ قوم کو انگریزی تہذیب سے قریب تر لائیں اور مسلم نوجوانوں کو انگریزی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کریں۔ چنانچہ وہ اس میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور تقریباً ایک چوتھائی صدی میں انہوں نے انگریزی تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کا ایک خاصا گروہ پیدا کر دیا۔ دوسری جانب اردو نثر سے انہوں نے زیادہ تر اپنے خیالات کی تبلیغ کا کام لیا اور از بسکہ وہ ایک مصلح پہلے تھے اور ایک قلم کار بعد میں۔ اس لئے اُن کی توجہ عبارت کے حسن کی بہ نسبت مواد کے خوب و زشت کی طرف زیادہ مائل رہی۔ سرسیّد سے جو اکابرِ ادب براہِ راست متاثر ہوئے اُن میں مولانا حالی، نواب محسن الملک، مولوی محمد چراغ، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی کے اسمائے گرامی سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں انگریزی دان نہیں تھا۔ اگرچہ اپنی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر ان میں سے بعض نے بعد میں انگریزی کی یہاں تک تحصیل کر لی تھی کہ ہمارے بعض معرکہ آرا تراجم ان کے قلم کے مرہون ہوئے ان حضرات کے سامنے بھی ضروری کاموں کا اتنا بڑا انبار تھا کہ انہوں نے اپنی بیشتر توجہ جانِ سخن پر مرکوز رکھی۔ پیرایۂ سخن کا نشو و ارتقا اُن کی نگاہ التفات سے ایک بڑی حد تک محروم رہا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ شبلی کی شستہ و رفتہ نثر اور حالی کی سادگی و صفائی بیان آج بھی بے عدیل ہے اور نذیر احمد نے محاورے کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیلی وہ آج بھی ہمیں چونکا دیتی ہے۔ لیکن یہ تینوں اکابر اپنے اپنے مشن میں اس درجہ منہمک رہے کہ انہیں زبان بہ حیثیت زبان اور اس کے روز افزوں مسائل کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں سرسیّد سے بہت زیادہ فرصت حاصل تھی اور ان کے کام کا میدان سرسیّد کے میدان کی نسبت بہت محدود تھا۔ اور اس فرصت اور اس اختصار سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے اپنی تصانیف میں زبان و بیان کی بہت سی خوبیاں پیدا کیں۔ لیکن وہ تصانیف کی حدود سے آگے نہیں بڑھے اور زبان و ادب کی جو خدمت وہ اپنی تصانیف کے ذریعے سے انجام دے سکتے تھے۔ وہ انہوں نے نہایت خوبی سے انجام دی۔ حالی اور نذیر احمد تو قطعی طور پر یہیں رہ جاتے ہیں۔ البتہ شبلی کچھ آگے بڑھے اور انہوں نے اپنی عمر کی آخری منازل میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی لیکن یہ تحریک ایک خالص

اسلامی تحریک تھی۔ اُردو کو اِس سے بالواسطہ فائدہ ضرور پہنچا۔ لیکن اِس کا مقصد زبان و ادب اُردو کی ترقی ہرگز نہیں تھا۔

یہ سعادت قدرت نے سرسید مکوال کے ایک انگریزی دان نوجوان کے لئے محفوظ کر رکھی تھی۔ جو بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی جواں سال عبدالقادر کے رُوپ میں منظرِ عام پر آیا۔ اِس نوجوان کے شانوں پر ایک سن رسیدہ سر تھا۔ اور اس کے کردار میں قدرت نے وہ خوبیاں اور دل آویزیاں جمع کر رکھی تھیں جو ایک ثقافتی تحریک کے قائد میں لازماً ہونی چاہئیں۔ عبدالقادر ایک صلح جو اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ اور مفاہمت اور مصالحت اُن کی فطرت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ مخالف کے نقطۂ نظر کو بہت اچھی طرح سمجھتے اور اسے نہایت ہمدردی سے محسوس کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو اس خوبصورتی سے اس پر حاوی کر دیتے تھے کہ مخالف شکست کھانے کے باوجود اسے اپنی فتح سمجھتا تھا۔ یہ جوہر انہیں قدرت نے بڑی فراخدلی سے ودیعت کیا تھا اور اس کی بدولت وہ اپنی سماجی زندگی میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے۔ عبدالقادر کی دوسری بڑی خصوصیت اُن کی گہری انسانیت تھی۔ وہ ہر نوع کے تعصبات سے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، سماجی ہوں یا طبقاتی مبرّا اور بالاتر تھے۔ اور اُن کے وسیع دل میں گبر و ترسا، مومن و کافر، قدیم و جدید، ہر نوع کے افراد اور اُن کے تصوّرات کے لئے بڑی کھلی جگہ تھی۔ اُن کی تیسری خوبی اُن کا دلکش اندازِ بیان اور اپنے موضوع پر اُن کی کڑی گرفت تھی۔ وہ بہت کم جوش میں آتے تھے: نہ تقریر میں، نہ تحریر میں، لیکن ان کی دلآویز گفتار اور دل نشین تحریر میدان پر میدان سر کئے چلی جاتی تھی۔ ان خوبیوں سے آراستہ ہو کر جب عبدالقادر زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو اگرچہ انہوں نے اپنے سامنے ذاتی اور شخصی ترقی کا ایک شاداب مرغزار بنایا۔ لیکن ویسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی تحریکِ غیبی نے اُن کے قدم پکڑ لئے ہیں۔ اور وہ نوجوان جو اپنے زمانے کی انگریزی تعلیم کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ جو یونیورسٹی کے آخری امتحان یعنی (بی۔ اے) میں صوبے بھر میں اوّل آیا تھا۔ اور جس کی انگریزی کی استعداد اپنے ساتھیوں سے اس قدر زیادہ تھی کہ جب ضرورت درپیش ہوئی تو اس نے پنجاب کے پہلے انگریزی اخبار کی ادارت بڑی آسانی سے سنبھالی۔ وہ دھیما نوجوان یکایک رُکا اور اپنے قدم اعلیٰ ملازمت اور دنیوی ترقی کے آسان اور پامال راستے سے موڑ کر اس منزل کی طرف بڑھا دیئے جس کا راستہ اگرچہ بڑا سنگلاخ اور دشوار گذار تھا۔ لیکن جس کا پا لینا، اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک فوزِ عظیم سے کم نہ تھا۔ وہ منزل ہمارے کلچر کی منزل تھی۔ وہ کلچر جس کا شاید سب سے موزوں اور پُرمعنی نام اُردو کا کلچر ہے۔ اور وہ راستہ ادبی صحافت کا راستہ تھا۔ جس میں ہر قدم پر ایک ٹھوکر اور ہر گام پر ایک بندش با ہو کا حوصلہ پست کئے دیتی تھی۔ نوجوان عبدالقادر نے جب اپنی زندگی کا مشن اور اپنے عمل کا راستہ تجویز کیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن میں دو تصوّرات نہایت واضح تھے۔ ایک اُردو کا تصوّر بحیثیت ایک قومی اور ملکی زبان کے اور دوسرا اُردو کا تصوّر بحیثیت ایک جدید ترقی یافتہ زبان کے۔ اُنہیں کے عہدِ شباب تک اُردو میں جو کچھ کام ہوا تھا وہ بیشتر ایک داخلی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مغرب کی جدید تحریکوں کا اُن پر قدم نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے اکابرِ ادب انگریزی سے بدرجہ غایت متاثر تھے۔ لیکن خود انگریزی دان نہ ہونے کے باعث وہ ہماری زبان اور ہمارے ادب کو وہ کچھ نہیں دے سکتے تھے جس کی بصورتِ دیگر، اُن کی ذہنی فوقیت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اور پھر

ایک قوم کا ادب ایک قوم ہی مہیا کر سکتی ہے۔ ایک دو افراد کی فلک پیما کوششیں بھی چنداں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا کرتیں۔ عبدالقادر کی دور رس نگاہ نے دیکھا کہ انگریزی سے جو انتخاب اہلِ ذوق اور اہلِ علم کرتے رہے وہ انگریزی سے ناآشنا ہونے کے باعث ایک قدرتی حصار میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ خواہ انھیں کم از کم بھی ارزانی ہو۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی بے مثال ہمت سے اب تک کئے جاتے ہیں۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان نوجوانوں نے جنھیں سرسید کی تحریک نے تہذیبِ مغرب سے آراستہ کیا ہے۔ وہ کچھ اُسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور علیگڑھ تحریک میں انگریزی کی طرف حد سے زیادہ میلان نے ہمیں ایک ہنگامی نامنہ کے ساتھ ایک حقیقی نقصان بھی پہنچایا ہے۔ ہمارے نوجوان ایک غیر ملکی زبان کے ساتھ لاشعوری طور پر ان تمام عناصر کو بھی بڑی سرعت سے قبول کر رہے تھے۔ جو اس کلچر کے لازمی اجزا ہوتے ہیں۔ جو کسی زبان میں اپنا اظہار پاتا ہے۔ کسی ترقی پذیر زبان، اس کے ادب اور اس کے کلچر کر بجائے خود آشنا ہونا اور ان کے صحت مند رجحانات سے متاثر رہنا کوئی برائی کی بات نہیں ہے۔ لیکن جب یہ عمل شروع ہوتا ہے۔ تو یہ اثرات اپنی انتہا تک بھی پہنچ جاتا ہے اور فریقِ ثانی یعنی اثر قبول کرنے والا فریق۔ فریقِ اوّل کے رنگ میں اس انداز سے رنگا جاتا ہے کہ اس پر نیا رنگ۔ رنگ نہیں بلکہ اکثر و بیشتر بدنما دھبوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سرسید کو بھی غالباً ایک حد تک اس بات کا احساس تھا لیکن اس کا کوئی مداوا انھوں نے تجویز نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اور علیگڑھ کے نمونے پر ملک میں جو اور اسلامی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ ان میں بھی یہ انتظام مدِنظر رکھا گیا۔ لیکن اس کی حیثیت محض برائے بیت کی سی تھی۔ اور پھر ان اقدامات میں یہ حقیقت قطعاً مدِنظر نہیں رکھی گئی کہ کسی غیر کلچر کا توڑ غیر مذہب نہیں۔ بلکہ اس کے مقابل کا ایک اور کلچر ہی ہو سکتا ہے۔

سر عبدالقادر نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا اور وہ ہمارے معاشرے میں انگریزی کلچر کے فنکارانہ مقابلے اور اس کے خوش آیند اور معتدل انجذاب کے لئے ایک قومی اور ملی کلچر کے احیاء کا مشن لے کر وارد ہوا۔ اور اس نے اپنی خاموش اسلوبِ نظر اور دل نواز تحریک سے چند ہی سال میں اس مشن کی بنیادیں استوار کر دیں۔ میں یہ تو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ شعوری طور پر سرسید اور ان کے رفقا کی پیوست آفریں مشرقیت سے بے زار تھا۔ یا وہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر اپنے انداز کا ایک بند باندھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو اقدامات اس نے کئے۔ کم از کم ان کے اسباب میں یہی فکر اور یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ سوال کہ وہ شعوری تھا یا غیر شعوری۔ ہمیں اس مورخ کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ جو اس کے سوانح حیات میں اس عنصر کا سراغ لگائیگا۔ لیکن اس بات سے ہم قطعاً انحراف نہیں کر سکتے کہ خود سرسید کی تحریک کا تربیت یافتہ ایک طبّاع نوجوان اس تحریک کے مضر عناصر کے صحیح استیصال کے لئے میدانِ عمل میں اترا۔ اور اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر ہونے دیئے بغیر کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس نے اس کے دونوں پہلوؤں یعنی ایک غیر دلکش مشرقیت اور ایک گمراہ کن مغربیت کی اصلاح کا ایک کارگر ذریعہ اور ایک خاموش پروگرام تیار کر لیا۔ اور اپنے وقت اور اپنے حلقہ کے چند ہم مذاق نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے کر اس نے اس ہلکی سی حرکت کا آغاز کر دیا جو آج نصف صدی کے بعد ایک عظیم الشان تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اور سرزمین پنجاب سے نکل کر اپنی یلغار میں مشرق و

مغرب کے بعید ترین کناروں سے چھو چکی ہے۔

حضرات! عبدالقادر کی اس تحریک کا آغاز مخزن کے اجراء سے ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں بعض دفعہ بعض چھوٹے چھوٹے واقعات اہم ترین نتائج کے پیش رو بن جاتے ہیں۔ مخزن کا اجراء بھی ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ تقاضائے وقت کا ایک منطقی نتیجہ تھا اور عین اپنے وقت پر رونما ہوا۔ اپنے کلچر کی ترتیب نو کے جو دوگونہ مقاصد عبدالقادر کے پیش نظر تھے۔ ان کی تکمیل کا ایک موزوں ذریعہ اس کی نگاہوں کے سامنے ابھرا اور اپنی زبان کے آئندہ منصب کے جو دو تصورات اس کے ذہن میں واضح تھے ان کی تشکیل کا سامان قدرت نے بہم پہنچا دیا۔ عبدالقادر کی دوربین اور ژرف نگاہ نے اس قیمتی مسالے کا جائزہ لے رکھا تھا جو ہماری تہذیب کے اکناف میں بکھرا ہوا اس باسلیقہ معمار کا انتظار کر رہا تھا جو اسے ایک قومی کلچر کی تعمیر میں استعمال کرے چنانچہ مخزن کے اجراء کے ساتھ ہی یہ بکھرے ہوئے تعمیری عناصر آہستہ آہستہ ایک مرکز کی طرف سمٹتے گئے اور تہذیبی تعمیر کے ایک حیات افروز منصوبے میں صرف ہونے لگے۔ مخزن کے پس منظر میں عبدالقادر کی یہ بہت بڑی حکمت کارفرما تھی۔ کہ اس نے اس کے مضمون نگاروں میں زیادہ تر وہی لوگ انتخاب کئے تھے جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے یہ ایک علیحدہ داستان ہے کہ جناب شیخ اپنے معاونین سے کس کس طرح مضامین لکھواتے اور کن کن ترکیبوں سے انہیں قلم اٹھانے پر آمادہ کرتے تھے۔ اور پھر ان کی تحریروں کو اپنے کمال مہارت سے کس طرح سجاتے اور زیب اوراق بناتے تھے۔ یہاں مجھے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ شیخ صاحب کے اس حسن انتخاب نے ہماری زبان کو شروع ہی میں متعدد فائدے پہنچائے ایک تو یہ کہ وہ افکار نو اردو میں وارد ہونے لگے جو ذہن کے اعلیٰ مغربی تعلیم و تربیت سے متاثر ہونے کے نتائج تھے۔ اور اس لئے ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے ایک دلکشا جدت اور ایک حیات آفرین تازگی لئے ہوئے تھے۔ دوسرا فائدہ یہ مرتب ہوا کہ انگریزی دان طبقے میں اپنی زبان سے ایک خودوارانہ محبت پیدا ہونے لگی تیسرا بڑا فائدہ عوام کو پہنچا اور وہ یہ تھا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ انگریزی دان طبقہ جس کو وہ درایے اولے اور اپنے سے بالکل علیحدہ اور بلند سمجھتے تھے اردو میں اظہار خیال کرتا ہے۔ اور کس خوبی سے کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سے انگریزی کا بے جا تفوق اٹھنے لگا۔ اور اس کی جگہ اپنی زبان کی محبت لینے لگی۔ بالفاظ دیگر مخزن کے معاملے میں انگریزی دانوں کو مددگار بنا کر جناب شیخ نے اردو کی توقیر اور عزت بڑھائی، اور اس کی مقبولیت میں نہایت قیمتی اضافہ کیا۔ ادھر جب ذہین نوجوانوں کو اردو میں اظہار خیال کا چسکا پڑ گیا تو ان میں مسابقت شروع ہوئی اور اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ وہ منزل بھی آن پہنچی جب کسی کے مضمون کا مخزن میں چھپ جانا اس کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز متصور ہونے لگا۔

مخزن نے جن افراد کو روشناس خاص و عام کیا۔ ان میں اس زمانے کے ایسے متعدد طباع نوجوان تھے۔ جن کا شمار آج ہمارے ادب کے اکابر میں ہوتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ دور حاضر کے سب سے بڑے شاعر یعنی اقبال اور سب سے بڑے نثر نگار یعنی ابوالکلام آزاد نے اپنی پہلی نظم اور اپنا پہلا مضمون مخزن ہی میں لکھا۔ ان کے علاوہ جن بلند پایہ ادباء اور شعراء کے ادبیہ مضامین نظم و نثر مخزن میں طبع ہوئے آج ان کا شمار انگلیوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سید سلیمان ندوی کا پہلا مضمون

مخزن ہی میں طبع ہوا تھا۔ اور ایک جگہ انہوں نے اقرار کیا ہے کہ اگرچہ بقول ان کے ان کے محبوب و دوسالہ قلم نے ہزاروں صفحے سیاہ کر ڈالے لیکن جو تسکین اور مسرت انہیں مخزن میں اپنے پہلے مضمون کی اشاعت سے ہوئی تھی ویسی پھر کبھی میسر نہ آئی ——— اقبال کی پہلی نظم ہمالہ کے مخزن میں شائع ہونے کی روداد خود شیخ صاحب نے بانگِ درا کے دیباچے میں یوں بیان فرمائی ہے ——— "شیخ محمد اقبال نے ایک ادبی مجلس کے جلسے میں اپنی وہ نظم جس میں کوہ ہمالیہ سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے، اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاق زمانہ اور ضروریاتِ وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر شیخ صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادبِ اردو کی ترقی کے لئے رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثناء میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے اُن سے وعدہ لیا کہ اس رسالے کے حصۂ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا۔ اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انہوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں ہے۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دے دیجئے اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھیئے۔ انہوں نے اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی، کیونکہ انہیں یہی خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں اس کا رنگ دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی۔ اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا، شائع کر دی۔ یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا اور ۱۹۰۵ء تک جب وہ ولایت گئے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے ——"

اس اقتباس کے یہاں پیش کرنے سے میرا مدعا اس امر کا اظہار نہیں ہے کہ اگر بالفرض مخزن نہ نکلتا تو اقبال روشناسِ خلق نہ ہوتے ہرگز نہیں۔ اقبال اور اقبال سے کم تر درجے کے فن کار بھی اپنے اپنے وقت پر زمانے کے تقاضوں کے مطابق لازماً منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اس کے برعکس میں فقط یہ جتانا چاہتا ہوں۔ کہ عبدالقادر نے مخزن کے ذریعے سے جو ادبی تحریک جاری کی وہ اقبال اور اقبال کے ساتھ بیسیوں اور اکابرِ ادب کے منظرِ عام پر آنے میں بدرجہ غایت ممد ثابت ہوئی اور اس نے نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کے جواہرِ طبع کو نمایاں ہونے کا موقع دیا۔ بلکہ خود ایک طرف ان جواہر کی نمود کا باعث ثابت ہوئی اور دوسری جانب اس مذاقِ عام کی آفرینش کا موجب ہوئی۔ جو جوہر کو قبول کرتا اور اُسے پنپنے کا موقع دیتا ہے۔ اور پھر چراغ سے چراغ جلتا رہا۔ اور مخزن کے بعد زمانہ اور زمانہ کے بعد ہمایوں اور معارف اور نگار اور نیرنگِ خیال اور عالمگیر اور ادبی دنیا اور ادبِ لطیف اور ساقی اور اردو کے بیسیوں اور بلند پایہ مجلات و جرائد منصۂ شہود پر آئے اور اپنے ساتھ فن کاروں کے ایک انبوہ کو منظرِ عام پر لاتے چلے گئے۔ بلا شبہ یہ کہنا درست ہوگا۔ کہ اگر ان میں سے کوئی جریدہ شائع نہ ہوتا تو وہ فن کار نمایاں نہ ہوتے جو اس میں لکھتے رہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ اگر ہمایوں نہ نکلتا تو ملک کے [illegible] کو کون جانتا۔ ایسا ہی غلط ہے جیسا یہ قول کہ ادبی دنیا نہ ہوتا تو جدید افسانوی ادب کے جتنے ارکین اور جدید نظم کے بہت سے اعیان صبح کی روشنی نہ دیکھتے۔ یاد رکھئے فن کی نرم و نازک کونپل تو بہار کے دنوں میں اپنے فطری نمو کے زور سے پھوٹ ہی نکلتی ہے لیکن اگر باغبان درخت کی بروقت آبیاری کرتا رہے تو کونپلوں کا پھوٹنا، کلیوں کا پھول بن جانا اور بہار کا کشاں کشاں باغ میں آ جانا، باغبان ہی کے کارہائے

نمایاں میں شمار ہوتا اور بجا طور پر شمار ہوتا ہے۔

اپنی تحریک کے اجراء کے ساتھ عبدالقادر نے خود بھی لکھنا شروع کیا اور اردو نثر کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کیا۔ جو اپنی سادگی اور دلکشائی دونوں میں بے مثال تھا۔ وہ جس زبان میں باتیں کرتے تھے بعین اس زبان میں لکھتے بھی تھے اور اپنی تحریر میں انہیں کوئی تکلف یا تصنع برتنا نہیں پڑتا تھا۔ ان کا موضوع خواہ ادبی ہو یا سیاسی، خارجی ہو یا داخلی وہ ایک یکساں عبارت ایک ہموار انداز سے اُسے بیان کرتے چلے جاتے تھے اور ان کے ناظر کو ان کے سمجھنے میں کبھی کسی وقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ یہ اسلوب سادگی اور ہمواری کے علاوہ ایک خاص نہج کی لطافت اور دلآویزی بھی رکھتا تھا۔ جو میں نے اردو کے کسی اور سادہ نگار میں نہیں دیکھی۔ میری ناچیز رائے میں عبدالقادر کے اردو اسلوب کی اگر کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ تو وہ گاندھی جی کا انگریزی اسلوب ہے۔ دیکھئے! دونوں میں کس قدر مماثلت ہے اور یہ بھی دیکھئے کہ ان کے اسالیب بیان نے ان کے مقاصد کو کس درجہ تقویت پہنچائی ——— عبدالقادر کا اسلوب نگارش اگرچہ اپنی جگہ بھی ایک مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ لیکن اس نے ان کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بھی ایک بہت بڑا حصہ لیا۔ انگریزی دان نوجوانوں کے سامنے انہوں نے اپنی نگارش کے نمونے رکھ کر ان کے دلوں سے وہ جھجک یکسر دور کر دی۔ جو انہیں اردو لکھنے کے لئے قلم اٹھانے میں محسوس ہوتی تھی۔ اور انہوں نے اپنے انداز تحریر سے ثابت کر دیا کہ روزمرہ کے ادبی اور تہذیبی مسائل پر اظہار خیال کے لئے بس ایک ذرا سے سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فارسی اور عربی کا جید عالم ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں اس انداز کو پیش کرنے میں دوسرا نکتہ یہ تھا کہ عوام کسی وقت یا تکلف کے بغیر ادب کی مسرتوں سے لذت یاب ہو سکیں۔ اور تیسرا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ہمارے ہندو ہموطن اس کی آسانی اور دلآویزی سے متاثر ہو کر اردو سے قریب تر ہو جائیں۔ پنجاب کا ہندو خصوصیت سے ان کے پیش نظر تھا۔ اس کے سامنے انگریزی کے سوا اور کوئی۔ بان ایسی نہیں تھی جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ عبدالقادر نے اردو کا ایک نہایت خوش گوار اسلوب اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس کو زبان حال سے دعوت دی کہ وہ اردو ہی کو اپنی ملکی اور قومی زبان سمجھے۔ چنانچہ مخزن کی پالیسی میں بھی شیخ صاحب کا یہی انداز خیال نمایاں رہا۔ اور اس کے صفحات نہ صرف ہندو ادباء اور شعراء کی ادبی اور فنی کاوشوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہے۔ بلکہ ان کی وہ تخلیقات بھی اس میں چھپتی رہیں جو ان کے خالص سیاسی اور مذہبی تصورات سے علاقہ رکھتی تھیں۔ رامائن کا منظوم ترجمہ تو خیر اپنی جگہ ایک بلند ادبی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ مخزن میں بندے ماترم کا جو ایک خالص ہندو قومی گیت ہے۔ اردو ترجمہ بھی بڑے اہتمام سے چھپا تھا۔ یہ ترجمہ غالباً پروفیسر گل بہادر سنگھ نے کیا تھا۔ اسی طرح سرور جہاں آبادی کی نظم پارسنی بھی بغیر کسی اکراہ کے شائع کی گئی تھی۔ ان مثالوں سے جہاں شیخ صاحب کی وسعت قلبی اور انسان دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ کہ وہ اردو کو سچے معنوں میں ایک ملکی زبان بنانا چاہتے تھے۔ اور اس میں وہ ہندو مسلم کی کوئی تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ان تحریکوں سے بھی بالکل الگ تھلگ رہے جو مخزن کے اجراء سے چار پانچ برس بعد ہندی اردو کے تضیہ کی صورت میں منودار ہوئیں۔ وہ اپنی چیز بڑے سلیقے سے پیش کرتے تھے۔ دوسرے کی چیز کی اچھائی برائی سے انہیں

کوئی واسطہ نہیں تھا۔ سیاست سے وہ کوسوں دور رہے۔ اور ان کا دور رہنا ہی ان کی تحریک کے حق میں نہائیت مفید ثابت ہوا۔ جتنے ہندو اہل قلم نے مخزن کے ذریعے سے خدمت اردو میں حصہ لیا۔ آج ان میں سے بیشتر کا شمار ہمارے اکابر ادب میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ کہنا درست ہے کہ کسی قوم کی زبان و ادب اس کے کلچر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تو یہ کہنا بھی چنداں غلط نہیں ہے کہ کسی قوم کا کلچر اس کی زبان اور اس کے ادب ہی کے ذریعہ سے نفوذ کرتا۔ اور مستعد عناصر پر چھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے عبدالقادر نے اس کلچر کے پھیلانے میں جو حصہ لیا ہے جسے ہم بجا طور پر اردو کا کلچر کہتے ہیں۔ ایک بہت بڑی قومی خدمت کا درجہ رکھتا ہے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہم آج نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسے مستقبل کے مورخ ہی پر چھوڑنا پڑے گا۔ ہاں آج کی کیفیت کا اظہار شاید حالی کے اس شعر سے بہتر نہ ہو سکے۔ سے

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے

شیخ صاحب کی باتیں

از قلم
(ڈاکٹر محمد باقر ہیڈ آف دی پرشین ڈیپارٹمنٹ اورینٹل کالج)

میں نے یہ قصہ اپنے بچوں اور ان کے بچوں کو بھی سنایا ہے آپ بھی سُنیئے۔ آپ جانتے ہوں گے۔ فرونڈ (Froude) انگریزی زبان کا ایک مشہور مضمون نگار ہے۔ یہ اُس نے لکھا ہے۔ ایک امیر عورت نے ایک کتا اور بلی پال رکھی تھی۔ کتا ایک گرم کمرے میں ایک قالین پر دن رات لیٹا رہتا۔ کبھی کبھی مالکن بلاتی تو اس کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھتا۔ اور پھر اپنی جگہ پر جا کر لیٹ جاتا۔ بلی سارا دن ادھر اُدھر گھومتی رہی اور ایک دن اُسے یہ خیال آیا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ وہ کس لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس نے خود اس مسئلہ پر غور کیا۔ لیکن جب کوئی تسلی بخش جواب نہ پایا۔ تو وہ اپنے ہمجولی یعنی کتے کے پاس گئی۔ وہ حسب معمول قالین پر آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا۔ بلی نے کہا۔ تم کتنے احمق جانور ہو۔ سارا دن لیٹے رہنے کے سوا کام نہیں۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم کس لئے پیدا کئے گئے ہیں؟ کتے نے انگڑائی لی۔ آنکھیں کھولیں۔ اور کہا یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں کس خبطی نے کہا ہے کہ تم اس مسئلے پر سوچو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ میں اس امیر عورت کے گھر رہوں، اچھی اچھی غذا کھاؤں اور قالین پر پڑ کر سو رہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس امیر عورت کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ یہ میری خاطر مدارات کرے اور مجھے اچھے اچھے کھانے کھلائے۔ بلی نے کہا مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ کہ تم اس کا جواب نہ دے سکو گے۔ اور یہ کہہ کر بلی جنگل کی طرف چل دی۔ تاکہ اپنے سوال کا جواب کسی اور جانور سے معلوم کرے۔ راستے میں اُسے ایک درخت پر ایک چڑیا بیٹھی ہوئی ملی۔ بلی نے چڑیا سے کہا۔ تم کتنی پیاری چڑیا ہو بھلا یہ تو بتاؤ ہم کس لئے پیدا کئے گئے ہیں؟ چڑیا نے کہا۔ جا اپنی راہ لے۔ میں تمہاری باتوں میں آنے کی نہیں۔ میں تو ہوا میں اُڑنے اور چہچہانے کے لئے زندہ ہوں۔ اور یہ کہہ کر پھر سے اُڑ گئی۔ بلی آگے بڑھی تو اُسے ایک بیل نظر آیا۔ بلی نے بیل سے بھی وہی سوال پوچھا۔ بیل کچھ حیران ہو کر بلی کی طرف تکنے لگا۔ پھر بولا بہن ہمیں کیا معلوم ہم کس لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہمارا تو سارا وقت چارہ کھانے اور بوجھ کھینچنے میں گذر جاتا ہے۔ میں تمہیں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ بہتر یہ ہوگا۔ کہ تم کسی اور جانور سے اس کا جواب پوچھو۔ بلی مایوس ہو کر آگے چل دی۔ سامنے درخت پر ایک اُلو بیٹھا ہوا تھا۔ اُلو کو دیکھ کر بلی کی باچھیں کھل گئیں۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ انگریزوں کے ہاں اُلو کو بہت دانا پرندہ مانا جاتا ہے۔ اور یہ بلی چونکہ انگریزی بلی تھی۔ اس لئے اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب اُس کے سوال کا جواب اُسے ضرور مل جائیگا۔ چنانچہ بلی نے اُلو سے کہا بھائی میں آج ایک سوال لے کر جنگل میں سرگردان ہوں۔ شاید تم میرے سوال کو حل کر سکو۔ اُلو نے کہا۔ وہ ایسا کونسا مشکل سوال ہے جس نے تمہیں در در کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا ہے۔ بلی نے کہا۔ بھائی دقت تو یہ ہے۔ کہ کسی جانور نے میرے سوال

کو جواب نہیں دیا۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میری ڈھارس بندھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے سوال کا جواب دے سکو گے۔ بات یہ ہے کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہم کس لئے پیدا کئے گئے ہیں، اُلّو نے کہا۔ بس اتنا سا سوال ہے۔ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔ بلّی نے اُچھل کر کہا۔ بھلا بتاؤ تو اس کا جواب کیا ہے؟

اُلّو نے نہایت متانت سے جواب دیا ہم سوچنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

بلّی نے پوچھا۔ کیا سوچنے کے لئے؟

اُلّو نے کہا۔ یہی کہ ہم کس لئے پیدا ہوئے ہیں۔

باقر صاحب۔ یہی قصّہ میرا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں تفکّرات سے اپنے آپ کو دور رکھوں اور یہاں فرائڈ کے خیال کے مطابق ہم صرف سوچنے اور سوچتے رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ فرائڈ کے اُلّو کی طرح ہماری سوچ کا کچھ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن ہماری سوچ کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

جمعہ کا روز تھا۔ اور ۱۹۴۹ء کے نومبر کی گیارہ تاریخ۔ میں کئی روز سے یہ سوچ رہا تھا۔ کہ شیخ عبدالقادر کے ہاں جاؤں۔ وہ ایک طویل عرصہ سے بیمار تھے۔ غالباً دس گیارہ ماہ سے۔ کچھ عرصہ پہلے حالت نازک بھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے ملاقاتیوں سے ملنا بند کر دیا تھا میں ہر دو چار روز کے بعد ٹیلیفون کر کے خیرِ صحت پوچھ لیتا۔ اب حالت بہتر ہو چکی تھی۔ کم از کم بظاہر یہ حالات تھے کہ وہ ملنے والوں سے مل لیتے تھے۔ میں تین بجے ماڈل ٹاؤن سے بس پر سوار ہوا۔ اس بس میں ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی تھے۔ ان سے بھی متوقع ملاقات کا ذکر آیا۔ حفیظ صاحب نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ شاید اسی شام کو ان سے ملنے جائیں گے معلوم نہیں وہ جا سکے یا نہیں۔ بہر صورت میں اس روز ساڑھے تین بجے سر عبدالقادر کے ہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی تو آپ کے صاحبزادے الطاف (بریگیڈیر الطاف قادر) باہر نکلے۔ کہنے لگے وہ مالش کرا رہے ہیں اور اس کے بعد غسل کریں گے۔ اندازِ گفتگو کچھ اس قسم کا تھا۔ جیسے یہ کہہ رہے ہوں۔ کہ آپ اتنی دیر کہاں انتظار کریں گے۔ اس لئے چلے جائیے۔ اور میں یہ تہیّہ کر کے گیا تھا۔ کہ شیخ صاحب سے ضرور ملوں گا۔ اور اتفاق دیکھئے کہ ان کے فوت ہونے کے بعد منظور (مرحوم کے دوسرے صاحبزادے) نے مجھے یہ بتایا کہ ملنے والوں سے اُن کی یہ آخری ملاقات تھی اور اس ملاقات کے بعد وہ پھر کبھی گول کمرے میں آکر کسی ملاقاتی کے پاس نہ بیٹھ سکے۔ چنانچہ میں نے الطاف سے کہا کہ آپ اطلاع کرا دیجئے اور اگر شیخ صاحب مل سکتے ہوں تو میں ایک آدھ گھنٹہ اُن کا انتظار بھی کر لوں گا۔ الطاف چند منٹوں تک اندرون میں غائب رہے اور پھر انگریزی کے کچھ رسالے مجھے از راہِ کرم دے کر گول کمرے میں بٹھا کر یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ مجھے ایک ضروری کام کی وجہ سے باہر جانا ہے۔ لیکن شیخ صاحب فارغ ہونے کے بعد آپ سے مل لیں گے۔ میں رسالوں کے اوراق الٹ رہا تھا، کہ شیخ صاحب کے ایک اور صاحبزادے ارشاد حسبِ معمول مسکراتے ہوئے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ موضوع شیخ صاحب کی حالت تھا۔ معلوم ہوا کہ گردے کام نہیں کر رہے تھے اور نمک یا شکر (صحیح طور پر یاد نہیں رہا) جسم میں کم ہو گئی ہے اور پنسلین کے ٹیکے لگانے سے جسم پر خارش ہونے لگی تھی۔ اگر ٹیکے بند کرتے ہیں تو مرض بڑھتا ہے۔ اور ٹیکے لگتے ہیں تو کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔

کھانا پینا تقریباً ترک کر چکے ہیں، کیونکہ بھوک نہیں لگتی۔ کھائیں نہیں تو ضعف بڑھتا ہے۔ اور کھائیں تو ہضم نہیں ہوتا۔ غرض خوراک اور دواؤں سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ لاہور کے بڑے بڑے ڈاکٹر کوشش کرنے کے بعد عجز کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شیخ صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ ارشاد نے ہم دونوں کو چائے بنا کر دی۔ پھر اپنے لئے بھی بنائی۔ اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ارشاد کی باتیں سننے کے بعد اور شیخ صاحب کی طویل علالت کو جانتے ہوئے میں متعجب ہو کر شیخ صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ بالکل تندرست انسان نظر آتے تھے۔ سر کے بال بالکل نہیں تھے۔ ان کے چہرے پر ناک ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی وہ غیر معمولی حد پر چھوٹی نظر آ رہی تھی جسم کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی آنکھوں کی چمک بدستور تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اب بھی آنکھیں بھینچ بھینچ کر مسکراتے تھے۔ اور ہلکے ہلکے فرمائشی قہقہے لگاتے تھے۔ ان کی عمر اس وقت ستر سال سے متجاوز تھی۔ لیکن ابھی تک اس طویل علالت کے باوجود بظاہر ان میں کوئی نقاہت نہ تھی۔ چہرہ خاصہ نکھرا ہوا تھا۔ اور ان کی آواز کا نشیب و فراز بدستور ملائم اور تحکمانہ تھا۔ اور جب میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ تو کہنے لگے

"آپ میری علالت کی تفصیلیں تو سن ہی چکے ہیں۔ میرا کھانا پینا ترک ہو چکا ہے۔ دوا سے کسی طرح آرام نہیں۔ نیند کم ہو گئی ہے۔ لیکن بظاہر میری حالت خراب نظر نہیں آتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابھی تک مختلف مجالس میں میری حاضری کے لئے لوگوں کے تقاضے بدستور جاری ہیں۔ حالانکہ میں اب اپنی آنکھوں سے لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ مثلاً آج ہی صوفی تبسم کے ہاں سے یہ تقاضا پہنچا ہے۔ کہ آج ایران سے علامہ تقی فلسفی آئے ہیں۔ اور ان کے اعزاز میں گورنمنٹ کالج میں ایک مجلس منعقد ہو رہی ہے۔ جس میں میری شمولیت ضروری ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں اس قابل کہاں ہوں کہ اب کہیں آ جا سکوں۔"

اور یہ کہہ کر آپ مسکرانے لگے۔ یہ تبسم ان کی سفید مونچھوں سے پھیلتا ہوا ان کی آنکھوں تک جا پہنچا۔ جن کو وہ اس تاثر کے عالم میں تقریباً بند کر لیا کرتے تھے۔ "چو مرگ آید تبسم بر لب اوست" کی تصویر تو میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لیکن مصائب و آلام اور علالت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے شیخ صاحب کو اکثر متبسم دیکھا۔ میں نے اس بیماری سے تقریباً دس سال پیشتر انہیں ایک دفعہ بہت تکلیف میں دیکھا۔ میں نے اطلاع کرائی تو لیڈی صاحبہ مجھے بلا کر ان کے شب خوابی کے کمرے میں لے گئیں۔ جہاں آپ دراز ہو کر لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دوست کے لئے ان سے چند کلمات خیر لکھوانے تھے۔ اور میں نے ملنے سے پہلے ایک عریضہ میں اپنی غرض کی تصریح کر دی تھی۔ جب میں نے انہیں اس عالم میں دیکھا تو میری زبان بند ہو گئی۔ ان کے دائیں بازو کے نیچے ایک بہت بڑی گہیرالی نکلی ہوئی تھی۔ اور وہ درد سے بے تاب تھے۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور اپنی بیماری کے ذکر سے احتراز کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر خود ہی کہنے لگے۔ آج صبح درد میں کچھ کمی تھی۔ میں نے محمود کے متعلق پبلک سروس کمیشن کو اسی وقت لکھ دیا تھا۔ میں نے تکلیف دہی کے لئے معذرت کی۔ کہنے لگے زندہ انسان کو تو بہر صورت زندوں کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ خواہ اس کے ذاتی مصائب کی تعداد کتنی اور کیفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر ایک لطیف سا قہقہہ لگایا۔

اس ملاقات میں تیسرا نمبر کہ یہ واقعہ یاد دلایا۔ تو کہنے لگے میں نے ہمیشہ لوگوں کی جائز توقعات کو اپنے فرائض میں شمار کیا ہے۔ کل کا ہی واقعہ ہے کہ ایک صاحب کے متعلق مجھے اس قسم کا ایک خط لکھنا تھا، میں چونکہ خود اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اخبار کسی سے پڑھوا کر سنتا ہوں۔ اس لئے میں نے ان کے والد سے کہا کہ وہ میرے پاس بیٹھ کر رقعہ لکھ لیں تو میں اس پر دستخط کر دونگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

میں نے عرض کیا۔ کہ اب آپ کو آرام کی از حد ضرورت ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ کسی طرح کا بوجھ یا کوفت برداشت نہ کیا کریں۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے علاج تو بڑی آسانی سے تجویز کر دیا لیکن اس پر عمل پیرا ہونا اتنا آسان نہیں۔

میں نے کہا: دیکھئے اب آپ تمام دنیاوی کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ریاض (جو آپ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں) کی شادی بھی کر چکے ہیں۔ اب آپ کو چاہیئے۔ کہ آپ تفکرات سے دور رہیں۔

اس پر آپ نے مجھے مرزا کا لکھا ہوا قصہ سنایا۔ اور کہنے لگے جو آدمی کئی سال سے بغیر کسی آمدنی کے زندگی گذار رہا ہو۔ اسے آپ یہ کس طرح مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو تفکرات سے دور رکھے۔

نہ جانے کیوں اس ملاقات میں مجھے ایک کھٹکا سا لگا ہوا تھا۔ کہ شیخ صاحب سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ اور میں نے ان کی صحت کی دعا کرتے ہوئے ان سے اپنے خدشہ کا اظہار اس انداز میں کیا: "قبلہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہماری دیکھی ہوئی محبوب اور پسندیدہ چیزیں اور شخصیتیں دن بدن کم ہو رہی ہیں۔" میرا اشارہ بھانپ کر آپ نے فوراً جواب دیا: "یہ احساس ہر زمانے میں ہر سوچنے والے آدمی کو رہا ہے۔ میں جب دوسری مرتبہ لندن گیا۔ تو جس مکان میں میں رہتا تھا۔ اس میں ایک لارڈ کا لڑکا بھی رہتا تھا۔ جو انجینئر تھا۔ اس کا باپ نہ صرف لارڈ تھا۔ بلکہ برطانوی سیاسیات میں ایک معروف شخص تھا۔ میں نے ایک دن اس سے کہا۔ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگلستان میں دن بدن اہم شخصیتوں کی کمی ہو رہی ہے۔ کم از کم مجھے اس وقت اتنے اور اتنے بڑے آدمی اس وقت لندن میں نظر نہیں آتے۔ جتنے اس وقت تھے۔ جب اس صدی کے آغاز میں میں حصول تعلیم کے لئے یہاں آیا تھا۔ انجینئر نے مسکرا کر کہا۔ کہ آپ کا اندازہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی انگلستان میں اہم شخصیتوں کی کمی نہیں۔ لیکن آج سے ربع صدی قبل ہر بڑا آدمی سیاست کو پیشے کے طور پر اختیار کرتا تھا۔ اور سیاست گاہے گاہے ورثے کے طور پر بھی ملتی تھی۔ لیکن اب زندگی نے عظمت کے کئی اور دروازے بھی کھول دئے ہیں۔ مثلاً میرا باپ ایک مشہور سیاستدان ہے لیکن میں نے اپنے رجحان اور میلان کو دیکھتے ہوئے انجینئر بننا پسند کیا ہے اور اس پیشے میں مجھے اس قدر کامیابی اور ناموری حاصل ہوئی ہے کہ مجھے اب حکومت مصر کا مشیر بنا کر عنقریب مصر جا رہا ہوں۔ اور مجھے اس کام کے لئے بہت معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔ سو بات یہ ہے کہ اب یہاں بھی نیک انسان زندگی کی مختلف لیکن اہم شاہراہوں پر چل کر ناموری حاصل کر رہے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک آدمی اقبال مرحوم ہی بنے"

میں نے پھر کہا: "لیکن معذرت کیجئے کہ اقبال کا خلا تو کسی طرح پورا نہیں ہوا۔ اور مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید ہے اسی طرح جیسے آپ کی شخصیت کی مثال ہمیں آج تک نہیں ملی۔"

آپ نے فرمایا " یہ آپ کا حسنِ عقیدت ہے۔ ورنہ یہ دنیا اچھے آدمیوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ دُنیا کبھی بھلے اور اچھے آدمیوں سے خالی نہیں رہے گی۔ ورنہ اس کے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً آپ اپنی ماضی قریب کی تاریخ کو ہی دیکھ لیجئے۔ جب انگریز اور ہندو دونوں آپ کی ہستی کے درپے آزار تھے تو اللہ تعالیٰ نے قوم کو قائدِ اعظم عنایت فرما دیئے کشمیر کا جھگڑا شروع ہوا تو آپ پریشان ہو رہے تھے۔ کہ یو۔ این۔ او میں آپ کی وکالت کون کرے گا تو آپ کو ظفر اللہ مل گئے غرض اسی طرح سے یہ تسلسل اور تواتر قائم رہتا ہے "

میں خاموش ہو گیا جس آدمی کی موت کے متعلق نہ صرف آپ سوچ رہے ہیں بلکہ اس سے دبی زبان میں کہہ رہے ہوں کہ تو مرنے والا ہے اور چند دن کا مہمان ہے اس سے ماضی اور مستقبل کے متعلق اس قدر امید افزا باتیں سننے کے بعد آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں!

میں غالباً ڈھائی گھنٹے آپ کے پاس بیٹھا رہا اور اس کے بعد میں نے رخصت چاہی۔ میری خواہش تھی کہ میں شیخ صاحب کو اندرون تک پہنچا آؤں۔ چنانچہ میں نے سہارا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اور آپ نے سمجھا کہ میں مصافحہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے السلام علیکم کہا۔ میں نے جواب عرض کر کے کہا کہ میں آپ کو اندرون تک پہنچا آؤں۔ لیکن آپ نے خفت آمیز لیکن بارُعب انداز میں انکار کر دیا۔ میں نے پھر سلام عرض کیا۔ اور آپ جواب دے کر عقبی کمرے کے اس دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں سے آپ داخل ہوتے تھے۔ زنانخانے میں کچھ خواتین بہت انگیز انداز میں قہقہے لگا رہی تھیں۔ جن کی آواز گول کمرے تک آ رہی تھی شیخ صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے میں ابھی گول کمرے میں کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی یہ کہہ کر ہنس رہا ہے کہ " تم نے کون سی نئی بات کہہ دی۔ کہ تمہاری محبوب شخصیتیں دن بدن کم ہو رہی ہیں " شیخ صاحب اب دوسرے کمرے سے آگے بڑھ گئے تھے۔ دروازوں کے پردوں سے نظر آتا ہوا ان کا متحرک سایہ بھی آہستہ آہستہ میری نظر سے دور ہو چکا تھا۔ اور میں کھڑا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ شیخ صاحب ہمیشہ گول کمرے کا دروازہ کھول کر اور مجھے برآمدے میں باہر نکال کر رخصت کیا کرتے تھے۔ لیکن آج پہلی مرتبہ وہ مجھے گول کمرے میں کھڑا چھوڑ کر چل دیئے اور پھر جیسے کسی نے مجھ سے کہہ دیا۔ ہر بار وہ تمہیں رخصت کرتے تھے۔ آج تم اُن کو رخصت کر کے جا رہے ہو۔ اور پھر مجھے اس کمرے سے وحشت آنے لگی میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور برآمدہ پھلانگ کر لمبے لمبے قدم بھرتا ہوا، ٹمپل روڈ پر پہنچ گیا۔ سڑک پر موٹروں، ٹانگوں اور راہروں کی گہما گہمی اور شور میں تمام تاثرات چند ثانیوں میں محو ہو گئے۔ اور گاہے گاہے ٹیلیفون پر خیریت پوچھ لینے کے علاوہ اور کوئی تشویش کبھی محسوس نہ کی۔ لیکن چند ماہ بعد پھر ایک جمعہ (۱۷ مارچ ۱۹۵۰ء) کو ٹھیک اسی جگہ پر میں مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے ایک پارہ ختم کر رہا تھا۔ جہاں میں نے اُن کی پیٹھ کو آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اس جہان فانی سے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو رخصت ہوئے لیکن مجھ سے تین ماہ قبل ہی رخصت ہو چکے تھے۔

میں نے اپنی عمر میں سر عبد القادر سے بہتر مجلسی آدمی کو نہیں دیکھا۔ اُن کی علمی اور ادبی خدمات کے متعلق وقت اور محقق فیصلہ کریں گے۔

(سلطہ ۱۳ بروز آپ کا جمعہ تھا .

محمد اسماعیل پانی پتی

سر عبدالقادر کی ایک اہم خصوصیت

ایسے بزرگ انسان جو گوناگون خوبیوں اور اوصاف کے حامل ہوں روز روز دنیا میں نہیں آیا کرتے۔ مادر گیتی سینکڑوں اور ہزاروں جگر کاٹتی ہے تب کہیں ایک شخص ایسا پیدا ہوتا ہے جس پر تاریخ فخر کر سکتی ہے۔ القصہ شیخ عبدالقادر ایسے ہی نازش فرزندان تاریخ تھے۔ اوراق آئندہ کے صفحات میں مرحوم کے بہت سے فضائل و محامد گنائے جائیں گے اور ان کی بہت سی خوبیاں اور بھلائیاں واضح کی جائیں گی۔ مگر میں یہاں شیخ صاحب مرحوم کی ایک ایسی اہم خصوصیت کا بیان کروں گا جس کی طرف شاید بہت کم لوگوں کی توجہ ہو گی۔

شیخ صاحب مرحوم کی وہ خصوصیت جس کا میں یہاں کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ تھی کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر کسی معاملہ کے متعلق جب ایک رائے قائم کر لیتے تھے تو پھر پورے استقلال کیساتھ اس پر قائم رہتے تھے۔ اور کوئی بھی کوشش ان کو اپنے عزم و استقلال سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ نہ نقصان کا خیال ان کو اپنے ارادے سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ لوگوں کی مخالفت کا خوف اور ابنائے عصر کی دشمنی کا ڈر ان کو اپنے عزم سے باز رکھ سکتا تھا۔ خواہ اس راہ میں کتنے ہی خطرات پیش آنے کا یقین ہو مگر شیخ صاحب ذرا نہ گھبراتے تھے۔ اور سب کچھ برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار رہتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں احمدیوں نے لندن میں ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے ایک مسجد تعمیر کی یہ شہر لندن میں سب سے پہلی مسجد تھی۔ جب ستمبر ۱۹۲۶ء میں مسجد بن کر تیار ہو گئی تو اس کے افتتاح کے لئے مسجد کے امام مولوی عبدالرحیم درد ایم اے نے سلطان ابن سعود والی حجاز سے درخواست کی۔ سلطان ابن سعود نے یہ دعوت بڑی مسرت کیساتھ قبول کی اور اپنے لڑکے امیر فیصل کو مسجد کا افتتاح کرنے کے لئے لندن بھیج دیا۔

جب یہ خبر رائٹر کے ذریعے شائع ہوئی تو ساری دنیا میں بڑے زور شور کے ساتھ لندن کی مسجد کا تذکرہ ہونے لگا۔ چونکہ عام طور پر مسلمانوں کو احمدی فرقے کے لوگوں سے مخالفت ہے لہذا اس موقع پر ایک زبردست طوفان ان کے خلاف کھڑا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مصر کے علمائے کرام کی طرف سے سلطان ابن سعود کو تار بھیجے گئے کہ قادیانیوں کو ساری دنیا کے مسلمان کافر سمجھتے ہیں اور جو مسجد انہوں نے بنائی ہے وہ ہرگز مسلمانوں کی مسجد نہیں ہے آپ اپنے فرزند کو اس کے افتتاح کی اجازت ہرگز نہ دیں ورنہ آپ سارے عالم اسلامی کی ہمدردی کھو بیٹھیں گے۔

سلطان ابن سعود ان تاروں سے ڈر گیا۔ اس لئے اس نے فوراً اپنے لڑکے امیر فیصل کو لندن تار دیا کہ مسجد کے افتتاح کی تقریب میں شریک مت ہونا۔ ادھر امام مسجد نے بڑے زور شور کے ساتھ امیر فیصل کے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اخباروں میں کثرت سے اعلانات

کرا دیئے تھے۔ تمام معززین کو دعوتی رقعے جاری کر دیئے گئے تھے۔ اور ۳ راکتوبر کی تاریخ افتتاح مسجد کی مقرر کر دی گئی تھی۔ مسجد میں مہمانوں کی آمد کا بہت عمدہ انتظام نہایت معقول خرچ کر کے کیا جا چکا تھا۔ اور کام برابر جاری تھا۔ کہ یکایک ۲ راکتوبر کو امیر فیصل نے معذرت کہلا بھیجی کہ میں اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔

امام مسجد یہ غیر متوقع پیغام سن کر بہت حیران رہ گئے کہ اب جبکہ سارا انتظام مکمل ہو چکا ہے تو امیر فیصل کے نہ آنے سے کس قدر جگ ہنسائی ہوگی۔ عجیب اتفاق ہوا کہ اسی وقت شیخ عبد القادر صاحب کا خط امام مسجد کو ملا جس میں تحریر تھا کہ "میں لیگ آف نیشنز کے اجلاس سے فارغ ہو کر جنیوا سے چند دن کے لئے آج ہی لندن آیا ہوں جو مسجد آپ نے لندن میں بنائی ہے اس کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کے لئے کوئی وقت دیں گے"۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ امام مسجد کے دل میں یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے شیخ صاحب کو یہاں بھیجا ہے شاید وہی اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے سلجھا سکیں پس فوراً ٹیلیفون کیا کہ ابھی تشریف لائیں ایک بہت اہم اور ضروری معاملہ کے متعلق آپ سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔ شیخ صاحب اسی وقت مسجد میں گئے اور امام مسجد نے واقعہ کی تمام کیفیت ان سے بیان کر کے عرض کی کہ میں نے اسی لئے آپ کو اس وقت تکلیف دی ہے کہ آپ نہایت نیک نیت اور صلح کل بزرگ ہیں مجھے اس سخت مشکل کے وقت میں بہترین مشورہ دے سکیں گے۔ شیخ صاحب نے قصہ سنا تو فرمانے لگے کہ واقعی اب جبکہ ہر قسم کا انتظام افتتاح مسجد کا مکمل ہو چکا ہے عین موقع پر یہ انکار بہت تکلیف دہ ہے میں پوری اور انتہائی کوشش کروں گا کہ سلطان ابن سعود اپنے حکم کو واپس لے لیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ فوراً اپنی طرف سے سلطان ابن سعود کو ایک ارجنٹ تار بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا کہ بعض لوگوں نے آپ کے فرزند امیر فیصل کو لندن کی مسجد کا افتتاح کرنے کے خلاف تار بھیجے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں بڑے زور سے یہ عرض کروں گا کہ ان کا یہ مشورہ بالکل غلط ہے میں اگرچہ خود احمدی نہیں ہوں مگر اشاعت اسلام کے سلسلہ میں احمدیوں کی کوشش کو بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ مسجد کا افتتاح نہ کرنے سے یہاں اس کا اثر شہزادہ پر برا پڑے گا۔ یہ مسجد دنیا کے ہر مسلمان کے لئے بغیر فرقہ بندی کی تمیز کے کھلی ہوئی ہے اور سرزمین مغرب میں اسلام کی مشعل کو روشن کرنے کا باعث ہے۔ اندریں حالات میں بہت ادب سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ فوراً شہزادہ کو تار برقی حکم بھیج دیں کہ وہ مسجد کا افتتاح کر دیں جس کا اعلان آپ کی منظوری کے بعد یہاں اخباروں میں نہایت کثرت کے ساتھ ہو چکا ہے۔ یہ اجازت دے کر یہاں کی پبلک کو اس عام ناامیدی اور مایوسی سے بچا لیں گے جو شہزادہ کی عدم موجودگی سے ان کے دلوں میں پیدا ہو گی"۔ شیخ صاحب نے اسی تار پر اکتفا نہ کی۔ بلکہ خود شہزادہ کی قیام گاہ پر انہیں سمجھانے کیلئے تشریف لے گئے۔

مگر اس تمام تگ و دو اور کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ رات عجیب چہ میگوئیوں میں بسر ہوئی اور کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا یہاں تک کہ اس دن کی صبح آ پہنچی جس کی سہ پہر کو مسجد کا افتتاح ہونا تھا۔ لیکن کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ افتتاح کون کرے گا اور افتتاح کی تقریب عمل میں بھی آئیگی یا نہیں!

تقریب ۳ راکتوبر کو ۳ بجے سہ پہر ہونی تھی۔ مہمان اور مدعو اصحاب آنے شروع ہو گئے مگر ہر شخص حیران تھا۔ کہ افتتاح کون کرے گا! وقت گزرتا رہا۔ اور امام مسجد کی بے چینی اور پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا کیونکہ سلطان کی طرف سے جواب کا سخت انتظار کیا جا رہا تھا۔

آخر جبکہ تقریب میں صرف ایک گھنٹہ کا قلیل وقفہ باقی رہ گیا تھا، شہزادہ کی طرف سے ایک شخص امام مسجد کے پاس یہ خط لایا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء　　　بخدمت مولوی عبدالرحیم صاحب درد امام مسجد

میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ہز ہائینس شہزادہ فیصل اس مسجد کے افتتاح کی تقریب میں شامل نہیں ہو سکیں گے جو آپ نے تعمیر کی ہے۔ شہزادہ والا تبار کو خود اس بات کا بہت رنج ہے اور وہ دل سے آپ کی کامیابی اور اس عظیم الشان مسجد کے لئے ہر طرح کی برکات اور آبادی کی خواہش کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کی محنت پروان چڑھے۔ میری طرف سے بہت بہت سلام اور نیاز قبول فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش :۔ عبداللہ الدملوجی

اس خط کے آنے پر اگرچہ شہزادہ کی شمولیت کی کوئی خفیف سی امید بھی باقی نہیں رہی تھی۔ مگر آخری اور انتہائی کوشش کا یہی موقع شیخ عبدالقادر نے ہاتھ سے دینا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ جو معزز شخص یہ پیغام لایا تھا۔ اسی کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر شیخ عبدالقادر دوبارہ شہزادہ کے پاس پہنچے۔ اور اسے بہت سمجھایا۔ مگر سب کچھ بے سود رہا۔ اور شیخ صاحب کو ناکام واپس آنا پڑا۔

جب ہر طرح کی انتہائی کوشش کے باوجود شہزادہ کی شمولیت سے مایوسی ہو گئی تو امام مسجد نے شیخ عبدالقادر صاحب سے مسجد کے افتتاح کی درخواست کی۔ بلاشبہ یہ موقع عبدالقادر کے لئے بہت ہی زیادہ صبر آزما اور نازک تھا۔

ان سب خطرات اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے چونکہ شیخ عبدالقادر کے خیال میں احمدیوں کی بنائی ہوئی مسجد کے افتتاح میں کوئی حرج نہ تھا۔ لہذا انہوں نے مخالفت کے طوفان سے قطعاً بے پروا ہو کر افتتاح مسجد کی حامی بھر لی اور بڑی دلیری کے ساتھ وہ کام کر گذرے جس کے کرنے کی جرأت سلطان ابن سعود جیسا فرمانروا بھی نہ کر سکا۔

مسجد کے افتتاح کی رسم نے ایک بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ڈرامہ کی شکل اختیار کر لی۔ افتتاح سے صرف ایک گھنٹہ پہلے امام مسجد کو شہزادہ کے قطعی انکار کا علم ہوا۔ انہوں نے فوراً اس کے متعلق ایک افسوسناک اعلان لکھ کر مسجد کے دروازہ کے باہر لگا دیا۔ مشتاق اور منتظر لوگ دیوانہ وار اس اعلان کو پڑھنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اور ابھی وہ حیرت اور استعجاب کے ساتھ اس اعلان کو پڑھ ہی رہے تھے کہ یکایک سامنے سے موٹر آئی اور وہی شیخ عبدالقادر جو ایک گھنٹہ ہوئے شہزادہ کو سمجھانے اور منانے گئے تھے افتتاح کنندہ کی حیثیت سے احاطہ میں داخل ہوئے امام مسجد اور ان کے ساتھیوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

اب دن کے تین بجے تھے اور یہی وقت مسجد کے افتتاح کے لئے رکھا گیا تھا۔ ٹھیک وقت پر مسجد کا افتتاح ہوا فرق صرف اس قدر تھا کہ مکہ معظمہ کے وائسرائے شہزادہ فیصل کی بجائے ہندوستان کی ایک معزز ترین ہستی خان بہادر سر شیخ عبدالقادر کے حصہ میں بالکل غیر متوقع طور پر یہ سعادت آئی۔ خلاصہ یہ کہ جب تک دنیا میں مسجد باقی ہے شیخ صاحب کا نام بھی یقیناً اس کی تاریخ کے ضمن میں لیا جاتا رہے گا۔ یہ نتیجہ ہے شیخ صاحب کی انتہائی بے تعصبی اور ان کی بہت بڑی اخلاقی جرأت کا۔

اس واقعہ سے یہ بات نہایت واضح طور پر ثابت ہو گئی۔ کہ شیخ عبدالقادر جس بات کو حق سمجھ کر اختیار کر لیتے تھے لاکھ خطرات کے باوجود اس سے کبھی نہ ہٹتے تھے اور پہاڑ کی طرح اپنے عزم میں مستقل رہتے تھے۔ میرے نزدیک ان کی یہ صفت ان کے تمام اوصاف حمیدہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کے قابل ہے۔ افسوس ایسا بے ریا، ایسا مخلص، ایسا بے تعصب ایسا ہمدرد خلائق اور ایسا عالی فطرت انسان قوم میں اب ایک بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا عبدالقادر کو روئے گی اور عرصہ دراز تک روئے گی۔ وہ اس قحط الرجال میں ایک ہیرے کی مانند تھا جو اپنی چمک دمک سے ایک دنیا کو روشنی بخشتا رہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُون

شبیر محمد اختر

عبدالقادر زندہ رہینگے

زندگی اور موت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ کروڑوں انسان پیدا ہوئے۔ زندگی بسر کی اور ایک دن مر گئے۔ یہ ایک عمل ہے جو ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن اس عمل میں کبھی کبھی ایک اچنبھہ ہو جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ موت لازمی ہے ہم یقین کرنا نہیں چاہتے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہی حال سر عبدالقادر کی موت کا ہے۔ انہیں زیرِ زمین دفن کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جی نہیں چاہتا کہ انہیں مرحوم کہا جائے۔

یہ امتیاز کیوں ہے؟ وہ میرے جیسے لاکھوں انسانوں کے محبوب کیوں تھے؟ اس کا جواب ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کو بلند و برتر بنا سکتی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک رخ یہ تھا کہ وہ سرکاری وکیل کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ اور پھر پنجاب کونسل کے صدر ہائی کورٹ کے جج۔ پنجاب کے وزیرِ تعلیم۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر اور وزیرِ ہند کے مشیر رہے۔ نائٹ ہڈ کے خطاب سے نوازے گئے۔ لیکن صرف یہ اعزازات نہ تھے جنہوں نے انہیں محبوب بنایا۔ بلکہ انہیں بڑا بنانے والی صفات طبیعت کی سادگی چھوٹوں پر شفقت اور وضعداری تھی۔ جب ایک عام آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ ماحول اور مرحوم کے دنیاوی مرتبے کے پیشِ نظر مرعوب ہو جاتا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ محسوس کرتا کہ وہ اپنے ایک شفیق بزرگ سے باتیں کر رہا ہے۔ یہی وہ باتیں نہیں بلکہ علم و حکمت کے موتی تھیں جنہوں نے سینکڑوں نوجوان ادیب پیدا کئے۔ انہوں نے کتابیں تو نہیں لکھیں لیکن کتابیں لکھنے والے پیدا کئے۔ یہی وہ کمال تھا جس کے پیشِ نظر وہ ہمارے ممدوح تھے۔

اور پھر ایک دن اسی ممدوح کے متعلق ہوا کے دوش پر یہ خبر فضا میں پھیل گئی کہ وہ اپنے مولا کے پیارے ہو گئے۔ یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ فوت ہو جائیں گے۔ یہ خبر کانوں نے سُنی اور ذہن میں ایک خلا سا نمودار ہو گیا۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ان کی پیدا نہ اور شفیق آواز کانوں نے سنی تھی۔ یہ آواز محفلوں میں، جلسوں میں بار اسی ہوا کے دوش پر بار ہا کانوں تک پہنچی تھی۔ جب ذہن کا خلا کم ہوا تو ایک مسکراتا ہوا چہرا اُبھرنے لگا۔ نورانی چہرہ جسے دیکھ کر سکونِ قلب میسر آتا تھا۔ لب ہلے۔ یہ وہی لب تھے جن سے علم و حکمت کے موتی ٹپکے اور نیاز مندوں کے دامن بھر گئے۔ پھر اچانک ایک سوال پیدا ہوا۔ کیا یہ لب اب ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ محفلیں اس مانوس آواز سے محروم ہو گئی ہیں۔ وہ نورانی چہرہ اب مسکرائے گا نہیں۔ اور اس کا جواب تھا۔ ہاں لیکن اس کے باوجود سر عبدالقادر زندہ ہیں۔ اور اُن کے نقوشِ قدم اَن مٹ ہیں۔

اُن کی موت نے تاریخ کا ایک اور باب اُلٹ دیا۔ وہ سر سید کے زمانے اور زمانہ حال کی درمیانی کڑی تھے، جو کٹ گئی۔ حالی

تمہیں ایک سا تھی ہم سے چھین گیا۔ اقبال کا دوست جُدا ہوگیا۔ اُردو کا محسن چلا گیا۔ لیکن اُس کی یاد کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ جاری ہے۔ اور جب تک وہ جاری ہے عبدالقادر زندہ ہیں۔

وہ باکمال انسان تھے۔ جن کی ساری زندگی دوسروں کی ہمدردی کرتے گزری۔ ادب نوازی کا یہ حال تھا کہ جب بھی طالب علموں نے یا کسی ادبی محفل نے انہیں شمولیت کی دعوت دی۔ اُن سے درخواست کی تو انہوں نے کبھی اُسے ردّ نہ کیا۔ اپنی مصروفیات کے باوجود نوجوانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور جہاں بھی اور جب بھی وہ کسی محفل میں شریک ہوئے تو وہ مجلس باوقار بن جایا کرتی تھی۔ ایسی مجالس کی یادیں زندہ ہیں اور رہیں گی۔

اپنے دور کے بہت بڑے ادیب، قانون دان اور ماہر تعلیم کے علاوہ وہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ اور انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ان کا دل دوسروں کی ہمدردی سے پُر تھا۔ اُن کی سفارشات کا دامن بہت وسیع تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اجنبی تک کو اپنا عزیز کہہ کر اُسے روزگار دلواتے رہے۔ چھوٹے انسانوں کو نواز کر وہ بڑے آدمی بنے۔

جب بھی کوئی نوآموز مصنف اپنی تصنیف لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور دیباچے کے لئے عرض کرتا۔ تو عبدالقادر اپنی ساری مصروفیات کے باوجود اُس کام کے لئے وقت نکال لیتے۔ اور ان تصانیف میں ایسی خوبیاں تلاش کر لیتے جن سے تصنیف کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ ان کی نظر میں حسن تھا اور وہ حسن کو ہر جگہ ڈھونڈ لیتے۔ نہیں بلکہ خود اس میں حسن پیدا کر دیتے۔

زندگی بھر انہوں نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ اُن کے دروازے اتنے کشادہ تھے کہ وہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہ گیا۔ نوجوان لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا گویا ان کی زندگی کا مشن تھا۔ وہ انہیں نیک مشورے دیتے۔ ہمت بندھاتے اور اُن کے دلوں میں وہ ولولے پیدا کرتے۔ جو انہیں زندگی کی شاہراہ پر کامران کرتے رہے۔

زندگی نے انہیں بہت کچھ دیا۔ انہوں نے زندگی کی ان نعمتوں کو ہمیشہ نعمت جانا۔ جوں جوں زندگی نوازتی رہی ان کا دامن دوسروں کے لئے پھیلتا گیا۔ عمر بھر وہ بڑے لوگوں میں رہے۔ بڑے لوگ ان کی موجودگی کو باعث افتخار سمجھتے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں عوام کا خیال رہا۔ دنیاوی جاہ و حشمت کبھی قوم کی ہمدردی کے خیال میں دخل انداز نہ ہو سکی۔ اور جب بھی موقعہ آیا وہ ثابت قدم نکلے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ:۔

"عہدے عارضی ہوتے ہیں۔ مختلف وقتوں میں مختلف لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن بڑا انسان وہ ہے جس کا کردار اسے بلند مرتبہ عطا کرے۔"

شیخ عبدالقادر کی یاد بطور ایک انسان اور ایک سچے ادیب اور صاحب طرز کے ہمیشہ باقی رہے گی۔

قانون قدرت پورا ہوا۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے اسے ایک دن مرنا بھی ہے۔ لیکن عبدالقادر کا ادب زندہ ہے۔ اور وہ اردو کے محسن ہیں۔ اردو اپنے محسن کو زندہ رکھے گی۔ اور ان پر یہ قول صادق آتا ہے:۔

"عبدالقادر وفات پا گئے۔ عبدالقادر زندہ رہیں گے۔"

سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی

آہ شیخ عبدالقادر ادیب شہیر ملک

میں نے پہلی مرتبہ شیخ صاحب کا نام ۹۶-۱۸۹۵ء میں سنا۔ جب اُن کو سر سید مرحوم نے بحیثیت اڈیٹر ابزرور علی گڑھ کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا۔ اسی زمانہ میں لاہور کے کسی اخبار (غالباً پیسہ اخبار) نے لکھا تھا کہ اس عمر میں اب تک کوئی ٹرسٹی مقرر نہیں ہوا۔ شیخ صاحب سب سے کم عمر ٹرسٹی ہیں۔ غالباً اس وقت شیخ صاحب کی عمر ۲۴-۲۵ سال کی ہوگی۔

میں شیخ صاحب سے صرف دو مرتبہ ملا ہوں۔ ۱۰-۱۹۰۹ء میں میرے پاس ہائی کورٹ گوالیار میں ایک مقدمہ تھا۔ موکل چاہتا تھا کہ باہر سے کسی انگریزی دان وکیل کو میرا شریک وکالت کرے۔ اسی زمانہ میں شیخ صاحب نے یورپ سے واپس آکر دہلی میں پریکٹس شروع کی تھی۔ میں شیخ صاحب سے ملا اور انہوں نے گوالیار آنا منظور کر لیا۔ سوئے اتفاق جب موکل شیخ صاحب کو لینے دہلی گیا تو شیخ صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔ موکل ایک دوسرے وکیل کنور بال کرشن کو لے آیا۔ جو شیخ صاحب کے متصل ہی رہتے تھے۔

دوسری مرتبہ دہلی میں جارج پنجم کی دربار نشینی کے موقعہ پر ۱۹۱۱ء میں ملا۔ جب میں پہنچا تو شیخ صاحب حکیم اجمل خاں سے کچھ بہت سی گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا کب آئے اور کہاں ٹھیرے، یہاں قیام کیوں نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اب گوالیار سے جے پور آگیا ہوں۔ وہاں کے چند افسر بھی ساتھ ہیں۔ یہی رائے ہوئی کہ سب کو ایک ہی جگہ ٹھیرنا چاہیے۔ فرمانے لگے کہ میں نے کل ہی آپ کا تذکرہ خمخانۂ جاوید میں پڑھا ہے۔ آپ تو پہلے ہی الف کی ردیف میں آگئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم (شیدا تخلص) نے فرمایا کہ آپ تو شین کی ردیف کے بھی آخر میں آئیں گے۔

میں مئی سال گذشتہ میں ارون ہسپتال میں تھا۔ آنکھ کا اپریشن کرایا تھا۔ میرے محترم دوست مولانا عبدالمجید سالک اڈیٹر انقلاب مہربانی فرما کر مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہسپتال سے نکل کر شیخ صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ساتھ چلوں گا، شیخ صاحب آج کل کچھ بیمار ہیں۔ میں ہسپتال سے نکل کر لاہور کی شدید گرمی برداشت نہ کر سکا دوسرے ہی روز روانہ ہوگیا۔

کیا معلوم تھا کہ شیخ صاحب صرف آٹھ مہینے کے مہمان ہیں۔ اُن سے نہ ملنے کی حسرت ہی رہی۔ اور مجھے عمر بھر اس کا افسوس رہے گا۔

شیخ صاحب نے مخزن کے اجرا سے جو اُردو کی حیات لسانی میں حصہ لیا ہے اور جو خدمات انجام دی ہیں وہ نقش لافانی ہے۔

جب تک اُردو زندہ ہے شیخ صاحب کے احسانات کی متشکر رہے گی۔

مخزن نے بہت سے ارباب سخن کو روشناس ملک کیا۔ اکبر الٰہ آبادی اگرچہ پہلے بھی صوبائی شہرت کے مالک تھے۔ لیکن لسان العصر کی حیثیت سے شیخ صاحب ہی نے متعارف کرایا۔ اکبر مرحوم نے خود اپنے ایک خط میں اس خطاب کو شیخ صاحب کا عطیہ تسلیم کیا ہے۔ غالباً ڈاکٹر سر اقبال کو سب سے پہلے ترجمان حقیقت سے شیخ صاحب ہی نے مخاطب کیا ہے۔ مخزن بیرنگ آغا شاعر اور کتنے ہی شعرا کی نام آوری کا باعث ہے۔

شیخ صاحب کا ذوقِ ادب بہت ستھرا، سلجھا ہوا اور رفیع واعلیٰ ہے۔ ان کی تحریر سے یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی غیر اہل زبان کی تحریر ہے۔ وہ صاف سلیس اُردو لکھتے ہیں۔ ان کی نثر میں غیر ضروری اور بے موقع عربی وفارسی الفاظ کی بھرمار نہیں۔ نہ وہ مولانا نذیر احمد کی طرح عربی نامانوس الفاظ سے اُردو کو گراں بار کرتے ہیں۔ نہ مولانا حالی کی طرح انگریزی الفاظ خواہ مخواہ بے ضرورت لکھتے ہیں۔ میرے نزدیک سرسید مرحوم کی طرزِ تحریر سے ان کی طرزِ تحریر بہت مشابہ ہے۔ اور یہی روش پسند و مقبول اہل ادب ہے۔

خدا مرحوم کی قبر کو موردِ رحمت و مغفرت فرمائے۔

مجلس نامۂ آزاد

شیخ عبدالقادر سے

چند یادگار ملاقاتیں

(انتخاب از مخزن)

شیخ عبدالقادر کی ذات گرامی سے میرا قرب اس امر کا مقتضی تھا کہ ان کی رحلت کی خبر سے مجھے شدید صدمہ ہوتا لیکن صبح صبح جب اخبار میں میں نے یہ خبر پڑھی تو میرے دل کی یہ کیفیت نہیں ہوئی جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوا کرتی ہے۔

میں ایک دوست کے ساتھ ریستوران میں چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک خبر پر نگاہ پڑی: "سر عبدالقادر انتقال فرما گئے" بے اختیار میرے منہ سے نکلا: ایک شاندار باوقار اور کامیاب زندگی آج اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی۔" اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوست نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے اسے بتایا کہ ہمارا ایک سفید ریش تمام زندگی اپنے فرض میں منہمک رہنے کے بعد آج ابدی نیند جا سویا ہے۔ اس کی زندگی پر جس قدر رشک کیا جائے کم ہے۔

شیخ عبدالقادر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ جب آپ انجمن اسلام کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے راولپنڈی تشریف لائے۔

دوسری ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ جبکہ انجمن اردو راولپنڈی کے زیر اہتمام ہم لوگوں نے یوم اقبال منایا۔ شیخ عبدالقادر سے ہم نے صدارت کی درخواست کی۔ آپ تشریف لائے اور دو دن گورڈن کالج اور ڈی۔ اے۔ وی کالج میں اجلاس کی صدارت فرماتے رہے۔

اس اجلاس کے کئی پروگرام تھے۔ ایک نشست میں بہت سے اصحاب نے اقبال کے سات سات پسندیدہ شعر سنائے سب نے اقبال کی کتابوں میں سے شعر منتخب کئے تھے۔ لیکن شیخ عبدالقادر نے سات میں غالباً تین یا چار اشعار ایسے سنائے جو اقبال کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ ان میں سے ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

شب فرقت تصور تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا	تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے[1]

---

[1] یہ شعر اقبال کی ایک قدیم غزل کا ہے جو چھپی تھی مگر بانگ درا میں شامل نہیں۔ اس کا ایک شعر یہ بھی تھا ؎

جفا جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے برا مانا	خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

یہ غالباً اس عہد کی غزل ہے جب علامہ اقبال حضرت داغ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ "مخزن"

اسی تقریر میں آپ نے "ہلال عید" کا ذکر کیا اور کہا کہ اقبالؔ کا اصلی مصرعہ یہ تھا کہ

دردامنِ تو ماو تماشے نہادہ اند

لیکن میرے مشورے پر انہوں نے "در سینۂ تو ماو تماشے نہادہ اند" کر دیا تھا۔

اس کے بعد لاہور میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات میں میں نے کہا بعض لوگ کہتے ہیں حفیظ جالندھری کی کامیابی کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ایک ان کا ترنم اور دوسری آپ کی مربیانہ روش۔ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ بولے تمہارا کیا خیال ہے تم پہلے اپنی رائے ظاہر کرو۔ میں نے کہا۔ میں تو اس خیال کو غلط سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حفیظ ایک بڑا شاعر ہے اور اس کی شاعری میں اتنی جان ہے کہ وہ اپنے پروں سے اُڑ سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا سکے۔ کہنے لگے تمہاری رائے صحیح ہے۔ یہ جو تم نے لوگوں کی رائے کا ذکر کیا ہے یہ حفیظ کے حاسدوں اور مخالفوں کی رائے ہے۔ میں نے حفیظ کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ محض اتنا ہے کہ شاہنامۂ اسلام کا دیباچہ لکھا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ حفیظ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے۔ دیباچے تو میں نے اور بھی کئی شاعروں کے لکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو تیسے دیباچے کی بدولت حفیظ کے مقام تک پہنچے ہیں۔

۱۹۴۶ء میں میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر پنجاب کے ایک روزانہ اخبار کے عملہ میں شریک ہو گیا تھا میرے ذمے اخبار کی نمائندگی کے فرائض تھے۔ اور میں مختلف موضوعات پر مختلف اشخاص سے انٹرویو لیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دن میں شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے اخباری انداز کی بات چیت چھیڑی۔ یہ انٹرویو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اور چونکہ اس انٹرویو میں شیخ صاحب کا کردار ایک نئے انداز سے میرے سامنے آتا ہے۔ لہذا اسے میں جوں کا توں یہاں درج کرتا ہوں۔ یعنی:۔

"مسٹر آصف علی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے پہلا مضمون آپ کے رسالے مخزن میں شائع ہوا تھا۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کے ساتھ آپ کے مراسم بہت قدیمی ہیں۔ لہذا میری خواہش ہے کہ آپ مولانا کے متعلق ہی کچھ ارشاد فرمائیں"۔

آپ نے کہا: "مسٹر آصف علی کا کہنا صحیح ہے۔ مولانا آزاد کا پہلا مضمون واقعی "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ اور وہ مضمون بھی ایک خاص ملاقات کا نتیجہ تھا جو کلکتہ میں ہوئی تھی"۔

راقم نے گذارش کی "تو پھر اسی ملاقات سے داستان کا آغاز فرمائیے"۔ آپ نے کہا "ندوۃ العلما" کلکتہ کی ایک علمی ادبی جماعت تھی۔ اس کی دعوت پر میں تقریریں کرنے کے لئے ۱۹۰۱ء میں کلکتہ گیا۔ مولانا ابوالکلام جن کی عمر اس وقت سولہ یا سترہ برس کی ہوگی

ؔ یہ کتاب اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی اور گھر کے مال و متاع کے ساتھ فسادات کی نذر ہو گئی (آزاد)

ؔ یہ واقعہ شیخ صاحب قبلہ نے مدیر مخزن سے بھی بیان کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام سے اپنی غالباً آخری ملاقات کا دلچسپ حال بھی سنایا تھا۔

ان دنوں وہیں تھے۔ وہ اپنے بھائی ابوالنصر کے ہمراہ جلسہ میں آئے تھے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو میرے پاس آ بیٹھے اور تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "آپ نے خوب لکچر دیا" تقریر میں ایک بچے کی اتنی دلچسپی دیکھ کر میں اس کی جانب متوجہ ہوا اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مختصر سی گفتگو ہی میں مجھے علم ہو گیا کہ بچہ علم و ادب کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔ اور فلسفیانہ طبیعت رکھتا ہے۔ میں نے ان سے "مخزن" کا ذکر کیا اور کہا آپ اس کے لئے مضمون لکھئے۔ جب ملاقات ختم ہوئی اور آزاد صاحب تشریف لے گئے تو مولانا عبدالرحمٰن امرتسری جو میرے ساتھ تھے بگڑ کر کہنے لگے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں ایک لڑکے سے باتیں کرنے لگے" میں نے انہیں بتایا کہ لڑکے کی علمی قابلیت اپنی عمر سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن انہوں نے میری بات کو قابل اعتماد نہ سمجھا۔ ہاں تو انہوں نے مضمون لکھا۔ عنوان تھا (NEWS) اور تشریح اس لفظ کی یوں کی گئی تھی کہ اسے NEWS اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں S'W'E'N یعنی نارتھ، ایسٹ، ویسٹ اور ساؤتھ ہر طرف کی اطلاعات موجود ہوتی ہیں۔ خیال نیا تھا مجھے پسند آیا۔ مضمون مخزن میں شائع ہو گیا۔

مولانا علمی قابلیت تو گھر ہی سے لے کر چلے تھے۔ مگر شبلی مرحوم کی توجہ اور فیضِ صحبت نے ان کی مذہبی تحقیق کے جذبے کو ترقی دی اور طرزِ تحریر میں خوبی اور تاثیر پیدا کر دی۔

مخزن کے زمانہ میں جب میں نے اردو سبھا کی تحریک جاری کی تو مولانا نے مجھے چٹھی لکھی کہ میں اس تحریک کے ایک رضاکار کے طور پر کام کروں گا۔ ان کا یہی ادبی ذوق تھا جو بعد میں "الہلال"، "البلاغ" اور "ترجمان القرآن" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانپور کے حادثہ نے آپ کی طبیعت کا رجحان نیشنلزم کی جانب کر دیا۔ اور آپ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ مولانا کے میرے ساتھ مراسم آج بھی قائم ہیں۔ اور اگرچہ فاصلہ کے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں لیکن اس مسافت سے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میاں افتخار الدین پنجاب کانگریس کے صدر تھے تو مولانا آزاد ہمیشہ ان کے ہاں قیام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ میاں صاحب کی کانگریس سے علیحدگی کے ذرا قبل مولانا یہاں آئے تو حسب دستور ان کے ہاں ٹھہرے۔ دوران میں کہا کہ مجھے سب سے پہلے شیخ عبدالقادر کے ہاں لے چلیے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

جب آپ دورِ مخزن کا ذکر کر رہے تھے تو اتفاق سے ہندی اور اردو کے جھگڑے کا ذکر آ گیا۔ آپ نے کہا یہ جھگڑا ہمارا نہیں بلکہ انگریز کا پیدا کیا ہوا ہے۔ سب سے پہلے یو۔پی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے کے لئے اس جھگڑے کی بنیاد ڈالی تھی۔ بعد میں یہ معاملہ ہندوستان گیر مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ اور آج ہماری بدقسمتی سے آزادی کی راہ میں دیگر رکاوٹوں کی طرح یہ بھی ایک بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔

ہندی اردو کے جھگڑے کا ذکر آپ نے اس درد بھرے انداز سے کیا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور سکون بھی کہ شیخ صاحب نے غیر ذمہ دار لیڈروں کی طرح اس جھگڑے کا الزام ہندوؤں، مسلمانوں کے سر پر نہ تھوپا بلکہ ایک

کامل طبیب کی طرح صحیح طور پر مرض کی تشخیص کی اور بتایا کہ اس سارے مرض کی جڑ غیر ملکی حکومت ہے۔

آپ نے اس سلسلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کا ذکر بھی کیا۔ اور جب ہندوستان کے پُرامن ماضی کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے دل کی کیفیت چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

آپ کی یہ دلی تمنا تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی محبت اور مروّت کا دور واپس آجائے۔ مگر افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور ان کی زندگی ہی میں پنجاب کی سرزمین پر انسانی لہو کا ایک دریا بہہ نکلا۔ اسی پنجاب کی سرزمین پر جہاں آپ نے علم و ادب کی متعدد زندگی بخش نمیاں جاری کی تھیں۔

اگست ۱۹۴۷ء کے حادثات سے آپ کس قدر متاثر ہوئے تھے۔ اور انہیں آپ نے کس نگاہ سے دیکھا تھا اس کا اندازہ ایک خط کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:۔

"...... میں اگست میں اور ستمبر کے ایک حصہ تک شملہ میں تھا۔ ڈاک کی حالت ان دنوں خراب تھی۔ خط نہیں پڑا۔ راہ میں واپس آیا تو آپ کا خط مجھے ملا۔ مگر میں یہاں آکر بیمار ہو گیا۔ اب کچھ اچھا ہوں مگر ابھی زیر علاج۔ آپ کو اس وقت تک عزیزم آزاد کی خیریت معلوم ہو چکی ہو گی۔ یہاں سے تو سب لوگ ان دنوں چلے گئے تھے۔ اور اب تک وہی حالت ہے۔ اب بھی معلوم نہیں پنڈی میں ہیں یا نہیں۔ اگر کالج کھل گیا ہے اور آپ اس میں واپس آگئے ہیں تو مہربانی سے مجھے آزاد کی خیریت کی خبر بھیجئے۔ امید ہے اس اثنا میں وہ آپ سے ملے ہوں گے۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ اور ہمارے بدقسمت ملک پر کیا دور انتشار ہے۔ خدا دلوں کی حالت کو بدل دے اور پھر صلح و امن نصیب ہو......"

اقتباسات

اداریہ ڈان :-

سر عبدالقادر کی موت نے ماضی سے ایک اور رشتہ توڑ دیا۔ وفات سے کئی برس پہلے شیخ صاحب کو زندہ تاریخ سمجھ کر عقیدت کے پھول پیش کئے جاتے تھے۔ ان کے کام کا رہنے والا حصہ ادبی، سماجی اور معاشرتی ہے۔ موجودہ صدی کے اولیں سالوں میں انہوں نے مخزن شروع کیا۔ جو اردو کے ماہوار، ہفتہ وار (Periodical) ادب کی تاریخ میں انقلابی سنگِ میل ثابت ہوا۔ انہیں اردو کے ادب گر کی حیثیت سے اور اردو کے ایک سادہ جاذب اپنے انداز بیان کو قائم کرنے والے کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ ان میں ادبی ذوق کو دریافت کرنے، اسے رائج کرنے اور چمکانے کی ایک یگانہ روزگار صلاحیت موجود تھی۔ اور ان ہی کا رسالہ حالی، اکبر اور اقبال ایسے معاونین پیدا کر سکا۔ اقبال پر ان کا احیائی اثر علامہ کی اوائل زندگی میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ورنہ شیخ صاحب اور ڈاکٹر آرنلڈ کے نہ ہوتے ہوئے بہت ممکن تھا کہ علامہ شاعری چھوڑ چھاڑ یورپ میں کوئی سہ سالہ کورس شروع کر دیتے جن کا انہیں بہت شوق تھا۔ اگلی پود میں سے جن جن پر ان کا اثر ہوا اور جو ان کی ہمت افزائی سے فیضیاب ہوئے تعداد میں اس قدر ہیں کہ ان کا تمیز کرنا اور پہچاننا مشکل ہے۔

شیخ عبدالقادر کی ذات میں بیشمار اور گوناگوں صلاحیتیں تھیں۔ مخزن کے علاوہ وہ آبزرور کے ایڈیٹر بھی تھے جو اس وقت مسلمانوں کا ایک موثر ہفتہ وار اخبار تھا۔ بحیثیت ایک مقرر وہ سنجیدہ تفکرات کو ظرافت میں سمو دیتے۔ ان کے پاس دلچسپ نقعات کا ایک ختم نہ ہونے والا ذخیرہ تھا جو ان کے اپنے تجربے پر مبنی ہوتا۔ اپنے صوبے اور اس سے باہر مدتوں سے لوگ انہیں صدر کی حیثیت سے جانتے تھے جنہیں ان گنت موقعوں پر صدارت کے لئے بلایا جاتا۔ شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو جب انہوں نے زندہ دلانہ تقریر نہ کی ہو۔ ان کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ اور سوانح نگاری میں انہیں اس سے بہت مدد ملی ہوگی۔ انہوں نے کئی بیش بہا مضامین لکھے جو کہ مدتوں سے غیر مطبوعہ ہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ محفوظ رہ گئے۔ انکے ادبی وارث (EXECUTORS) انکے خطوط اور دیگر کاغذات شائع کر کے پبلک کا شکریہ حاصل کرینگے۔ ان کے فرائض کی گارنگ تجلیاں ہمہ گیر خیالات اور ذاتی خوبیوں نے انہیں سوسائٹی کا ستون بنا دیا تھا۔ سرکاری یا غیر سرکاری شاید ہی کوئی ایسا منصب ہو جو انہوں نے حاصل نہ کیا ہو۔ وہ مختلف وقتوں میں ہائی کورٹ کے جج، صوبے کے وزیر، لیجسلیٹو کونسل کے صدر، مرکز کے اگزیکٹو کونسلر، سیکرٹری آف سٹیٹ کے مشیر، لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کے نمائندے۔ انجمن حمایت اسلام کے صدر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی خالی کی ہوئی جگہ پر ہو سکے گی۔

"اُردو کا جِنّاح"

اداریہ ایوننگ نیوز ۱۰ فروری ۱۹۵۰ء :-

اُردو کو عام طور پر مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ گو کئی غیر مسلم بھی اسے بولنے والوں میں سے ہیں۔ جو اسی زبان کی مخالفت سیاسی بنا پر کرتے ہیں۔ اردو سے شیخ عبدالقادر کی ذات میں ایک جناح چھن گیا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس وقت بھی غیر مسلم ان کی انتہائی عزت و قدر کرتے رہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ تحریک پاکستان کے نتیجے کے طور پر جو دشمنیاں اور تنفر پیدا ہوئے ان میں بھی شیخ صاحب فریق ثانی کے حریم دل میں عزت کے ہفت اورنگ پر متمکن رہے۔ یہ بات اس چیز کی بھی شاہد ہے کہ سیاسیات اور تہذیب سے نکلنے والے اختلافات مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

شیخ صاحب نے اُردو ادب کے ارتقا کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اور محترم اُردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم مقام پر متمکن رہیں گے۔

مرنے والے کی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے اُردو کے دلدادگان کو مولانا ظفر علی خاں صاحب کے مشورے پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور ان کے لئے ایک میموریل فنڈ جمع کرنا مناسب ہے جس سے ایک موزوں یادگار بن سکے۔

شیخ عبدالقادر مرحوم :-

گذشتہ ماہ شیخ عبدالقادر کی وفات سے دنیائے ادب میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ شاید کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ آپ کی ذات میں مشرقی وضعداری کی قدیم روایات اور مغربی تہذیب کے ترقی پسند رجحانات ایک نہایت خوشگوار توازن کے ساتھ موجود تھے۔ آپ ملک کے مسلم الثبوت قانون دان بھی تھے۔ اور پنجاب کے مشہور ادارے انجمن حمایت اسلام کے صدر کی حیثیت سے بھی آپ کا مقام کافی بلند تھا۔ شیخ مرحوم کی یہ وہ خوبیاں ہیں جو ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔ مگر ان کی سب سے بڑی خوبی۔ ان کا اردو ادب سے شغف تھا۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے اُردو ادب کا کوئی مورخ اور نقاد کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مرحوم نے رسالہ مخزن کا اجرا اس زمانے میں کیا تھا جب لوگوں کو رسالہ بینی کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس وقت مذہبی رسائل اور جرائد تو موجود تھے مگر کوئی پرچہ نہیں تھا۔ جسے ادبی نقطہ نظر سے بلند معیار رسالہ کہہ سکیں۔ ایسے ہمت شکن ماحول میں

رسالہ جاری کرنا اور اسے وقت کے تقاضے کے مطابق معیار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مرحوم نے مسلسل جدوجہد سے اس رسالے کو کامیاب بنایا۔ جمہوریں رسالہ بینی کا شوق پیدا کیا۔ اور پہلی مرتبہ ان اُدبا سے لوگوں کو روشناس کرایا جن کے نام آج بھی اردو ادب میں کافی نمایاں ہیں۔ مثلاً نادر کاکوروی، درگا سہائے سرور، سید سجاد حیدر اور میر نیرنگ۔ اور یہ شرف مخزن ہی کو حاصل ہے کہ اس کے صفحات پر علامہ اقبال مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، اکبر، شبلی، حالی شرر، صفی اور عزیز لکھنوی کی ذہنی کاوشیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ صرف مرحوم شیخ جی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتنے جلیل القدر شاعر اور ادیب ایک رسالے میں جمع ہو گئے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شیخ صاحب مخزن کا اجرا نہ کرتے تو اردو ادب عوام میں خاص مقبولیت حاصل نہ کر سکتا۔

علامہ اقبال کے ساتھ آپ کے ذاتی روابط ادب کے میدان میں بھی نمایاں رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ علامہ جس زمانے میں حصول تعلیم کے لئے انگلستان میں تھے۔ اور انہیں مغربی اقوام کی جدوجہد دیکھنے کا موقع ملا تھا تو وہ شعر گوئی سے یعنی پردری سے بیزار ہو گئے۔ اور انہوں نے شیخ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا ؎

مدیر "مخزن" سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اس وقت یہ شیخ صاحب ہی کی شخصیت تھی جس نے ان کے مذاق سخن کو زندہ رکھا اور انہیں شعر گوئی سے مایوس ہونے دیا۔ مرحوم کو اُردو ادب سے اتنا گہرا شغف تھا کہ جب تک آپ زندہ رہے اُردو کی بیسیوں انجمنوں کو کسی نہ کسی طرح نوازتے رہے۔ یہاں تک کہ ضعیفی کی آخری منزل میں بھی جب کہ آپ میں چلنے پھرنے کی طاقت ختم ہو رہی تھی آپ نے اُردو کے ایم اے کے طلبا کو اُردو ادب کے متعلق لکچر دیئے۔ اور یہ اُردو سے دلچسپی کی ایک ایسی مثال ہے جو آئندہ مشکل ہی نظر آئے گی۔

مرحوم یقیناً اُردو کے بہت بڑے محسن تھے۔ اور ان کے انتقال سے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچا ہے۔

(اقتباس از اداریہ ماہنامہ "ادب لطیف" مارچ ۱۹۵۰ء)

وضعداری۔ اُن کے اقربا، احباب اور عقیدت مند یہ سمجھے کہ خطرہ ٹل گیا۔ لیکن اصل میں یہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ پچھلے دنوں مرض نے پھر زور پکڑا۔ اور بالآخر ۹ر فروری کی صبح کو رحمتِ الٰہی نے انہیں اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لیا۔ انہوں نے زندگی میں بڑے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ اونچے اونچے سرکاری عہدوں پر بھی رہے لیکن دنیا انہیں زیادہ تر اُردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ ان کی وفات سے بلاشبہ ادب و شاعری کی محفل سونی ہو گئی ہے۔ اور کوئی شخص ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا ——

اُردو کے جلیل القدر ادیب —— شیخ عبدالقادر مرحوم

اُن کی وفات سے ادب و شاعری کی محفل سونی ہو گئی ہے

اُردو اُن کے بے شمار احسانات کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی

۹ر فروری کی صبح کو لاہور کے لوگوں نے تعجب اور افسوس کے ساتھ سنا کہ اُردو کے مشہور ادیب اور انشا پرداز شیخ عبدالقادر کا انتقال ہو گیا۔ شیخ صاحب مدت سے خانہ نشین تھے۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی ادبی اور علمی محفلوں میں نظر آ جاتے تھے۔ خاص طور پر علالت سے پہلے تو وہ اکثر ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے صرف ایک آدھ مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ لیکن ادبِ اُردو پر انہوں نے جو اثر ڈالا ہے۔ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اُردو کا ذوق پیدا کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ ہزاروں تصنیفوں پر بھاری ہے۔ انہوں نے آج سے کوئی پچاس برس پہلے رسالہ "مخزن" نکالا تھا جو اردو ادب کی تاریخ میں روشنی کا نیا باب رکھتا ہے۔ مخزن کا نام زبان پر آتے ہی ہمیں بے اختیار یاد آ جاتا ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی پہلی نظم مخزن ہی میں چھپی تھی۔ شیخ صاحب کو علامہ مرحوم سے جو خصوصیت تھی اس کا اندازہ علامہ اقبال کی اس نظم سے ہو سکتا ہے جس کا عنوان "عبدالقادر کے نام" ہے۔ اور جو علامہ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور کی بہت اچھی نظموں میں سے ہے۔ بانگِ درا کا دیباچہ بھی شیخ صاحب ہی نے لکھا ہے۔ شیخ صاحب کی ادارت میں مخزن نے بہت سے شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کی شاعری مخزن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ مثلاً میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی جو صرف مخزن کے لئے ہی شعر کہتے تھے۔ اور مدت ہوئی شاعری سے تائب ہو چکے تھے۔ نیرنگ کے علاوہ اعجاز ناظر۔ درگا سہائے سرور۔ نادر کاکوروی سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کو دنیا سے روشناس کرانے میں مخزن کا بڑا حصہ ہے۔ مشہور شاعروں اور ادیبوں میں حالی۔ شبلی۔ اکبر۔ شاد عظیم آبادی ناصر نذیر۔ فراق۔ وحشت۔ حسرت موہانی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ابوالکلام آزاد۔ عزیز۔ صفی وغیرہ کے مضامین نظم و نثر بھی مخزن میں چھپتے رہے ہیں۔ خود شیخ صاحب کے بہت سے مضامین مخزن میں چھپے۔ اور اگرچہ وہ بعد میں لکھتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی نثر نگاری

کے شباب کا زمانہ رہی تھا۔ ان کی نثر بڑی بے تکلف اور سیدھی سادی ہوتی تھی۔ جو کچھ کہنا ہوتا تھا بڑے سیدھے سادے انداز میں تصنع اور آورد کے بغیر کہہ ڈالتے تھے۔ ان کی تقریریں خوب ہوتی تھیں۔ جس بے تکلفی کے ساتھ اُردو لکھتے تھے۔ اسی بے تکلفی کے ساتھ بولتے بھی تھے۔ اور ان کے لب ولہجہ سے ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُردو ان کی مادری زبان نہیں۔ وہ بڑے مرنج ومرنجاں اور ہمہ وبا ہمہ قسم کے بزرگوار تھے۔ اس کے ساتھ ان میں پرانے بزرگوں کا سا رکھ رکھاؤ اور وضعداری بھی تھی۔ نوجوان شاعروں اور ادیبوں سے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بڑی شگفتگی تھی۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے اپنی دلآویز گفتگو سے اسے چار چاند لگا دیتے تھے۔ شیخ صاحب کو گُردہ کا پرانا عارضہ تھا۔ پچھلے سال تکلیف بڑھ گئی اور بیچ میں کچھ دن تو حالت نازک رہی۔ لیکن پھر یکایک طبیعت سنبھل گئی۔ اور ان کے اقربا، احباب اور عقیدت مند سمجھے کہ خطرہ ٹل گیا۔ لیکن اصل میں یہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ پچھلے دنوں پھر مرض نے زور پکڑا اور بالآخر ۹ فروری کی صبح کو رحمت الٰہی نے انہیں اپنے وسیع دامن میں لے لیا۔ انہوں نے زندگی میں بڑے بڑے اعزازات بھی حاصل کئے۔ اونچے اونچے سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے۔ لیکن دنیا انہیں زیادہ تر اُردو کے ایک بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی وفات سے بلا شُبہ ادب وشاعری کی محفل سونی ہو گئی ہے۔ اور کوئی شخص ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا۔

فروغ شمع جو اب ہے رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

زندگی کے حالات :۔ آپ قصور کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہاں پائی۔ اسکول کے زمانہ ہی میں آپ کو مولانا گرامی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا گرامی اسی اسکول میں فارسی کے استاد تھے۔ اس کے بعد آپ نے فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا .... گو بی۔اے کے امتحان میں وہ اول رہے لیکن اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس لئے انہیں ملازمت کی تلاش ہوئی۔ اپریل ۱۸۹۵ء میں آبزرور کے اسٹاف رپورٹر کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس ملازمت کا حال خود شیخ صاحب کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

”جب میں کالج سے نکلا تو میری مالی حالت ایسی تھی کہ میں کسی چھوٹی موٹی ملازمت پر مجبور ہو جاؤں۔ محکمہ تعلیم میں مجھے ایک نوکری مل گئی۔ ضلع کے ایک قصبہ میں ایک سیکنڈ ماسٹر چھٹی جا رہا تھا۔ اس کی جگہ عارضی طور پر مجھے دے دی گئی۔ میں بے حد خوش ہوا۔ اور وہاں پہنچا۔ اس زمانے میں یکے ہی چلتے تھے۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں میں بالکل اجنبی تھا۔ اس لئے یکّے سے اترتے ہی ایک صاحب آگے بڑھے اور میری آمد کا سبب پوچھنے لگے۔ جب میں نے اپنی تقرری کا پروانہ دکھایا تو وہ کہنے لگے کہ عجب ستم ظریفی ہے۔ میں ہی وہ سیکنڈ ماسٹر ہوں جو چھٹی پر جا رہا تھا۔ میں نے اپنی چھٹی منسوخ کرالی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی زحمت ہوئی۔ ایک عام نوجوان کو اس قسم کی ستم ظریفی بڑا صدمہ پہنچا سکتی ہے۔ مجھے بھی مایوسی کا احساس ہوا۔ لیکن بہت معمولی۔ میں فطرتاً قناعت پسند ہوں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی مجبوریاں اور ناکامیاں دراصل کسی بڑی کامیابی

انسب ہوتی ہیں۔ اور واقعی اگر مجھے وہ نوکری مل جاتی تو میں زندگی میں کچھ نہ کر سکتا۔ کچھ نہ بن سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک اسکول ماسٹر ــــــ!"

واقعی اس ناکامی میں کتنی بڑی کامیابی پنہاں تھی۔ وہ اگر اس وقت اسکول ماسٹر ہو جاتے تو نہ مخزن نکلتا اور نہ آبزرور کے ایڈیٹر ہوتے! نہ بیرسٹر ہوتے اور نہ ۰۰۰۰۰۰ !

اسی سلسلے میں انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں بھی ایک دلچسپ بات سنائی تھی۔ "جب ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ایم۔ اے پاس کیا تو وہ پی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھے اور پاس ہو گئے۔ ان دنوں میں پی۔ سی۔ ایس ہونا بہت بڑی بات تھی۔ اس لئے وہ بے حد خوش ہوئے۔ لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان کی ایک آنکھ کی بینائی ذرا کمزور تھی اس لئے میڈیکل بورڈ نے انہیں فیل کر دیا۔ اس پر وہ بے حد رنجیدہ ہوئے۔ لیکن فرض کرو کہ انہیں میڈیکل بورڈ فیل نہ کرتا تو وہ کیا ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ڈپٹی کمشنر۔ شیخ محمد اقبال ڈپٹی کمشنر ــــ۔ ڈپٹی کمشنر ــ اور بس!"

بہر حال شیخ عبدالقادر اسکول ماسٹر نہ بن سکے اور آبزرور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اُردو کا مشہور رسالہ مخزن نکالا۔ یہ رسالہ اتنا کامیاب رہا کہ اس دور میں بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ شاید ہی کوئی مجلہ کر سکے۔ مخزن میں اس دور کے تمام نامور شاعر اور ادیب لکھتے تھے۔ مثلاً حالی۔ شبلی۔ میر حسن۔ داغ۔ امیر مینائی۔ حسرت موہانی وغیرہ۔ مخزن کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس نے علامہ اقبال اور ابوالاثر حفیظ جالندھری کو متعارف کرایا۔

۱۹۰۴ء میں آپ انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال بھی وہاں پہنچ گئے۔ ۱۹۰۷ء میں آپ نے تعلیم ختم کی اور ہندوستان واپس آئے۔ لائلپور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ آٹھ سال تک اس عہدہ پر متمکن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ لاہور تشریف لے آئے۔ ۱۹۲۲ء میں چھ ماہ تک لاہور ہائی کورٹ کے جج رہے۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ سے پہلے کونسل کے صدر نامزد کئے جاتے تھے۔ شیخ صاحب کے ایک معمر دوست نے بتایا کہ اس صدارت پر بڑا جھگڑا ہوا۔ پنجاب کے گورنر کسی انگریز کو صدر بنانا چاہتے تھے۔ اور کونسل کے ارکان میں بھی صدر کے چناؤ پر اختلاف تھا۔ لیکن شیخ صاحب کے نام پر سب نے اتفاق کیا۔ اور آپ صدر منتخب ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۲۵ء میں آپ قائم مقام وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اس لئے صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ اس عہدہ کی میعاد ختم ہونے پر آپ جیلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ جینوا گئے۔ اور لیگ آف نیشنز کے ساتویں اجلاس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ واپسی پر آپ حکومت پنجاب کے قائم مقام وزیر مال مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں سکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۳۵ء میں ہندوستان کا نیا آئین منظور ہوا۔ اس لئے آپ سیکرٹری آف سٹیٹ کے ممبر ہو گئے۔ ۳۹ء میں دو ماہ تک حکومت ہند کے قائمقام وزیر قانون رہے۔ اس عہدے سے سبکدوش ہونے پر کچھ عرصہ وکالت کی۔ اور پھر بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر

ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہو گئے۔ چونکہ کافی معمر ہو چکے تھے اس لئے اب کوئی ذمہ داری نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اُردو کی محبت نے چین نہ لینے دیا۔ اور پچھلے سال جب پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج میں ایم۔ اے اُردو کی کلاس شروع کی تو آپ نے اعزازی طور پر اپنی خدمات پیش کیں۔ اور کچھ دنوں تک طلبا کو ان سے تعلیم حاصل کرنے کا بھی موقعہ ملا۔ لیکن ایک تو عمر زیادہ ہو چکی تھی، دوسرے بیماریوں نے آن گھیرا۔ اس لئے طلبا کو زیادہ دنوں ان سے مستفید ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ پچھلے مہینے روز سے ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ دس روز سے ان کے گردے میں بھی سخت تکلیف شروع ہو گئی۔ تکلیف کی شدت سے وہ آخری دنوں میں بیہوش رہے۔ بالآخر آج صبح یعنی ۹ فروری کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

عادات و اطوار:۔ اس پیرانہ سالی اور بڑھاپے کے باوجود آپ کے چہرے پر ہنسی کے مستقل خطوط کھچے رہے۔ وہ جب انتہائی سنجیدہ ہوتے تب بھی یہ محسوس ہوتا کہ ابھی ہنسنے کو ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جب امروز کے اسٹاف رپورٹر نے ان کی صحت کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا کہ کیا آپ اب بھی ورزش کرتے ہیں۔ تو ہنس کر کہنے لگے میں نے ورزش تو کبھی کی نہیں البتہ محفلوں میں قہقہے لگائے ہیں۔۔۔ اور خوب لگائے ہیں۔

ان کے صاحبزادے نے بتایا کہ میں نے انہیں کبھی غصہ میں نہیں دیکھا۔ وہ اگر کبھی ڈانٹتے بھی تو بڑے پیار سے۔ اس کے علاوہ ان میں یہ بڑی اچھی بات تھی کہ گھر میں کتنا ہی شور کیوں نہ ہو وہ اپنا کام کر لیتے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ کوئی مقالہ لکھ رہے ہیں گھر میں ریڈیو بج رہا ہے۔ بچے شور مچا رہے ہیں۔ نوکر آجا رہے ہیں۔ لیکن وہ بڑے انہماک سے اپنا کام کر رہے ہیں شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے زندگی شروع کی تھی۔ اور اخبار نویس کی دنیا میں خاموشی، سکون اور خلوت کا گذر نہیں۔ یادداشت اور تیز حافظہ ہر وکیل کے لئے ضروری ہے۔ یہ صفت شیخ صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ نے کبھی کسی تقریر کے لئے کوئی نوٹ نہیں لیا حتیٰ کہ کسی سالانہ جلسے میں خطبہ بھی لکھ کر نہیں لے گئے۔ حالانکہ اصولاً سالانہ اجلاس میں خطبہ لکھ کر لے جانا چاہئے۔ سیاست کے میدان میں دادا بھائی نوروجی گوکھلے سے متاثر تھے۔ گاندھی جی کی قدر کرتے تھے لیکن ان کے نزدیک گاندھی جی کے فلسفہ پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔ انہوں نے اپنی ایک ملاقات میں بتایا تھا: "سیاسیات میں مجھے کانگرس کے ابتدائی راہنما دادا بھائی نوروجی نے متاثر کیا۔ ان سے میری ملاقات انگلستان میں ہوئی تھی۔ کانگرس کے ہندو رہنماؤں میں جس شخص کی گوناگوں قابلیتوں اور خوبیوں کا میں زیادہ قائل ہوں وہ شخص گوکھلے ہے۔ موت نے اسے قبل از وقت ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید ہندوستان کا سیاسی نظریہ اس سے مختلف ہوتا۔ میں گاندھی جی کی عظمت کا قائل ہوں اور انہیں ہندوستان بلکہ دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں میں ایک مانتا ہوں۔ انہوں نے سیاسی بیداری اور شعور پیدا کرنے میں جو کام کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ مگر ان کا طریق کار ایسا تھا جو ہر شخص اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ان کا شمار ان شخصیتوں میں نہیں کر سکتا جو میری طبیعت پر اثر انداز ہوئیں۔

مذہبی لحاظ سے ایک بزرگ کی ذات بابرکات کو دیکھنے کا نقش پائیدار میرے دل پر ہے۔ انہیں میں نے سفر استانبول کے

زمانے میں دیکھا۔ ان کا نام نامی حضرت شیخ ابو الہدر خانی علیہ الرحمۃ ہے:

وہ سرسید احمد خاں سے متاثر تھے۔ خصوصاً ان کے خطبات اور تقریریں ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا شرر کے بھی مداح تھے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بارے میں ان کی رائے خود ان کی زبانی سنیئے:۔

"علی گڑھ کے نورتنوں میں حالی اور شبلی بھی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں سے میری خط و کتابت رہی۔ دونوں سے بارہا باتیں کیں۔ ان سے پڑھا نہیں۔ مگر آرزو رہی کہ کچھ دنوں ان کی شاگردی کی ہوتی۔ ان لوگوں پر ہمیشہ رشک رہا جنہیں ان سے کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب تھے۔ مگر ایک کا رنگ دوسرے سے جدا تھا۔ حالی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ نظم میں ان کا درجہ مصلح کا ہے۔ نثر صفائی اور تازگی کا نمونہ ہے۔ سلاست اور سادگی کا جو اصول انہوں نے قائم کیا ہے اس پر عمل کر دکھایا ہے۔ ادھر شبلی زندگی کی سادگی کے ساتھ قدرت سے طبع رنگین لے کر آئے تھے۔ اور وہ رنگینی جا بجا ان کی نظم و نثر میں نظر آتی ہے:

لیکن شیخ صاحب نے شبلی کے بجائے حالی کا انداز اپنایا۔ ان کی تحریر میں بھی وہی سلاست، وہی سادگی کارفرما ہے جو ہمیں حالی کے ہاں ملتی ہے۔ بناوٹ سے پاک، صفائی اور تازگی کا نمونہ!

پنجابی میں حضرت وارث شاہ سے متاثر تھے۔ ایک بار آپ نے مخزن ۱۹۰۲ء میں لکھا تھا کہ:۔

"پنجاب میں اگر کوئی شخص شیکسپیئر یا سعدی کہلا سکتا ہے تو وہ بلاشبہ وارث شاہ ہے۔"

داغ، اکبر اور اقبال آپ کے عزیز ترین دوست تھے۔ ان کے بارے میں خود انہی کی رائے سنئے:۔

یہ تینوں حضرات میرے جگری دوست تھے۔ جو وقت میں نے ان کے ساتھ گذارا ہے وہ میری زندگی کے بہترین لمحات میں سے ہے۔ داغ اپنے عہد کے غزل گو شعرا میں ممتاز تھے۔ انہیں دو اور بھی امتیاز حاصل تھے۔ نظام دکن کے استاد کی حیثیت سے انہوں نے جو تنخواہ پائی وہ ہمارے ملک میں کسی شاعر کو صرف شاعری کے عوض آج تک نہیں ملی۔ ان کا دوسرا امتیاز اس سے مختلف ہے۔ یعنی اقبال جیسا شاعر ابتداءِ عمر میں ان کا شاگرد تھا۔"

علامہ اقبال کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "اقبال نے اپنی آتش بیانی سے قوم کے مستقبل پر جو اثر ڈالا اس کو آئندہ نسلیں ہم سے کچھ بہتر سمجھ سکیں گی۔ اقبال نے اپنی زندگی میں بڑا کام کیا۔"

اس وقت شیخ صاحب کی عمر ۸۷ برس کی تھی۔ مگر وفات سے کچھ دنوں پہلے تک ان کے چہرے پر شگفتگی اور تازگی رہی۔ عمر کے مقابلے میں ان کے چہرے پر جھریوں کے بہت کم نشان تھے۔ زندگی کے آخری دن انہوں نے بڑی خاموشی سے گزارے علمی اور ادبی محفلوں سے جو وقت بچ رہتا وہ خاندان کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے باتیں کرنے میں گزارتے۔ ان کی زندگی خاموشی، طمانیت اور سکون کی زندگی تھی۔ وہ بڑے مزے سے باتیں کرتے۔ ان کے لہجے میں جو شفقت اور باتوں میں جو مٹھاس تھی اس سے مخاطب بہت متاثر ہوتا۔

ان کی زندگی اعتقاد، عمل اور خلوص کا آئینہ تھی۔ ان کا لب و لہجہ، شیرینی، لطافت اور پاکیزگی کا نمونہ تھا۔ ان سے جو ایک بار ملا ان ہی کا ہو رہا۔ ان کا مشورہ ہر شخص کے لئے تھا۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ عالم ہو یا مبتدی۔ وہ مایوس دلوں میں اعتماد کی روح پھونک دیتے۔ وہ انہیں راہ سمجھاتے اور ان کی زندگی بنا دیتے۔ ایسے شخص جس قوم یا ملک میں پیدا ہوں اس کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔

ان کے ۲ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ ان کے صاحبزادوں میں بیرسٹر منظور قادر، بریگیڈیر الطاف قادر اور کرنل احسان قادر کافی مشہور ہیں۔ (اقتباس از امروز)

پنجاب کے مردِ بزرگ اور اردو زبان اور ادب کے محسن عبدالقادر رحلت فرما گئے

پچھلی نصف صدی کے ادب کی جیتی جاگتی تاریخ موت کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

لاہور کے مختلف حلقوں کی طرف سے خراجِ عقیدت

(امروز کے نمائندہ خصوصی سے)

۹ رفروری۔ آج صبح پنجاب کی بزرگ شخصیت اور اردو کے محسن شیخ عبدالقادر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی وفات کے احترام میں لاہور کے کالج اور سکول بند ہو گئے۔ ہائی کورٹ بھی بند رہا۔

موت کے پُراسرار دھندلکوں میں گم ہو جانے والا یہ ستارہ تابندہ ستاروں کے اس جھرمٹ کی آخری نشانی تھا۔ جو پاک ہند مسلمانوں کی پچھلی نسل کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی نمائندگی کرتا تھا۔ علامہ اقبال۔ سر فضل حسین سر محمد شفیع اور سر شہاب الدین کی تاریخ کے اس شخص نے سرسید، حالی اور شبلی کی بھی آنکھیں دیکھی تھیں۔ پرانے بادہ کش پہلے ہی ایک ایک کرکے اٹھ گئے تھے۔ بس یہ بوڑھا بادہ کش رہ گیا تھا جو اس محفل کی یاد دلا رہا تھا۔ سو وہ بھی آج خاموش ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر آج سہ پہر کو چار بجے میانی کے قبرستان میں دفنائے گئے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔ پانچ ہزار آدمیوں نے شرکت کی۔ لاہور ہائی کورٹ کے ججوں کے علاوہ گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر بھی شریک تھے۔

شیخ عبدالقادر پچھلے تین مہینے سے درد گردہ میں مبتلا تھے۔ پندرہ بیس دن سے تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ویسے تو عبدالقادر مرحوم پچھلے دور کی قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی سرگرمیوں کو پیش کر رہے تھے۔ لیکن ان کا سب سے نمایاں کارنامہ اردو زبان اور ادب کی خدمت ہے۔ ان کی حیثیت اولاً اردو کے محسن کی ہے۔ ان کے رسالہ "مخزن" نے ایک معمولی رسالہ کی حدود سے

پاکر ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

گورنر پنجاب کا خراجِ تحسین

پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر نے شیخ عبدالقادر کی وفات پر ایک پیغام دیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ پنجاب کے مرد بزرگ شیخ عبدالقادر صاحب کی المناک رحلت کی خبر سُن کر مجھے بہت صدمہ ہُوا ان کی قناعت ہمہ گیر تھی۔ محض اپنی قابلیت کے بل بوتے پر انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر ان کے اٹھ جانے کا غم سب سے زیادہ اُردو ادب کے پرستاروں کو ہوگا۔ اُردو ادب کی انہوں نے بڑی قابل قدر اور رضا کارانہ خدمت کی تھی۔

ہائی کورٹ کا خراجِ تحسین

آج ہائی کورٹ کے بیرسٹروں اور ججوں کے جلسہ میں انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ چیف جسٹس مسٹر محمد منیر نے اپنی تقریر میں کہا کہ شیخ عبدالقادر بلاشبہ اس صوبے کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے تھے۔ آنے والی نسلیں انہیں مدتوں یاد رکھیں گی۔ بار کے کمرے میں جب وہ آتے تھے تو حاضرین میں بہت سے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہوجاتے تھے اور ان کی جادو جگانے والی اور دل موہ لینے والی باتیں سنتے تھے۔ جن میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی تھی۔ اور گہرے سوچ بچار کی جھلکیاں بھی۔

انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک ان کی جج کی حیثیت کا تعلق ہے وہ بار کے ہر ممبر کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ اُردو ادب کی جو مختلف اور عظیم خدمات انہوں نے انجام دی ہیں وہ ان کی ذہانت کا جاوداں ثبوت ہیں۔

آخری ستارہ:۔

انہوں نے آگے چل کر کہا کہ وہ اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس نے پنجاب کے مسلمانوں میں ڈاکٹر محمد اقبال۔ سر فضل حسین سر محمد شفیع اور سر شہاب الدین جیسی بلند پایہ شخصیتوں کو جنم دیا۔ ایک ایک کرکے وہ سب رخصت ہوگئے۔ اب سر عبدالقادر کی وفات کے ساتھ ساتھ عظیم شخصیتوں کی یہ پود...... ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوگئی۔ ان کی وفات سے ہمیں بڑا صدمہ ہُوا ہے۔ لیڈی عبدالقادر، مسٹر منظور قادر اور دوسرے خاندان والوں سے ہم اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ مرحوم کے احترام کے طور پر آج عدالت بند رہے گی۔

فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر عبدالرشید نے کہا کہ سر عبدالقادر کی موت سے اس ملک کے قانون کے پیشہ اور پبلک زندگی کو بہت دھکا لگا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کا خراجِ تحسین

مولانا ظفر علی خاں نے کہا۔ سر عبد القادر کے گذر جانے سے ملت میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے اُسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ سیاست سے قطع نظر ایک بڑا کام جو انہیں زندہ جاوید رکھے گا وہ اُردو زبان کی خدمت ہے۔ مجھے ذاتی طور پر مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ مجھے ان کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ئے بزرگ و برتر انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے فرزندوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے واجب الاحترام والد کے نقشِ قدم پر چلیں۔

پچاس سالہ ادب کی جیتی جاگتی تصویر عابد علی عابد

سید عابد علی عابد پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور نے کہا کہ سر عبد القادر صاحب کی وفات سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ وہ حقیقت میں اردو کی گذشتہ پچاس سال کی جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ پنجاب میں اُردو کی مقبولیت کا سہرا درحقیقت انہیں کے سر ہے۔

ادیبوں کا مربی :- عبد المجید سالک۔

مولینا عبد المجید سالک نے کہا کہ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ادب اُردو کی موجودہ حوصلہ افزا رفتار میں سر عبد القادر مرحوم و مغفور کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لئے کہ وہی تھے جنہوں نے مغربی تعلیم یافتہ طبقے میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اور اپنی پُرکشش شخصیت اور اپنے مشہور رسالہ "مخزن" کے ذریعے سے صدہا ادبا و شعرا پیدا کر دئیے۔ زبان اُردو ان کے بیشمار احسانات کے تشکر سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ دوسرے شعبوں میں بھی ان کی زندگی بے حد مفید اور بابرکت تھی۔ لیکن ادب و زبان کے معاملے میں ان کی شخصیت کی افادی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے انتقال سے ایک ایسی ہستی اٹھ گئی ہے جو مشرق و مغرب کی بہترین خوبیوں کی جامع تھی۔ اللہ تعالےٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

خلیفہ عبد الحکیم صاحب نے کہا۔ شیخ عبد القادر صاحب کی وفات کے باعث ایک عظیم الشان بزرگ کا سایہ پاکستانیوں کے سروں سے اٹھ گیا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں مسلمانوں کی تعلیمی اور علمی جدوجہد میں انہوں نے ہمیشہ ایک قابلِ قدر حصہ لیا۔ ان کی دلچسپیاں ہمہ گیر تھیں۔ اسی وجہ سے شاید ہی کوئی انجمن یا جلسہ ایسا ہو جس کی انہوں نے وقتاً فوقتاً صدارت نہ کی ہو۔

جن بزرگوں نے پنجاب میں لوگوں کے اندر اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کیا ان میں شیخ صاحب کا نام صفِ اول میں آتا ہے وہ علامہ اقبال کے ہم نشین اور عمر بھر کے ساتھی تھے۔ علامہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی طبیعت کا یہ خاص انداز سب کو معلوم تھا کہ وہ کبھی کسی کے کہنے پر اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ لیکن میں نے خود دیکھا ہے کہ جب بھی شیخ صاحب ان سے ملنے کے لئے آتے تو علامہ اقبال نے خود بخود چند اشعار ان کو سنا دیئے۔ وہ انہیں حقیقی سخن فہم سمجھتے تھے۔

بزرگوں کا وہ گروہ جو عملی اور علمی جدوجہد سے قوم کی تعمیر کرتا رہا شیخ صاحب اس گروہ کے آخری فرد تھے۔

قدیم تہذیب کا زندہ مجسمہ۔ صوفی تبسم

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کہا: شیخ عبدالقادر مرحوم قدیم مشرقی تہذیب کا زندہ مجسمہ تھے۔ ان کی شرافت، وضعداری، زندہ دلی اور بزرگانہ شفقت ہر ملنے والے کو مسحور کر لیتی تھی۔ وہ ایک متبحر ماہر صحافت۔ ایک مخلص سیاسی مدبر اور ایک خوش ذوق ادیب تھے۔ ان کی زبان و قلم کی نکتہ طرازیوں سے اس دیس کی ادبی اور علمی محفلیں ہمیشہ رنگین رہیں۔ پنجاب کی سرزمین ان کی ادیبانہ شفقت اور علمی و ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان کے رخصت ہو جانے سے یہاں کی علمی اور ادبی فضا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو آسانی سے رفع نہ ہو سکے گا۔

خلیفہ شجاع الدین:۔

خلیفہ شجاع الدین صاحب نے کہا: شیخ عبدالقادر کی وفات سے قوم کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم و مغفور کی شخصیت کئی لحاظ سے بے مثال تھی۔ بالخصوص مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو تگ و دو انہوں نے کی اس کا احسان قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انجمن حمایت اسلام کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ انہیں خدمات کا اعتراف تھا جس نے جنرل کونسل کو انہیں لائف پریذیڈنٹ منتخب کرنے پر مجبور کیا۔ کارکنان انجمن ہمیشہ ان کے مفید مشوروں اور بروقت ہدایات سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کے دوسرے بڑے تعلیمی ادارے یعنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن میری رائے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جو اُردو ادب کی خدمت سے متعلق ہے۔ اس صدی کے شروع میں انہوں نے لاہور سے رسالہ "مخزن" نکالا جو بجا طور پر یہ فخر کر سکتا ہے کہ وہ تمام ادبی ماہناموں کا پیش رو ہے جو آج کل نکل رہے ہیں۔

آثار التواریخ

١٩٥٠ء

غمِ شیخ

١٩٥٠ء

فخرِ ملک و ادیبِ بزرگ جناب سر عبدالقادر

١٩٥٠ء

نَوَّرَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ مَرْقَدَہٗ بِاَنْوَارِہٖ

١٣٦٩ھ

شریک قادری ہیں غم میں پاکستان و ہندوستان ۔۔۔ ہوئے رخصت جناب شیخ عبدالقادر فاضل
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" ۔۔۔ فدائے دیں، محبِ قوم، صاحب رائے۔ دریا دل
شرف اُن سے سیاحت کو، ثقافت کو، صحافت کو ۔۔۔ ادب میں، علم میں، تنقید میں، تحریر میں، کامل
سرِ لوحِ مزارِ پاک لکھنے کے لئے موزوں ۔۔۔ یہ تاریخیں ہیں "فخرِ اہلِ جنت" "خلد میں داخل"

١٣٦٩ھ ۔۔۔ ١٣٦٩ھ

(٢)

خوش طبع تھے، خوش مذاق عبدالقادر ۔۔۔ جو خوش اسلوبیاں تھیں، ہیں آج کہاں
ہر دل کو عزیز تھا تو اُن کو ہر دل ۔۔۔ کیا کیا محبوبیاں تھیں، ہیں آج کہاں
تاریخ بھی قادری ہے یہ، حق بھی یہی ۔۔۔ "ان کی جو خوبیاں تھیں، ہیں آج کہاں"

١٣٦٩ھ

تحریرِ خامۂ حامد حسن قادری

١٩٥٠ء

سید مقبول حسین احمد پوری

آہ عبدالقادر

حضرت شیخ عبدالقادر بانیٔ مخزن کی رحلت کی خبر معلوم کرکے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنا قرب عطا فرمائے اور ان کے قائم مقام کو جلد بھیجے تاکہ اردو کی دنیا آباد ہے

(مقبول حسین احمد پوری)

پاک دیس کے عبدالقادر تھے میری آنکھوں انجانے
ہمت آن سے رہتے تیار سدا ہر دل کو بڑھانے

لیکن اس ویاکل ہردے میں سدا ہے جانے پہچانے
گونج رہے ہر دیے منڈل میں اُنکے منوہر شبد سہانے

چھوڑ کے یہ مٹی کی مایا، وہ بھی گئے بیکنٹھ بسانے
گونج رہے ہردے کی گپھا میں اُنکے منوہر شبد سہانے

دی شاباشیں پیٹھیں ٹھونکیں دامے درمے کی امدادیں
بہتیروں نے پائیں اُن سے من مانی سب اپنی مرادیں

ہاں یہ سچ ہے جگ جیون میں انکو ملی انمول بڑائی
بنی رہیں گی سخنوروں کے دلوں میں دائم انکی یادیں

پھر بھی انہوں نے وشو یاپی[۱] پریم لگن کس سے نہ لگائی[۲]؛
اپنے گنوں سے وہ پاکستان اور بھارت باہر بھی بکھانے[۳]

اُن کے سہانے ہیل میل نے اپنی جگہ کس دل میں نہ پائی
گونج رہے ہر دیس پردیس میں اُن کے منوہر شبد سہانے

۱؎ ہمہ گیر ۲؎ خندہ پیشانی ۳؎ شہرت پا گئے۔

بشکریہ مخزن

پیغامات

(بذریعہ تار)

میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ کو کس قدر رنج و اندوہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اور ذاتی تجربے کی بنا پر مجھے آپ کے احساسات کا اندازہ ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدائے عزوجل آپ کو صبر عطا فرمائے کہ آپ اس نقصان عظیم کو برداشت کر سکیں

(آپ کی مخلص فاطمہ جناح)

میں نے بے حد دلی رنج کے ساتھ ان کی وفات کی خبر سُنی۔ بیگم کی اور اپنی طرف سے میں مرحوم کے خاندان کو اپنی ہمدردیاں اور تعزیت بھیجتا ہوں۔

(لیاقت علی خاں)

میری دلی ہمدردی آپ لوگوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کی وفات سے مسلم کلچر کا ایک ایسا عظیم دور اختتام پذیر ہو گیا جس کو ان کی ذات نے ممتاز کیا۔ اور جس میں ان کی ذات کو بہت امتیاز حاصل ہوا۔ اس نقصان میں آپ تنہا نہیں۔ خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

بخاری (لیک سکسس)

آج میں یتیم ہو گیا ہوں۔

(حفیظ جالندھری)

میرے دلی جذبات قبول فرمائیے۔

(فضل الرحمٰن)

سر عبد القادر کی وفات سے پاکستان کو نقصان عظیم ہوا۔ میری دلی تعزیت قبول فرمائیے۔

(غلام محمد)

مسلمانوں کے لئے ان کی مسلسل اور طویل خدمات بہت سے دوسروں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی جرأت دلائیں گی۔

(خلیق الزمان)

اس قومی نقصان پر ہمارے دلی رنج و غم کو قبول کیجئے۔ (توصیف لودھی)

شیخ صاحب کی وفات سے بے حد دلی صدمہ ہوا۔ (مرزا و بیگم بشیرالدین محمود احمد)

آپ کے شوہر نامدار کی وفات پر میں سخت رنجیدہ ہوں۔ ہم آپ کے غم میں شریک ہیں۔ (بیگم وسیم)

بے حد صدمہ ہوا۔ آپ کا یہ نقصان ہمارا نقصان ہے۔ (نواب صدیق احمد)

انہوں نے مفید اور پاکیزہ زندگی بسر کی۔ (سردول سنگھ کونشر دہلی)

ہماری دلی تعزیت قبول فرمائیے۔ (جوکھیم رلوا۔ رکن ہندوستان پارلیمان)

ہمارے بزرگ دوست کی موت پر ہماری ہمدردیاں قبول کیجئے۔ (ولسن الزبتھ ہیوم کانپور)

آپ کے والدگرامی کی وفات حسرت آیات سے بے حد صدمہ ہوا۔ ازراہ نوازش میرے قلبی اور مخلصانہ اظہار افسوس کو اس خسارۂ عظیم اور ناقابل تلافی نقصان پر قبول کیجئے۔ خدا کی مرضی ہو کے رہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ آپ کو اس غم کے برداشت کے لئے صبر و سکون مرحمت فرمائے۔ (صادق محمد خاں امیر بہاولپور)

میں ہمیشہ مسرت کے ساتھ ان یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھوں گا جو ان کے قرب سے اور ریاست کے لئے ان کی قیمتی خدمات سے میرے دل میں جاگزیں ہوئیں۔ (نواب مالیر کوٹلہ)

خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (کرنل قریشی بغداد الجدید بہاولپور)

ان کی وفات قوم، احباب، اعزا اور ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

(ملک محمد خان شمس آباد)

شیخ صاحب کی موت سے صدمۂ عظیم پہنچا۔ (رحمٰن، فرسٹ سیکرٹری پاکستان مشن ۔ دہلی)

میرا دل صدمے سے چور ہے ۔ (غلام حسین لغاری)

قوم اور ملک کے لئے شیخ صاحب کی شاندار خدمات کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی ۔

(سر خضر حیات ٹوانہ)

خدا کی مرضی پوری ہوئی ۔ (مصطفےٰ احمد کراچی)

اُن پر اللہ کی رحمتیں ہوں ۔ (شیلا رنبیر دہلی)

لائلپور بار ایسوسی ایشن کی ہمدردیاں قبول فرمائیے ۔ (لائلپور بار ایسوسی ایشن)

تعزیت نامے

اس خسارۂ عظیم میں جو مسلمان قوم کو اور پاکستان کو پہنچا ہے۔ میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔ اور آج کون ہے۔ جو اس غم میں شریک نہیں۔

الحاج خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان۔

پیغام بذریعۂ ٹیلیفون

محترم لیڈی عبدالقادر

مجھے سر عبدالقادر کی وفات کی خبر سُن کر دلی صدمہ ہوا۔ پاکستان ایک عظیم بزرگ سے محروم ہو گیا از راہِ کرم میری دلی ہمدردی قبول فرمایئے۔

آپ کی مخلص بہن

شاہ بانو (بیگم ناظم الدین)

ایک ممتاز ترین ادیب قانون دان اور مشہور معلّم

اپنی طرف سے اور اقبال اکیڈیمی کی بنیادی کمیٹی کے اراکین کی طرف سے میں آپ کے شوہر نامدار کی وفات پر اپنی دلی ہمدردی پیش کرتا ہوں۔ فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیئے۔ کہ ہمیں اُن کی موت کی اطلاع اسی دن موصول ہوئی جس وقت بنیادی کمیٹی کو اقبال پر ریل لیکچرار کی حیثیت سے اُن کی نفسیاتی تعلیم کی توثیق کرنا تھی۔ اُن کی وفات سے پاکستان ایک ممتاز ترین ادیب ایک بڑے قانون دان اور ایک مشہور معلّم سے محروم ہو گیا ہے۔ خدا ان کی رُوح کو ابدی سکون عطا کرے۔

آنریبل فضل الرحمٰن

میری بیوی اور میں نے انتہائی غم کے ساتھ سر عبدالقادر کی وفات کی خبر سُنی۔ میں مشرقی بنگال کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ اور ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ میں اپنے دلی جذبات اور ہمدردیوں کے اظہار کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

(آنریبل چوہدری نذیر احمد خاں)

وزیر صنعت۔ پاکستان۔

مسلم لیگ اور پاکستان کا سچا دوست

سفارت پاکستان۔ طہران

سر عبدالقادر کی وفات حسرت آیات پر میری دلی ہمدردیاں اور مخلصانہ تعزیت قبول فرمائیے۔ مرحوم شیخ صاحب نے مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے بے حد خدمات سرانجام دیں۔ اُردو کے لئے اُن کی خدمات بے بدل ہیں۔ ثقافت اور ادب کے میدان میں اُن کے اقدامات اور اُن کے مسائل کے حل کے لئے اُن کا انداز نظر اُن کے جاننے والوں کے دلوں میں اُن کی عزت و توقیر کو بڑھا دیتا ہے اُن کی وفات نے ایک ایسا خلا چھوڑا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

(ہز ایکسیلینسی راجہ غضنفر علی خاں)

ایک معتمد دوست اور ایک منفرد شخصیت

مجھے آپ کے والد محترم کی وفات کی اطلاع پا کر سخت صدمہ ہوا۔ میں انہیں گذشتہ تیس ۳۰ سال سے جانتا ہوں۔ اور ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ اُن کی موت نے مجھ سے ایک معتمد دوست اور ملک سے ایک منفرد شخصیت چھین لی۔

(ہز ایکسیلینسی دین محمد گورنر سندھ)

ایک نیک انسان اللہ کو پیارا ہوا

میں نے بے حد افسوس کے ساتھ اخبارات میں سر عبدالقادر کی وفات کے بارے میں پڑھا۔ وہ جو اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کے ملنے میں کوئی غم نہیں ہو سکتا، وہ نیک انسان تھے اور انہوں نے امن اور سکون حاصل کیا۔ جو یہ دنیا کسی کو نہیں دیتی۔ لیکن آپ اور آپ کے بچے اُن کی مفارقت کو ضرور محسوس کریں گے۔ آپ کے لئے میری ہمدردیاں شامل حال ہیں

مجھے مسرت ہے کہ سلیم آپ کے پاس ہیں۔ وہ آپ اور آپ کے اعزا کی دلجوئی کریں گے۔ میں دعا گو ہوں۔ کہ خدا آپ پر اپنی خاص عنایتیں اور رحمتیں ارزاں کرے۔

(امرت کور۔ وزیر صحت ہندوستان)

EMBASSY OF PAKISTAN.

ANKARA

۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء

محترمہ لیڈی صاحبہ۔ السلام علیکم

کل یہاں کے ترکی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ کہ مکرم و محترم جناب شیخ صاحب قبلہ نے اس جہان فانی سے رحلت

فرمائی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجعُون۔

آپ کو اس حادثے سے جو غم ہوا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے کہ انتہا درجہ کا غم ہوگا۔ عمر بھر کا ساتھ اور پھر ایسا پُر محبت دل والا اور قابل دماغ والا شوہر۔ صبر کیجئے خدا کی مرضی یونہی تھی۔ سب کو اسی راستے جانا ہے۔ اور آپ کو اور ہم سب کو فخر کرنا چاہیئے۔ مرحوم نے ایسی مرنجان مرنج اور مفید زندگی گذاری۔ خدا اُن کو اُن کی محبت کا اجر دے گا۔ دعا ہے کہ خدا آپ کو ہمت عطا کرے مجھے یقین ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک پبلک کی خدمت کی ہے۔ اب بھی آپ اپنی قوم کی اسی طرح خدمت کرتی رہیں گی جس کے لئے قوم آپ کی ممنون ہے۔ اور رہے گی۔

میری طرف سے جملہ عزیزان کی خدمت میں اظہار ہمدردی کر دیجئے۔ اور ملفوف خط منظور قادر صاحب کو دے دیجئے۔

آپ کا نیازمند

بشیر احمد

شیخ عبدالقادر کی موت کا غم انگلستان اور پاکستان میں یکساں ہے

مجھے اجازت دیجئے کہ میں ہائی کمشنر یو۔ کے متعینہ پاکستان کی طرف سے آپ کے شوہر نامدار کی وفات پر اظہار ہمدردی کروں مجھے یقین ہے۔ کہ آپ واقف ہیں کہ لندن میں انہیں کس محبت اور عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ اور میرا ملک اُن کی بے لوث اور واجب الاحترام خدمات کی اہمیت کا پوری طرح۔ سے اعتراف کرتا ہے جو انہوں نے متحدہ ہندوستان کے نظم و نسق کے سلسلہ میں کونسل کے سیکرٹری آف سٹیٹ کے اور پاکستان کے لئے سرانجام دیں۔ ان کی موت انگلستان میں بھی اسی طرح غم کا باعث ہے۔ جس طرح پاکستان میں۔

(ڈپٹی ہائی کمشنر یو۔ کے پاکستان)

بہترین درجے کا محبِ وطن

سر عبدالقادر کی موت ملک کے قانونی پیشے اور مجلسی زندگی کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ ایک بیدار مغز وکیل عالی دماغ جج، مہذب انسان، زبان دان اور بہترین درجے کے محب وطن تھے۔

آنریبل عبدالرشید

چیف جسٹس فیڈرل کورٹ پاکستان

اپنے جج برادران کی طرف سے میں اس اندوہناک موقعے پر شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے میں شامل ہوں۔ آپ میں سے کئی صاحبان ایسے ہونگے جنہیں شیخ صاحب مرحوم کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہوگا۔ اور جنہیں بخوبی علم ہے۔ کہ ان کا دل و دماغ کن کن اوصاف سے متصف تھا۔ اُن کی فطانت و قابلیت ہمہ گیر تھی۔ اور وہ ان کا بر

میں سے تھے جنہیں آنے والی نسلیں مدتوں یاد کریں گی۔ وہ مجلس وکلاء کے ممتاز رکن تھے۔ اور اس عدالت میں برسوں کامیاب جج رہے
ان کے بار روم میں آتے ہی تمام لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر بعد محسوس کرتے کہ وہ ایک مسحور کن اور جاذب گفتگو سے
محظوظ ہو رہے ہیں۔ جس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی۔ اور مزاح و ادراک سے لبریز برجستہ فقرے بھی۔

بطور جج ہمیشہ بار کے ہر رکن سے توجہ اور مہربانی سے پیش آتے۔ انہوں نے اردو ادب کی ہر طور خدمت کی۔ اور یہ عظیم خدمات
ان کی ادبی فطانت کی ہمیشہ شہادت دیں گی۔ جب تک وہ توانا تھے۔ لاہور کی کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں وہ شریک نہ ہوں
یا جو انکی شرکت کے بغیر مکمل بھی ہو جائے۔ آپ ہر وقت ان سے فی البدیہہ تقریر سن سکتے۔ خواہ وہ اردو زبان میں ہو یا انگریزی میں۔
اور اسی سہولت سے انہیں صدارت پر بھی فوراً مائل کیا جا سکتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ ہندوستان اور اس سے باہر ممتاز عہدوں پر فائز
رہے۔ ان کی عادات موہ لینے والی اور دل محبت و مہربانی سے لبریز تھا۔ اور پنجاب بھر میں آپ کو کوئی ایسا شخص نہ ملے گا۔ جو
یہ کہہ سکتا ہو کہ سر عبدالقادر نے اس کا دل دکھایا تھا۔

وہ اس پود سے تھے جس نے مسلمانوں میں ڈاکٹر اقبال، سر فضل حسین، سر محمد شفیع اور سر شہاب الدین سی عظیم الشان شخصیتیں پیدا
کیں۔ وہ سب رفتگان میں شامل ہو گئے اور سب عبدالقادر کے ساتھ ساتھ کہکشاں بھی۔ ماضی کی تاریک۔ داہیں غائب ہو گئی۔

ہم سب اس اندوہناک حادثے پر لیڈی صاحبہ شیخ منظور قادر اور دیگر افرادِ خانہ کے ساتھ شریک غم ہیں اور ہمدردی
پیش کرتے ہیں جس کا اظہار اس عدالت کے رجسٹرار کی طرف سے انکی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اور یہ عدالت اظہار کے
لئے تمام دن بند رہے گی۔

وہ ہر بزم کو زعفران زار بنا سکتے تھے۔

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے شیخ عبدالقادر مرحوم کی قانونی اور ادبی قابلیت کو سراہتے ہوئے
اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ شیخ صاحب مرحوم مسلمانوں کے اس ہم دوست طبقے سے تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ ہر ممکن دائرۂ علم و
عمل میں خدمتِ ملت کا اہم فرض انجام دیا۔ اُن کا اندازِ گفتگو اس قدر جاذبِ روح تھا۔ کہ وہ اپنی نکتہ رسی اور ظرافت سے ہر بزم
کو زعفران زار بنا سکتے تھے۔

(ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین)

اردو کے ممتاز ادیب مولینا چراغ حسن حسرت نے اپنے بیان میں کہا۔ کہ:-
"شیخ عبدالقادر کی وفات نے محبانِ اُردو کو بہت گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔ اُن ادبی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے
کہا۔ کہ "مخزن" کے ذریعہ بہت لکھنے والوں کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملا۔ اور اقبال، شبلی، حالی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں
سجاد حسین، بلدرم، نیرنگ، نادر کاکوروی اور شاد ایسے ادیبوں اور عالموں نے "مخزن" کو اپنے ذوقِ شعر و ادب کی جولانگاہ بنایا
انہوں نے کہا۔ کہ شیخ مرحوم بے تکلف، سیدھے سادے اور موثر اسلوبِ نگارش کے استادِ کامل تھے۔"

(مولانا چراغ حسن حسرت)

EMBASSY OF PAKISTAN

TURKEY

15 . 2 . 50

میری پیاری خالہ لیڈی عبدالقادر صاحبہ

السلام علیکم۔ کل شام بشیر سفارت کے دفتر سے DAWN اخبار لائے۔ تو شیخ صاحب کے انتقال پر ملال کی اندوہناک خبر پا کر دل کو بہت رنج ہوا۔ صد افسوس ہے کہ ایسے قابل اور قوم کا درد دل میں رکھنے والے بزرگ اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اردو ادب کو انکی وفات سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ ہماری ادبی تحریکوں میں جس قدر دلچسپی وہ لیتے تھے۔ اور ہماری قومی، تعلیمی اور خیراتی تحریکوں میں جو خدمت وہ عمر بھر کرتے رہے۔ قابل صد تحسین ہے۔ ایسی گراں مایہ ہستیاں اب عنقا ہو گئی ہیں۔ اس صدمہ عظیم میں ہماری ناچیز ہمدردی قبول کیجئے۔ بارگاہ ایزدی میں ہماری دعا ہے۔ کہ رب دو جہاں مرحوم کو بہشت بریں میں جگہ دے۔ اور آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

آپ کا خط مجھے ملا جسمیں آپ نے شیخ صاحب کی علالت کا حال لکھا تھا۔ تو اس وقت سے میرا دل فکرمند و پریشان تھا پرسوں میں نے آپ کو پھر خط لکھ کر ڈاک میں ڈالا۔ اُس وقت میں اس بات سے بے خبر تھی کہ شیخ صاحب انتقال فرما گئے۔ ہمارے ترکی آنے سے پہلے وہ ہمیں خود ملنے آئے اور کس شفقت اور محبت سے باتیں کرتے رہے۔ بشیر کے اور میرے دل میں اُنکی قابلیت اور ادب دوستی کی بیحد قدر و منزلت تھی۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں ایک ادبی محفل میں بیٹھے ہوئے کہا کہ شیخ صاحب ہمارے قومی اور تعلیمی ارتقاء اور نشاۃ الثانیہ کی تواریخ جو آپ کے دل و دماغ میں کوزے کی طرح ایک خزانے کی حیثیت سے بند ہے اُسے DICTATE کروائیے۔ اور ایک مسلمان نوجوان کو سیکرٹری رکھ کر لکھوانی چاہیئے۔ کیونکہ یہ تاریخ آپ کی قوم کے لئے ایک بیش بہا دولت ہوگی۔ اس پر جواب میں مجھ سے کہا۔ کہ اب صحت زیادہ گر گئی ہے۔ اور اتنی ہمت باقی نہیں رہی۔

پیاری خالہ صاحبہ صبر و ہمت و حوصلہ اور نماز کا سہارا پکڑیئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ میں صبر کرنے والوں کا ساتھی ہوں۔ خدا آپ کی صحت قائم رکھے۔ آپ ہمیشہ سوشل سروس اور قومی خدمت سرانجام دیتی رہی ہیں آپ کی GENERATION میں کسی خاتون نے خیراتی کاموں میں اس قدر دلچسپی نہیں لی۔ اب ہماری نوزائیدہ مملکت پاکستان کو آپ جیسی خواتین کی خدمات کی بیش از بیش ضرورت ہے۔ اس نصب العین کو تازیست پیش نظر رکھئے۔ دنیا سے انسان آئندہ زندگی یعنی حیات بعد از موت کے لئے نیک کاموں کا ذخیرہ زاد راہ بنا کر لے جا سکے۔ تو یہ بارگاہ ایزدی میں عبادت سے بھی زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ خدا ہم سب کو اس کی توفیق عطا کرے۔ میرا خیال کل سے آپ کی طرف لگا ہوا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ جیسی باوقار۔ اور نیک و عبادت گذار بزرگ ہستی کو ضعیفی میں یہ صدمہ عظیم اُٹھانا پڑا۔ میری طرف سے اظہار افسوس کریں۔ دل چاہتا ہے۔ کہ اس وقت آپ کے پاس بیٹھ کر شیخ صاحب کا ذکر اور اُن کو یاد کریں۔ کیسے با مذاق اور خوبیوں کے مالک تھے۔

آپ کی شریک غم (گیتی آرا)

ایک عظیم غم

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عظیم غم کا اظہار کس طرح کروں۔

(وائی۔ کے۔ پوری)
ڈپٹی ہائی کمشنر آف انڈیا۔ پاکستان

شیخ عبدالقادر کے غم میں اُنکے تمام دوست شریک ہیں

ازراہِ کرم اپنے صدمۂ عظیم میں ہماری دلی ہمدردیوں کو قبول فرمائیے۔ جو ہر اس شخص کا ہے جو مرحوم سے ملا۔

(ایف۔ ڈبلیو۔ بسٹن)
ایڈیٹر سول ملٹری گزٹ لاہور

کنور رانی دلیپ سنگھ کا خراجِ عقیدت

مجھے آج صبح آپ کے عظیم غم کی اطلاع ملی۔ اور میں اس حادثے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتی ہوں۔

ایک نیک شوہر

کل رات میں نے ریڈیو میں شیخ صاحب کے انتقال کی خبر سنی۔ مجھے اور خواجہ بانو کو جیسا سخت صدمہ اس خبر سے ہوا لکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ہم سب دو سال سے مصائبِ انقلاب برداشت کر رہے ہیں۔ مگر مجھے امید نہیں تھی۔ کہ میں مرنے سے پہلے شیخ صاحب کا مرنا سنوں گا۔ میں نے ابھی ایک کتاب "مادرِ ہمدرد" کے نام سے شائع کی ہے۔ وہ روانہ کرتا ہوں۔ جس میں مرحوم کا ذکرِ خیر بھی ہے۔

میں بہت جلد آپ کے نیک شوہر سے جنت میں جا کر ملوں گا۔ خدا آپ کو صبر دے۔

مخلص دُعا گو
خواجہ حسن نظامی۔ درگاہِ حضرتِ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی

بمبئی ۱۷ ۲/۵

محترمہ تسلیم نیاز!

اخبار کے ذریعہ اپنے محترم دوست اور بزرگ اور آپ کے نامور شوہر کے انتقال کی خبر معلوم کر کے بہت صدمہ ہوا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا شیخ صاحب مرحوم کے ہمارے خاندان سے بہت پرانے

مزاج تھے اور وہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے۔ افسوس کہ جس تہذیب اور معاشرت نے اُن کی شرافت اور وضعداری اور انسانی خوبیوں کے افراد پیدا کئے تھے۔ ختم ہو گئی۔ اور جو سانچہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے تکرار کی امید بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ جہاں ایک ذاتی صدمہ ہے۔ وہاں ایک قومی سانحہ بھی ہے۔ میرے اور میرے عزیزوں کی طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیے۔ اور اپنے سب عزیزوں تک پہنچا دیجئے۔

آپ کا شریک غم
خواجہ غلام السیدین

وکٹوریہ مینشنز
وکٹوریہ روڈ کراچی

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۴ھ
۱۱ فروری سنہ ۱۹۵۵ء (شنبہ)

ریاض قادر صاحب

سلام ورحمت! سات فروری کے کرم نامہ کا شکریہ۔ اس کے وصول ہونے سے پہلے ہی حادثہ فاجعہ کی اطلاعیں مل چکی تھیں۔ قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ یعنی ملک و ملت کی طرف سے عرض کرتا ہوں تو دل چاہتا ہے۔ کہ اس ارتحال پر ملال پر صرف سرپیٹ کر بیں نہ کروں۔ بلکہ حاکم بدہن خدا سے شکوہ کروں۔ کہ کیا قلب ناہنجار کے لئے تختۂ مشق ستم سوائے ہمارے کوئی نہیں ملتا؟ مگر جب روح پر فتوح بزرگ محترم مرحوم و مغفور سے رجوع کرتا ہوں۔ تو زبان شکوہ گنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور شرم سے سر اٹھائے نہیں اٹھتی۔ کہ کیوں کو "مردہ" تصور کر کے یہ سب باتیں سوچ رہا تھا؟ اگر وہ صرف ایک "شوہر" تھے۔ یا صرف ایک باپ تھے۔ یا ہم جیسوں کے صرف "سرغنہ" تھے۔ تو جتنا بھی ماتم کیا جائے بجا کہ محض ان عرفی حیثیتوں سے وہ اپنی خالی کی ہوئی جگہ کو دوبارہ پُر نہیں کر سکتے۔ مگر اس طرح کا تخیل تو اُن سے متعلق خود ممدوح الشان کی ہتک کے برابر ہے۔ خدا نا کردہ وہ کیوں مرنے لگے؟ رہتی دُنیا میں بار دو اُن کو زندہ رکھنے کی ضمانت اور اعلیٰ علیین میں خدائے قادر و توانا "بل احیاء ولٰکن لا تشعرون" فرما کر ان کو جاوید زندگی عطا فرما چکا ہے۔ ہمارے "شیخ الشیوخ ادب" زندہ تھے اور زندہ رہیں گے

موت بھی زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے بڑھیں گے دم لیکر

یہ سب ہی مگر جانتا ہوں کہ حق ایں دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج یہاں پر دم بخود ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں مانا کہ ہم آپ کو دیکھ کر غم غلط کرنے کی ناکام سعی کریں گے۔ اور آپ کو صلاح دیجئے کہ اپنے برادران معنوی رسمات قلم جو اُبھر رقم حضرت شکرامی مرحوم کی طرف نگاہ رکھ کر ہمارا ساتھ دیجئے۔ یہ تو ہوا۔ مگر مخدومہ عظمیٰ یعنی آپ کی حضرت والدہ ماجدہ مدظلہا کو بھی تحمل کے لئے کیا کہا جائے۔ کیونکہ وہاں طفل تسلیوں سے کیسے کام چل سکتا ہے؟ کتنی طویل مدت کا ساتھ چھوٹا ہے۔ لہٰذا خود فرض سمجھتا مگر یہی عرض کرنا پڑے گا۔ کہ محترمہ ہی ہمارے لئے مثال قائم فرما سکتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر کسی سورت کی طرف اشارہ

بھی ملدعا اور حد درجہ کی بدمذاقی متصور ہوگا۔ مگر چونکہ اس کا حق ہر طرح ترجیح طلب ہے۔ اور مخدومہ مدظلہا سے زیادہ مدت اس نے ساتھ دیا ہے۔ اس لئے اس کا نام دبایا نہیں جا سکتا۔ اور عرف عام میں اس مانگوں جلی کو "اردھ" کہتے ہیں۔ اس نے پورے ضبط و صبر کے ساتھ ممدوح مرحوم کو زندۂ جاوید بنانے رکھنے کا عزم صمیم کر لیا ہے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ آپ کی حضرت والدہ محترمہ مدظلہا کی خدمتِ اقدس میں میری طرف سے تسلیم عرض کر دیجئے۔ اور یہ بھی کہ تلقین صبر کے لئے ہماری ہمت قاصر سہی مگر شرکتِ ماتم میں دل آگے آگے ہے۔

افسوس کہ ہماری آپ کی پہلی مخاطبت ایسے حسرتناک احوال میں شروع ہوئی! امید ہے کہ کبھی کبھی یاد فرمایا کریں گے۔ اور میرے لئے خدمت کی سعادت کا کوئی موقعہ آئے۔ تو تکلف کو راہ نہ دیجئے۔ والسلام

(سید حسن امام عفی عنہ)

شیخ عبدالقادر بہترین آدمیوں میں سے تھے

وہ بہترین آدمیوں میں سے تھے۔ جن سے میں آج تک ملا ہوں۔ اُن کی موت تمام مملکتِ پاکستان کے لئے اور اُن کے بے شمار دوستوں کے لئے ایک بڑا حادثہ ہے۔ جو ملک کے اس پار بستے ہیں۔

(سر یامین خاں جنت نشاں۔ میرٹھ)

ایک ہر دلعزیز انسان

آپ بخوبی اس محبت اور احترام کو جانتے ہیں جو میرے دل میں اُن کے لئے تھے۔ ملک کی تقسیم اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اسکے باوجود کوئی شخص سر عبدالقادر جیسے احباب کو فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اُن شخصیتوں میں سے تھے۔ جن کی یاد ہم مدتِ مدید تک سینوں سے لگائے رکھیں گے۔

(سر تیجا سنگھ چیف جسٹس)

صدیوں کی ارتقاء کا ثمر اور زندگی بھر کا دوست

آج کے اخبارات میں سر شیخ عبدالقادر کی وفات کی اطلاع پڑھ کر مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ ہم نے اُن کی ذات میں ایک انسان کھو دیا ہے۔ جیسے صدیاں پیدا کرتی ہیں۔ اُن میں ثقافت، دانشمندی اور بہترین کردار مرکوز تھے۔ اُن کی دنیاوی کامیابی بقدر استحقاق نہیں تھی۔ لیکن یہ ہمارے لئے باعثِ ندامت ہے۔ کہ ہم اپنے لوگوں کو ان کا صحیح مقام نہیں دیتے۔ اُن کی موت نے میرا ایک زندگی بھر کا دوست چھین لیا ہے۔ میں انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ مشوروں اور مدد کے لئے

ان کی طرف رجوع کرتا تھا۔ آپ کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔ اور میرا نقصان بھی کسی حیثیت سے کم نہیں۔

(سپنورن سنگھ۔ اندر لواس۔ امرت سر)

باپ کا بدل

میرے پیارے بھائی احسان

آج سے ۲۵ سال قبل جب ہم دونوں سکول میں تھے تو شیخ صاحب مرحوم نے مجھے اسی شفقت اور عنایت سے دیکھا جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ اور ۱۹۳۶ء میں میرے والد کی وفات کے بعد مجھ پر وہی نوازشات کیں۔ جن سے مجھے یہی محسوس ہوا۔ کہ میرے باپ کا بدل مجھے مل گیا ہے۔

(عظیم حسین آئی۔سی۔ایس دہلی)

اُن کا نام کبھی نہیں مٹ سکتا

ہم نے شیخ صاحب کی ذات میں نہ صرف ایک ادب کا سرپرست بلکہ ایک حقیقت پرست شریف النفس محبِ قوم کو دیکھا ہے۔ میں اُس زمانے کی یاد کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو ہم نے اکٹھے انگلستان میں گذارا۔ مجھے ایک بات کا یقین ہے اور وہ یہ کہ ان کا نام کبھی نہیں مٹ سکتا۔ اُن کی موت ان کے خاندان کے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے ایک حادثہ ہے۔

(قاضی عیسیٰ بلوچستان)

۵۶ کلفٹن۔ کراچی
مورخہ ۷ مارچ ۱۹۵۰ء

میری محترمہ اور عزیز آنٹی۔ آداب

شیخ صاحب کے گذرنے کی خبر سے مجھے بیحد رنج ہوا۔ اُن کی وفات سے محفل ادو شونی ہو گئی۔ میرے آبا کے زمانے کے لوگ ایک ایک کر کے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بھی چل بسے۔ انہیں دیکھ کر بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ لندن کے زمانے میں جو شفقت اور محبت آپ دونوں نے میرے ساتھ کی ہے۔ وہ کبھی نہیں بھولوں گی۔ شیخ صاحب کی ہمت افزائی سے ہی ہمیں پہلے پہل تقریر کرنے کی جرأت پیدا ہوئی۔ اور جس پہلی پبلک میٹنگ میں میں بولی ہوں۔ وہ ہندوستانی سپیکنگ یونین تھی لیکن ایک میں کیا مجھ سے کئی درجہ قابل لوگوں کو راہِ ترقی پر گامزن کرنے کے بانی مبانی شیخ صاحب تھے۔

ادیب و عالم بہت ہوتے ہیں۔ لیکن دوسروں کا دل بڑھانے اور حوصلہ افزائی کرنے کا مادہ شیخ صاحب ہی میں تھا۔

کیونکہ اُن کا دل سچ مچ دردمند دل تھا۔ آپ دونوں کی زندگی کیسی خوشگوار و قابلِ رشک تھی وہ مجھے معلوم ہے۔ اس یکجائی کے بعد جدائی کتنی شاق ہو گی۔ خدا تعالیٰ آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

شیخ صاحب جیسے آدمی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ مگر اُن کی یاد نہیں جاتی۔ اُن کی شفقت کی یاد ہزاروں دلوں میں باقی ہے۔ اور باقی رہے گی۔ اور اُن کی خدمت کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ ان کی زندگی ایک نمونہ تھی۔ اب ہم ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں

آپ کی مخلص

شائستہ اکرام اللہ

ایک امن پسند انسان

میں نے ابھی ابھی اس حادثۂ عظیم کی خبر سنی۔ ایک نیک انسان نے اپنی دائمی مفارقت سے دنیا کو غریب تر چھوڑ دیا۔ ان وہ پائیداری اور انسانیت تو کہیں ملی ہے۔ جو اُن کے والد کا حصہ تھی۔ بہیات کہ انسان ان کی قدر نہیں کرتا۔ لیکن انہی عقائد اور اعتقادات کی موجودگی اور اُن پر عمل پیرا ہونا ہی دنیا کو امن کی طرف لے جا سکتا۔

جی۔ ڈی۔ سوندھی سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور (نئی دہلی)

"دُنیائے ادب سوگوار ہے"

اُن کی وفات آپ کے گھرانے اور اُن کے بقیہ دوستوں کیلئے ہی غم و اندوہ کا باعث نہیں بلکہ تمام دنیائے ادب اُن کی مفارقت سے سوگوار ہے۔ موت یقینی ہے۔ لیکن خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو شیخ صاحب کی طرح اپنے گراں مایہ کارنامے بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

(دیوان قیمت رائے ریٹائرڈ چیف جسٹس مالیر کوٹلہ)

وہ قوم کے سامنے ایک نصب العین چھوڑ گئے

نہ صرف اہلِ ادب بلکہ قوم ایک بار پھر یتیم ہو گئی۔ اگرچہ آج وہ ہم میں نہیں۔ مگر اُن کی خدمات اُن کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ قوم کے سامنے ایک نصب العین چھوڑ گئے ہیں۔ (رضیہ برلاس۔ لندن)

ایک شریف النفس انسان

اُن کی وفات سے ایک شریف النفس انسان کم ہو گیا ہے۔ جس کے علمی اور ثقافتی مذاق پر ساری قوم بجا طور پر نازاں ہے

(نواب اعتزاز الدین خاں۔ کراچی)

ایک ہمسائے کی حسرت

وہ ہمارے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے جنہیں ہم پاکستان چھوڑ آئے ہیں۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے۔ کہ میں ایسے وقت میں اُن کی خدمت نہ کرسکا جب مجھے کرنا چاہیئے تھی۔

(کرنل جی۔ ایس۔ چاولہ۔ نئی دہلی)

ساری قوم کے لئے حادثۂ عظیم

اُن کی وفات نہ صرف ہمارے بلکہ ساری قوم کے لئے ایک حادثۂ عظیم ہے

(ایم یعقوب ایڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ صحت پنجاب)

عیسیٰ نفس

اب وہ صورت، وہ آواز، وہ خزانۂ علم، وہ کوہ وقار، وہ خضر راہ، وہ مربی، وہ مددگار، وہ عیسیٰ نفس کہاں۔

(نواب جعفر عباس سہارنپور)

ہند و پاکستان کے انسان سوگوار ہیں

مجھے یقین ہے۔ کہ اُن کے غم میں برِ صغیر ہند و پاکستان کے تمام اہلِ نظر انسان سوگوار ہوں گے۔

(شنکر گرسے۔ پریس انفارمیشن بیورو حکومتِ ہند)

ایک محترم قائد اور رہنما

ہمیں اپنے محترم قائد اور رہنما اور آپ کے والدِ محترم کی وفات پر دلی صدمہ ہوا

ملائے بہادر کیپٹن آر۔ آر۔ ایم۔ بھنڈاری کے۔ آئی۔ ایچ
صدر نیشنل سول ڈیفنس سوسائٹی دہلی

گرین روڈ سٹریٹ سیالکوٹ

محترمی! سلام مسنون۔

قبلہ شیخ صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ علمی اور ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ مرحوم کی زندگی ہمارے لئے کئی اعتبار سے شمع راہ ہے۔ محنت، قابلیت، استقلال کی بدولت وہ زندگی کے بڑے بڑے مقام پر پہنچے۔ مرحوم

دینوی وجاہت حاصل کرنے کے باوجود نہایت خوش اخلاق انسان تھے۔ آپ کی شیریں کلامی ہر ایک کے دل کو مسخر کر لیتی تھی اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے آمین اور ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم بھی مرحوم کے نقشِ قدم پہ چل سکیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو اور آپ کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

آپ کا مخلص

اثر صہبائی

محلہ کٹرہ خانخاناں آگرہ

۱۸ر فروری ۱۹۵۰ء

جس کا بدل اب کوئی نہیں ہو سکتا۔

حامد حسن قادری کا اظہارِ رنج

سر عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ کے غمِ وفات اور دردِ فراق میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔ اور ایک میں کیا حقیقت یہ ہے کہ سارے پاکستان کے ساتھ سارا ہندوستان شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُن کے اٹھنے سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس پر ان کے قائم مقام کا کیا امکان ہے۔ جب کہ زمانہ لوٹ کر نہیں آتا۔ اب سے تین چوتھائی صدی پہلے کی تہذیب، تمدن، معاشرت، ذہنیت نے سوسائٹی کا جو سانچہ تیار کر دیا تھا۔ وہی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا۔ تو اب ویسے انسان کاہے میں ڈھلیں۔ سر عبدالقادر مرحوم اسی سوسائٹی کے نمائندے تھے اور بہترین نمائندے۔

میں مرحوم سے عمر میں دس گیارہ برس چھوٹا ہوں گا۔ اس لحاظ سے اسی سوسائٹی کا دیکھنے والا ہوں۔ پھر مجھے سر عبدالقادر کی ہستی کیسی کچھ عزیز ہونی چاہیئے۔ میرا یہ جذبہ تو اس عمر کے ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے مرحوم کی ذات اور ذات سے زیادہ صفات سے تقریباً پچاس برس سے تعلق ہے یعنی مرحوم عالمِ شعر و ادب میں اپنے مخزن کے سبب سے روشناس ہوئے تھے۔ اور میں ۱۹۰۲ء میں "مخزن" کا خریدار اور دلدادہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے سے غالباً ۱۹۱۱ء تک میں مسلسل و متقل "مخزن" کا خریدار رہا۔

"مخزن" کا ابتدائی زمانہ میرا تعلیم کا زمانہ تھا مگر میں کبھی کبھی "مخزن" میں لکھتا رہتا تھا۔ میرے پاس متعدد جلدیں مجلد محفوظ ہیں اور دو تین اس وقت پیشِ نظر ہیں۔

سر سید کے دورِ صحافت کے بعض رسائل کی ترتیب و ادارت میں جو نئی ایجادیں، موزوں اضافے، ضروری وسعتیں پیدا ہوئیں۔ ان کے بانیوں اور موجدوں میں مخزن اور اس کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ مخزن کے ساتھ زمانہ کانپور اور اس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم نے بھی کار نمایاں کئے۔ میں "زمانہ" کا بھی شروع سے خریدار رہا۔ اس کی بھی بہت سی جلدیں میرے پاس موجود ہیں۔ میں "زمانہ" میں بھی ۱۹۰۵ء سے کبھی کبھی لکھتا تھا۔ اس کے بعد میرے قیام کانپور کے سبب سے منشی دیا نرائن نگم سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تو اس میں بہت لکھا۔ شیخ عبدالقادر صاحب سے کبھی ملنے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ حسرت ہی رہ گئی۔

مخزن نے بڑا کام یہ کیا کہ درجنوں لائق اور قابل دماغوں کو لکھنے کا چسکا لگایا۔ اور دُنیائے علم و ادب سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر اقبال کی نظمیں سب سے پہلے "مخزن" ہی کے ذریعے سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچیں۔ ظفر علی خاں۔ میر غلام بھیک نیرنگ

خوشی محمد ناظر۔ مرزا اعجاز حسین۔ شریف حسین و نانک پرشاد۔ طالب بنارسی۔ ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) سجاد حیدر یلدرم وغیرہ شاعر، ادیب، مصنف ان گنت ہیں جن کے علم و فضل کی نسیم جانفزا مخزن سے چل کر عالم عام میں پھیلی مولانا راشد الخیری جن کا پورا نام کوئی جانتا بھی نہیں "محمد عبد الراشد الخیری" کہ کے مخزن میں جلوہ گر ہیں، یعنی تصانیف، شہرت و عظمت سے بہت پہلے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری اب سے ۴۰ سال پہلے کے مخزن میں رونما ہیں۔

مضامین کے تنوع و تفنن سے بھی مخزن پیشوائی و پیش روئی میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ مخزن کے ابتدائی دور میں فلسفہ اور تنقید کی طرف اہل علم و قلم کو زیادہ توجہ نہ تھی۔ افسانہ نگاری بھی خال خال تھی۔ تاریخی، اخلاقی یا خالص ادبی رنگ زیادہ مقبول تھا، ان میں مولوی حبیب الرحمٰن خان شیروانی، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، سید نذیر حسین، شیخ محمد اکرام اور خود شیخ عبد القادر کے مضامین اسوقت بھی جدید و لطیف تھے اور آج بھی یادگار ہیں۔ شیخ عبد القادر صاحب کا طرز تحریر عجب بھی نہایت دلکش تھا۔ عید کو بڑی خستگی پیدا ہو گئی تھی اس خط کے دوران تحریر میں جو میں مجلدات مخزن کی ورق گردانی کرتا رہا۔ تو اپریل سنہ ۱۹۰۵ء کے مخزن میں سر عبد القادر کا مضمون (راشد کی یاد میں) نظر آ گیا۔ اسکے پڑھنے میں ایسا کھو گیا۔ کہ دیر تک خط کی تحریر ملتوی رہی۔ کیسے مزے کی باتیں ہیں اور کیسی پاکیزہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ غرض ——" ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے"!

مرحوم کی وفات کے لئے چند تاریخیں مرتب کر کے بھیجتا ہوں معلوم ہوا ہے کہ اوراق نو مرحوم کی یادگار کے طور پر شائع ہو نیوالا ہے۔ شاید اسکے لئے یہ تاریخیں اور یہ تاثرات قابل قبول ہوں۔ رسید سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیے گا۔

احقر حامد حسن قادری)

وہ جس سے سماج کی جبین تابندہ تھی

کل قبلہ شیخ صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی۔ دل سے بے اختیار ایک آہ نکلی۔ نہ جانے کتنے مناظر نظر کے سامنے پھر گئے شیخ عبد القادر کی موت زندگی کے اس شعلے کی موت ہے۔ جس کی ضو سے فقط شعر و ادب ہی نہیں بلکہ ہمارے سماج کی جبین پر تابندگی تھی۔ اس افراتفری، گیرودار اور تنگ نظری کے زمانے میں شیخ صاحب کی ذات ہمارے لئے ایک بہت قیمتی سرمایہ تھی۔ افسوس کہ آج وہ سرمایہ ہم سے چھن گیا۔

عدم کا ایک شعر اس موقعہ پر یاد آیا ہے۔ کتنا اچھا کہا ہے اس نے ؎

باکمال انسان کا مرجانا ہے نقصان خدا — کچھ خدا کا بھی تو مرگ ناگہاں کھویا گیا

میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپنے بھائی صاحبان کی خدمت میں بھی میری طرف سے اظہار افسوس کر دیں۔

شریک غم

جگن ناتھ آزاد دہلی

مکرمی محترمی جناب کرنل احسان قادر صاحب دام مجدہٗ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

میں نے نہایت افسوس اور دلی رنج کے ساتھ اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ آپ کے والد ماجد سر شیخ عبدالقادر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ دے اور آپ سب لوگوں کو صبر و سکون کی توفیق عطا فرمائے مرحوم ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی تھے۔ اور مرحوم کی ذات گرامی سے وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء کو بیش بہا امداد ملتی رہی اور ندوۃ العلماء کے ہر ایک کام کو بڑی خوشی سے انجام دیتے تھے۔ افسوس ہے کہ ندوۃ العلماء مرحوم کی خدمات سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جزائے خیر دے۔ والسلام

(عبدالعلی ندوۃ العلماء) ۱۱ر فروری ۱۹۵۰ء

اخبارات میں قبلہ و کعبہ عالیجناب شیخ صاحب کی خبر وفات پڑھکر دل پارہ پارہ ہوگیا۔ ان کے خلوص، ادب پروری، غریب نوازی، خدا ترسی اور بے ریائی کے پیش نظر اس عمر میں ان کی مفارقت آپ کی طرح دیگر لاکھوں انسانوں کے لئے ایک نہایت اندوہناک حادثہ ہے۔

کاش ! سیاسی حالات و مشکلات سد راہ نہ ہوتیں تو انکے آخری ایام میں ضرور قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتا۔

آپ کا درلیش بھائی

جیمنی سرشار

ایڈیٹر "نیا جیون" فیروز پور جھاؤنی

ایک متاثر کرنیوالی باوقار شخصیت

میری جب سے اُن سے شناسائی ہوئی میں انہیں ہمیشہ اپنی توت تاثر کا وسیلہ جانتا رہا۔ ایسی نیک اور باوقار شخصیت کی موت ایک قومی حادثہ ہے۔

(این۔ بی۔ سین نئی دہلی)

گورنمنٹ کالج کوئٹہ (بلوچستان)

جناب شیخ محترم کی رحلت کی خبر سنکر بے حد افسوس ہوا۔ آپ کا انتقال ایک قومی اور ادبی نقصان ہے جس کی تلافی مشکل ہے

تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مرحوم سے اور آپ سے کوئٹہ میں ۱۹۴۲ء میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ جبکہ مرحوم نے وہاں کے مشاعروں کی صدارت فرمائی ۔ مرحوم مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے مجھے آپ سے اس صدمے میں دلی ہمدردی

نیاز کیش
آغا صادق۔ لیکچرار گورنمنٹ کالج کوئٹہ

ایک یادگار شخصیت

میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد رکھوں گی جو میں نے شیخ صاحب مرحوم کی معیت میں لندن میں گذارے

(گا نقا ہرسین۔ نئی دہلی)

اُن کا کتبہ یہ ہوگا

"میرے اچھے اور باوفا خادم تونے خوب کیا"

اور اُن کا حسن کردار اُن کی یادگار رہے گا۔

(دنی فرڈکبن۔ وائی۔ ڈبلیو سی۔ اے کراچی)

علمی ارتقا کا ایک باب ختم ہو گیا

اُن کے ساتھ مسلمانان ہند کے علمی ارتقا کا وہ باب ختم ہو گیا ہے جس کا آغاز سرسید اور مولینا شبلی نے کیا تھا۔ اور اس میں شیخ صاحب کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ خدا اُن کی رُوح کو نیک صلہ دے۔ آمین

(میجر اے۔ کے رشید راولپنڈی)

۲۴ر فروری ۵۰ء ۔ مکرمی لیڈی صاحبہ

تسلیم! سر عبدالقادر صاحب کے انتقال کی خبر سُنکر سخت افسوس ہوا۔ آپ کا کیا حال رہا ہوگا۔ کاش میں تعزیت کو جاتی بہن میرا خیال کیجئے۔ سرتاج جا کر قبر میں سو گئے آرام سے اور چودہ سال جدائی میں گذر گئے۔ دل کی ہر حرکت کے ساتھ مرحوم کی یاد تازہ رہتی ہے۔ آپ صبر کیجئے اپنے بچوں کی طرف دیکھئے (اقتباس از خط)

(صغرا ہمایوں۔ مدراس)

ہائے سر عبد القادر

۱۶۔ مگھیان سٹریٹ۔ پرانی انارکلی لاہور۔
۱۰ از فروری ۱۹۵۰ء
مائی ڈیئر ریاض صاحب

شیخ صاحب مرحوم و مغفور کے انتقال پر ملال کی خبر مجھے اخباری ذریعہ سے اپنے بستر علالت پر ملی۔ میرے آنسو بھی اُن کے لاتعداد ماتم داروں کے آنسوؤں کے ساتھ اس سانحۂ عظیم میں شامل فرمایئے۔ مرحوم سے مجھے تعلق خاطر پچھلے پچاس سال سے تھا۔ اور یہ میرے مربی اور مشفق مکرم تھے۔ اُن کے بغیر اُن کے اعزّہ و اقارب اور مداحوں کی زندگی بے مزہ ہے مگر سوائے صبر کے کیا چارہ ہے ؎

جب محو مرسل نہ ہے کون رہیگا

میں عرصہ سے بستر علالت پر دراز ہوں ورنہ دولت کدے پر حاضر ہو کر شریک حلقۂ ماتم ہوتا۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے سوگواروں کو صبر عطا فرمائے۔

شیخ صاحب کے آخری ایام علالت کی خبر اخبار میں پڑھ کر بہت مضطرب تھا۔ آخر وہی ہوا، جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ ہائے سر عبد القادر

سوگوار
سید نذیر حسین ناشاد

پردیسیوں کا بہترین دوست

مجھے آج صبح دلی صدمہ پہنچا۔ سر عبد القادر آج سے بیس برس پہلے لاہور میں میرے بہترین دوست تھے۔ میں اُن کی اُن نوازشوں کو جو انہوں نے ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کے لئے روا رکھیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میرے دل میں ہمیشہ سے اُن کے لئے بیحد عزت اور احترام ہے۔ ایسے انسان کی موت ایک بڑا قومی حادثہ ہوتی ہے۔ پاکستان کو اُن جیسے وسیع النظر اور دوربین انسانوں کی بیحد ضرورت ہے۔

(ڈورتھی گو بند سکس)

محسن اُردو کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا

انہیں بجا طور پر محسن اُردو کہا جاتا ہے۔ اور جب تک اردو زبان قائم ہے۔ کہا جاتا رہے گا۔

شیخ محمد حسن
ریٹائرڈ سینیر سب جج لاہور

محترمہ حضرت لیڈی صاحبہ

آہ کیسے لکھوں، کہ آپ حضرت شیخ صاحب علیہ الرحمتہ کی جدائی پر غمگین نہ ہوں جبکہ خود یہ محسوس کرتا ہوں، کہ ایک شفیق رہبر حیات
چِھن گیا۔

جونہی اس سانحہ ارتحال کی اطلاع ملی میرا سارا گھر مغموم اور ہر دیدہ دیدۂ پرنم تھا حضرت مرحوم کے اعلیٰ صفات ہر ملنے والے
کے دل پر نقش کالحجر ہیں۔ اُن کی فرشتہ صورت ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں پھرتی ہے ان کی فیض رساں محبت کا ہر لفظ کانوں
میں محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت ان کی یاد تازہ رہیگی۔ مجھے ہمیشہ اس کا غم و افسوس رہیگا۔ کہ اس دو سال کے عرصہ میں
ملاقات اور بالخصوص ملاقات سے بھی محروم رہا۔ اور وہ ملاقات جو بہ ضمن "آل انڈیا لا کانفرنس" یہاں ہوئی تھی۔ میری قسمت نے
اس پر آخری ملاقات کی مہر لگادی، خدمت گذاران اردو فی الحقیقت اپنے شفیق رہبر کی سرپرستیوں سے آج محروم ہیں۔ خداوند
قدوس حضرت شیخ عبدالقادر کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

میں اور میرا خاندان آپ کے ساتھ شریک ہے۔

نواب محمود عبدالقدیر سیشن جج وظیفہ یاب
نبیرہ نواب فیروز یار جنگ بہادر حیدرآباد دکن

اُردو کا محسن، قانون دان اور ایک شفیق باپ

دنیا آج اُردو کے محسن، ایک بڑے قانون دان سے محروم ہوگئی اور آپ ایک شفیق باپ سے۔

تابش دہلوی

مخدومہ اسلام

محسن اردو سر شیخ عبدالقادر صاحب بالقابہ کے انتقال پر ملال سے ہماری زبان و ادب کو جو ناقابل تلافی نقصان
پہنچا ہے۔ وہ اپنی جگہ ناقابل برداشت ضرور ہے۔ لیکن صحافی دنیا سے ایک ایسا صاحب قلم رخصت ہوگیا۔ جس کے مشورے ہمارے
لئے مشعل راہ اور جس کے الفاظ ادبی دنیا کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ مرحوم و مغفور نے اردو زبان کو ہمہ گیر اور مقبول
عام بنانے کے لئے جو مساعی کیں۔ وہ رہتی دنیا تک یاد رہینگی۔

گو کہ اب اس نقصان عظیم کے نتیجہ میں صرف احساس غم ہی باقی رہ گیا ہے۔ تاہم اردو زبان ادب اور صحافی دنیا ہمیشہ ہمیشہ
ان کی مساعی جمیلہ پر ناز کریگی۔

میں آپ کے اس غم میں جو صرف آپ ہی کا غم نہیں بلکہ پوری قوم کا ہے ادب دوست ہونے کی حیثیت سے برابر کا شریک ہوں۔ اور
دعا کرتا ہوں کہ خدائے قدوس مرحوم کو غریق رحمت کرے اور آپکو و جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی استقامت بخشے۔ آمین۔

خادم: ثمر جالندھری بی اے مدیر "گرداب" راولپنڈی

پرنسپل حشمت خاں کا اظہارِ عقیدت

(گورنمنٹ کالج جھنگ)

میرے ربع صدی کے مراسم آج ختم ہو گئے۔

قائدِ اعظم کے بعد دوسرا صدمہ

قائدِ اعظم کی وفات کے بعد یہ دوسرا صدمہ ہے جو قوم کو محسوس ہوا۔

سلطان محمود کوئٹہ

چمنِ پاکستان کا دیدہ ور

شیخ صاحب کے انتقال پرملال کی خبر سن کر جو صدمہ ہوا اس کو دل من داند و من دانم و داند دل من۔ شیخ صاحب کی موت پاکستان میں علم و ادب کی موت ہے۔ قیامِ پاکستان کے دن سے کیا کیا صورتیں ہوں گی جو خاک میں پنہاں ہو گئی ہیں۔ نامعلوم کتنی صدیوں میں اُن کی جگہ لینے والے پیدا ہوں گے۔ بقول اقبال ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

خدا معلوم اس چمنِ پاکستان میں شیخ صاحب جیسا دیدہ ور پیدا ہو یا نہ ہو۔

سکینہ محمود

گورنمنٹ کالج فار وومن لائلپور

"وہ ایک انسائیکلوپیڈیا تھے"

شیخ عبدالقادر کے انتقال سے اردو کا ایک بڑا محسن اور ہمارے پچھلے ادبی دور کا ایک بڑا رہنما ہم سے جدا ہو گیا چونکہ مرحوم سے چار بار علی گڑھ اور دہلی میں مجھے نیاز حاصل ہو چکا تھا اس لئے ذاتی طور پر بھی اُن کی شخصیت و ادبی شفقت اور علمی وقار کا قائل تھا۔ اُردو زبان و ادب سے اتنی گہری، سچی اور والہانہ محبت میں نے کم لوگوں میں دیکھی۔ وہ واقعی اردو کے عاشق تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی ہر اچھی، صالح اور ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا۔ وہ ایک انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اس وقت آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ تو بے ساختہ میر کی ایک رباعی یاد آ رہی ہے ؎

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے

جو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق خاموش رہے تو ایک عالم ہوئے

مرحوم پر یہ رباعی صادق آتی ہے۔ اُن کے سکوت میں وقار تھا۔ اور اُن کے تکلم میں پر سکون جادو، خدا انہیں غریق رحمت کرے۔
پروفیسر آل احمد سرور۔ از لکھنو

یہ کہنا کہ وہ مر گئے ہیں اُن کی شان میں گستاخی ہے۔
(عارف بٹالوی) ناظم اعلیٰ دفتر طلوع اسلام۔ کراچی۔

مرحوم نے کبھی پروپیگنڈا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ خاموش کام اور ٹھوس خدمت کرتے رہے۔
(تمکین کاظمی) حیدرآباد دکن)

سب کا دوست

اُن کی موت اُن لوگوں کے لئے حادثۂ عظیم ہے جو دونوں ممالک میں دوستانہ مراسم دیکھنے کے خواہاں ہیں۔
(دیوراج نارنگ دہلی)

ایک غیر مسلم کا خراج عقیدت

قدرت نے ہم کو کتنی دور پھینک دیا ہے کہ ایسے موقعے پر بھی حاضر نہیں ہو سکتے۔ ٹھاکر دت شرما وید
امرت دھارا فارمیسی لمیٹڈ ڈیرہ دون

ملک کا بہترین دل و دماغ

اخبارات اُن دل و دماغ کی خوبیوں کو پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ جو مرحوم کی ذات میں فراواں تھیں
(رائے بہادر شنکر داس جالندھر)

شیخ عبدالقادر تمام جغرافیائی حدود میں ہر دلعزیز تھے

میرے لئے اُن صلاحیتوں کا گنوانا ممکن نہیں جنہوں نے مرحوم کو ہر شعبے میں کام کرنے والوں کے لئے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ لیکن ام کا بے حد دکھ ہے۔ کہ آج ایک عذر خاص کی وجہ سے خود حاضر ہو کر اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔
(سومناتھ بھگت۔ ایڈووکیٹ دہلی)

قوم شیخ عبدالقادر کی وفات سے یتیم ہو گئی۔

محمد حمید چودھری
دہلی کلاتھ ملز سٹور۔ رہتک

لائل پور کاٹن ملز کے ہزاروں مزدوروں میں صفِ ماتم

میں اپنی بیوی اور لائل پور کاٹن ملز کے ہزاروں مزدوروں کی طرف سے جو میری وساطت سے آپ تک اپنے جذباتِ دل کا اظہار پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس حادثۂ عظیم پر اپنے غم کا اظہار کرتا ہوں۔

ایم۔ اے ستار۔ لائل پور کاٹن ملز

قراردادیں

کُل پاکستان انجمن ترقّی اُردو کالج

سول اسپتال روڈ۔ اُردو باغ۔ کراچی نمبر۱

آج ۱۲ر فروری ۱۹۵۰ء اتوار کو اُردو کالج کراچی میں جملہ اساتذہ و طلبہ کا ایک تعزیتی جلسہ بصدارت جناب ڈاکٹر مولوی عبدا[لحق] صاحب منعقد ہُوا۔ اور حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی :۔

"اساتذہ و طلبائے اُردو کالج کراچی کا یہ جلسہ شیخ سر عبدالقادر کی وفات حسرت آیات کو ایک قومی اور ملّی حادثۂ عظیم تص[ور] کرتے ہوئے انتہائی رنج اور افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم کی رحلت پاکستان کی قومی زبان اُردو کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصا[ن] ہے۔ مسلمانوں کی عام فلاح و بہبود کے لئے عموماً اور اُردو زبان کی ترقی کے لئے خصوصاً مرحوم نے جو خدماتِ جلیلہ انجام دی ہیں وہ [تاریخ] کے صفحات پر سنہری حرفوں میں لکھی جائیں گی۔ یہ جلسہ مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ خداوند تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے"۔

(پرنسپل اردو کالج)

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

"سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے اساتذہ سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں بحیثیت [صدر] پنجاب ایجوکیشن فیلوشپ جو خدمات مرحوم نے سرانجام دیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے اور آپ کی دیگر بیش بہا ادبی اور علمی [خدمات] کو سراہتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

محمد صادق۔ سیکرٹری مجلس اساتذہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۰ء

قرارداد انجمن احمدیہ۔ کراچی

جماعت احمدیہ کراچی کا ایک غیر معمولی اجلاس ۱۰ر فروری ۱۹۵۰ء کو منعقد ہوا جس میں پاکستان کے عظیم المرتبت ما[یہ ناز] مصنف شیخ عبدالقادر کی یاد میں تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔ اُردو کے اس عالی مرتبہ عالم کی خدمات میں سے تاریخ ایک یہ بات بھی [خاص] طور پر یاد رکھے گی کہ لنڈن کی "مسجد فضل" کا افتتاح انہیں کے ہاتھوں ہوا جسے عُرفِ عام میں "لنڈن مسجد" کہا جاتا ہے

مغربی پاکستان میں اسلامی خدمات کا مرکز ہے

انجمن ترقی اُردو مغربی پنجاب لاہور

انجمن ترقی اُردو پاک پنجاب کا یہ خاص جلسہ اُردو کے جلیل القدر محسن سر عبدالقادر صاحب کی وفاتِ حسرت آیات پر دلی غم کا اظہار کرتا ہے۔

شیخ صاحب کی وفات سے علمی اور ادبی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا عرصہ دراز تک پُر ہونا دشوار ہے۔ شیخ صاحب مرحوم نے پنجاب میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے جو شاندار خدمات سرانجام دی ہیں ان کی وجہ سے اُردو ادب ہمیشہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔

خاص
عارف مرزا معتمد عمومی انجمن ترقی اردو لاہور

مجلس توسیع اُردو لاہور

مجلس توسیع اُردو تعلیم الاسلام کالج لاہور، کا یہ غیر معمولی اجلاس ادب اُردو کے محسن عظیم شیخ سر عبدالقادر صاحب کی وفات حسرت آیات پر جذباتِ رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے محترمہ بیگم صاحبہ شیخ عبدالقادر صاحب اور دیگر لواحقین سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ شیخ صاحب کی وفات اُردو ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

اس قرارداد کی نقول محترمہ بیگم عبدالقادر اور پریس کو بھجوائی جائیں۔"

(۲۰ فروری ۱۹۵۰ء)

مدرسۃ البنات میں شیخ سر عبدالقادر صاحب مرحوم کا ماتم

اکابر کے رہنما

آج صبح حضرت شیخ غفرلہٗ کی المناک وفات کی خبر سنتے ہی مدرسہ میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی۔ فوراً ہی ایک ماتمی جلسے کے انعقاد کا انتظام کیا گیا۔ مدرسے کے ہال میں طالبات و معلمات کے اجتماع میں آغائے محترم بانی مدرسۃ البنات نے آیاتِ قرآنیہ اور احادیث شریفہ نہایت رقت انگیز انداز اور درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں فلسفۂ موت کی وضاحت کی۔ اور فقید مغفور کے محاسن بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ کی رُو سے حضرت شیخ مرحوم کی موت پوری قوم کے لئے نقصانِ عظیم ہے اور تمام قوم آپ کے ماتم میں شریک ہے۔ سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ آپ نے تمام عمر قوم و ملک اور زبان کی مخلصانہ اور خاموش خدمت کی۔ لیکن تمام عمر آپ کی زبانِ قلم سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جو کسی کی دلخراشی کا باعث ہو۔ آپ نہ صرف اکابر میں سے تھے بلکہ اکابر کے رہنما تھے۔ نیز اس مدرسہ پر آپ کی نوازشات اور مہربانیوں کا اعتراف

کرنے اور دعائے مغفرت کے بعد یہ قرارداد منظور ہوئی کہ طالبات، معلمات مدرسہ اور اراکین انجمن اس سانحۂ عظیمہ سے جو نقصانات ملک وملت کو اور جو عمیق درد و الم اس جلیل القدر بزرگ کی وفات حسرت آیات سے پسماندگان کو پہنچا ہے شریک الحال ہیں۔ اور حضرت المرحوم شیخ صاحب کے لئے جوارِ قدس اور رحمت و مغفرت کی دعا اور پسماندگانِ مغفور کے لئے حضرت حق جل مجدہٗ سے صبر جمیل اور اجر جزیل کی التجا کرتے ہیں۔

(سر معلمہ مدرسۃ البنات لاہور)

دفتر انجمن حمایتِ اسلام لاہور

قرار پایا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کا یہ غیر معمولی اجلاس شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالٰی ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔ اور مرحوم کے ورثا سے اظہار ہمدردی کیا جائے۔ اور نقول بغرض اشاعت اخبارات میں بھیج دی جائیں۔

۱۳ فروری ۱۹۵۰ء — نقل مطابق اصل ہے

محمد دین اسسٹنٹ سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور

کارپوریشن ہائی سکول مزنگ۔ لاہور

ہم اساتذہ و طلبائے مزنگ ہائی سکول بزرگ پاکستان محسنِ اُردو ادب سر شیخ عبدالقادر بی۔ اے بار ایٹ لا کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و قلق کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالٰی انہیں جنت الفردوس میں مقامِ اعلٰی عطا فرمائے اور ان کے غم زدہ پسماندگان اور افسردہ اعزا و اقارب کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

(غلام محمد بٹ ہیڈ ماسٹر)

قرارداد مجلس مذاکرہ طبیہ کالج۔ لاہور

مجلس مذاکرہ طبیہ کالج انجمن حمایت الاسلام کا یہ اجلاس سرتاجِ ادب سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی وفات حسرت آیات پر رنج و تاسف کا اظہار کرتا ہے۔ اور مرحوم کی وفات کو علمی و ادبی دنیا میں ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔ اللہ تعالٰی مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

(پیرزادہ برکات احمد بگوی جنرل سیکرٹری)

از دفتر آل پاکستان یونانی طبی کانفرنس۔ لاہور

(ماتمی قرارداد) آل پاکستان یونانی طبی کانفرنس و ہمدرد۔ پاکستان یونانی طبیہ کالج لاہور کا ماتمی اجلاس شیخ سر عبدالقادر صاحب مرحوم کی بے وقت رحلت پر دلی رنج و اندوہ کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم کی بے وقت رحلت سے قوم اور ملت کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ اور مرحوم کی بیگم صاحبہ اور دیگر اعزا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ جماعت آپ کے خاندان کے ساتھ شریکِ رنج و غم ہے۔

۱۰ مارچ ۱۹۵۰ء (خادم حکیم حافظ مسعود الحق خاں پروپیگنڈا سیکرٹری)

جلسۂ تعزیت

لاہور لیڈیز کلب میں خواتین کا ایک جلسہ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۵۰ء بروز جمعہ کو منعقد ہوا۔ جس میں مفصلہ ذیل کارروائی ہوئی۔

۱۔ نماز عصر باجماعت ادا کی گئی۔

۲۔ سر عبدالقادر صاحب مرحوم و مغفور کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے متعدد قرآن پاک ختم کئے گئے۔

۳۔ دعا کی گئی کہ شیخ صاحب مرحوم و مغفور کی روح کو اللہ تعالےٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرماوے۔ اور لیڈی صاحبہ کو اپنے نامدار شوہر کی دائمی مفارقت کے صدمے کے برداشت کی طاقت عطا فرماوے۔

۴۔ دعا کی گئی کہ اللہ تعالےٰ ان کے بچوں کو اپنے والد محترم کے نقشِ پا پر گامزن ہونے کی توفیق دے۔

۵۔ خواتین نے تقریریں کیں اور ان کے اخلاقِ حسنہ پر روشنی ڈالی۔ قرار پایا کہ لیڈی صاحبہ کی خدمت میں اظہارِ افسوس کا ریزولیوشن مرسل ہو۔ (سیکرٹری لاہور لیڈیز کلب)

ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور

ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کا یہ اجلاس سر عبدالقادر (جو اس ایسوسی ایشن کے ممتاز اور نمایاں رکن تھے۔ اور لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج بھی تھے) کی وفاتِ حسرت آیات پر ہمارے گہرے غم اور دلی صدمہ کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی وفات سے پاکستان کو اور خاص طور پر پنجاب کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

ایسوسی ایشن مرحوم کی روح کے لئے دل سے دعا کرتی ہے۔ اور ان کے مغموم خاندان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔

اکیڈمی سٹاف اور پروفیشنرز

"پی۔ اے۔ ایس اکیڈمی سٹاف اور پروفیشنرز کا یہ اجلاس سر عبدالقادر جو لاہور کے ممتاز ترین شہریوں اور ادبی حلقوں میں نمایاں ترین شخصیتوں میں سے تھے کی وفات پر اپنے گہرے جذبات اور دلی صدمے کا اظہار کرتا ہے۔ اردو زبان اور اُس کے ادب کی خدمت کی وجہ سے انہوں نے ہماری قومی تاریخ میں ایک ممتاز اور مستقل درجہ حاصل کیا ہے۔"

میں ممنون ہوں گا اگر یہ قرارداد آپ کے خاندان کی نظر تک پہنچ سکے۔ جی معین الدین

محترمہ لیڈی قادر!

میں اپنے تمام کالج کی طرف سے اس صدمۂ عظیم پر اپنی دلی ہمدردیاں پیش کرتا ہوں۔

سر عبدالقادر نے گذشتہ سالوں میں ہمارے کالج کے سلسلے میں جو دلچسپی ظاہر کی اور جو مفید مشورے دئیے ہم انہیں ہمیشہ محبت اور شکر سے یاد رکھیں گے۔ پرنسپل

۹ر فروری سنہ ۱۹۵۰ء ایچیسن کالج لاہور

فارمن کرسچین کالج لاہور کے اساتذہ اور طلبا سر عبدالقادر مرحوم کی یاد اور ان کی زندگی بھر کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے آج صبح ۹ بجے کالج کے ہال میں جمع ہوئے۔ اُن کی وفات کی خبر کالج میں علی الصباح موصول ہو چکی تھی۔

پروفیسر ایم۔ ایس جھجی۔ پروفیسر آر۔ ایل ولسن اور ڈاکٹر سی ایچ رائس پرنسپل نے سر عبدالقادر کی زندگی کے نمایاں ادوار کے متعلق پرسوز تقاریر کیں۔ ہماری اس درسگاہ سے جہاں انہوں نے خود بھی تعلیم حاصل کی۔ ان تقاریر میں سر عبدالقادر کے اُس قلبی رشتے کی یاد دلائی گئی۔ جسے انہوں نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ ان کا ماتم ایک دوست، ایک عالم، ایک دانا اور با اثر مدبر کی حیثیت سے کیا گیا۔ اور ان کی زندگی کو طلبا کی اس پود کے سامنے فرحت بخش اور روح افزا مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔

(اقتباس از قرارداد) پرنسپل سی۔ ایچ رائس

لا کالج لاہور کے اساتذہ اور طلبا کا یہ اجلاس سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی وفات کی اطلاع پا کر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور مسلمان قوم اور ترقی اُردو کے لئے جو انہوں نے عمر بھر کثیر التعداد اور عدیم المثال خدمات سرانجام دی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس حادثے کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے اور شیخ صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

پرنسپل لا کالج لاہور

گورنمنٹ کالج جھنگ کا سٹاف اور طلبا آج سر عبدالقادر (جنہوں نے زندگی بھر اردو زبان کی عدیم المثال خدمات کیں) کی وفات پر اپنے دلی غم کا اظہار کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ان کی وفات سے پاکستان کی کلچری زندگی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ہم اُن کے پسماندگان اور اعزا سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

(پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ)

محترمہ لیڈی عبدالقادر!

ہم نے سر عبدالقادر کی وفات کو دلی رنج و ملال سے محسوس کیا۔ یہ خبر ہمیں آج دوپہر کے کھانے کے وقت ملی۔ اور ہم نے سر عبدالقادر کے احترام میں کالج بند کر دینے کا فیصلہ کیا

کالج بند کر دینے سے پہلے ہم نے سٹاف اور طلبا کی ایک مجلس منعقد کی۔ میں اپنے سٹاف، طلبا اور خود اپنی طرف سے سر عبدالقادر کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوں۔ اور آپ اور آپ کے اعزا کے رنج و غم پر ہمدردی کا اظہار کرتی ہوں۔

میں نے اپنے طلبا سے کہا کہ ہمارے کالج اور تمام قابل تحسین تحریکوں نے آپ کے شوہر کی ذات میں ایک مخلص دوست کھو دیا ہے۔ میں اور میرا اسٹاف انہیں محبت اور احترام کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ اور اس خیال پر بہت ملول ہیں کہ ہم انہیں پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ خدا آپ کو صبر عطا کرے۔

آپ کی مخلص

(پرنسپل کینیرڈ کالج لاہور)

زمیندارہ کالج گجرات کے اساتذہ اور طلبا کا یہ اجلاس سر عبدالقادر کی وفات پر اظہار غم کرتا ہے۔ ان کی دائمی مفارقت نے ہم سے ایک بڑا عالم اور ایک ایسا ادیب چھین لیا ہے جن کی خدمات مختلف شعبوں میں لاتعداد ہیں۔

ہم ان کے پسماندگان کو اپنی دلی ہمدردی پیش کرتے ہیں۔

(پرنسپل زمیندارہ کالج گجرات)

مسلم ایسوسی ایشن میڈیکل کالج لاہور کی ایگزیکٹو کمیٹی کا یہ اجلاس پنجاب کے باوقار بزرگ شیخ عبدالقادر کے انتقال پُر ملال پر اپنے گہرے صدمے کا اظہار کرتا ہے۔ اُن کی موت نے ہم سے ایک خزینۂ اوصاف، ایک قانون دان، ایک صحافی، ایک انسانیت پرست اور ایک ممتاز ادیب چھین لیا ہے۔

یہ مجلس مرحوم کے پسماندگان تک اپنی دلی ہمدردیاں پہنچانا فرض سمجھتی ہے۔ اور دعاگو ہے کہ اللہ ان کی روح کو سکون عطا کرے۔

(مسلم ایسوسی ایشن میڈیکل کالج لاہور)

ہیلی کالج آف کامرس لاہور کے اساتذہ اور طلبا سر شیخ عبدالقادر کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی روح کو سکون نصیب ہو۔ یہ اجلاس اُن کے پس ماندگان سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جن کے غم میں سارا ملک شریک ہے۔

(ہیلی کالج آف کامرس لاہور)

گجرات ڈسٹرکٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹروں کی ایسوسی ایشن خان بہادر سر شیخ عبدالقادر (جن کی خدمات اردو ادب کے میدان میں ہمیشہ محبت اور احترام سے یاد کی جائیں گی) کی وفات پر اپنا دلی صدمہ اور گہری ہمدردیاں پیش کرتی ہے۔

(سیکرٹری ڈسٹرکٹ ہائی سکول ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن گجرات)

جلسۂ تعزیت

بزم ادب کالج کی طرف سے ۱۷ فروری ۱۹۵۰ء سہ پہر کو زیر صدارت جناب سید اختر حسین صاحب تاباں ایک جلسۂ تعزیت سلیمان منزل (خواجہ دل محمد روڈ) میں منعقد ہوا۔ جس میں اُردو کے مربی و محسن شیخ سر عبدالقادر بالقابہ کے انتقال پُر ملال پر قرارداد تعزیت پاس کر کے مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لئے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی گئی۔

قرارداد

" بزم ادب کا رکیا ادارہ جملہ حاضرین جلسہ کے ساتھ قوم کے اس ناقابل تلافی نقصانِ عظیم پر شرکتِ غم کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ خدائے عزوجل مرحوم و مغفور کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس عالی جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب سابق صدر کانفرنس کی رحلت پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی رحمت کاملہ سے آں مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔

(سید الطاف علی بریلوی۔ علی گڑھ)

منتخب کتابیں

نام کتاب	موضوع	نام مصنف	قیمت
تقسیم تہذیب	ناول	تیرتھ رام فیروزپوری	۴/-
وطن پرست	،،	،،	۴/-
تیغ کی دنیا	سیاسی	پرنسپل چھبیل داس	۱/-
پٹواری	مزاح	نقل تبدیل	۲/-
پھانسی	ناول	سعادت حسن منٹو	۱/۸
نورجہاں	،،	آغا رفیق	۱/۸
فاطمۃ الزہرا	سوانح	،،	۱/۴
خدیجۃ الکبریٰ	،،	،،	۱/۴
حضرت ابوبکر صدیقؓ	،،	،،	۲/-
حضرت عمر فاروقؓ	،،	،،	۱/۸
حضرت عثمان غنیؓ	،،	،،	۱/۴
حضرت علیؓ اور امام حسینؓ	،،	،،	۱/۴
حضرت بلالؓ	،،	،،	۱/۴
انگلش ٹیچر	،،	،،	۱/-
فارسی بول چال		علامہ فخری	۲/-
عربی بول چال		،،	۲/۸
تزئین	ناول	ابوالفضل صدیقی	۴/-
روپ سنگار	افسانے	اعظم کریوی	۲/-
الطاف کے نغمے	غزلیات وغیرہ	الطاف مشہدی	۱/۸
سیر و شکار	نظم و تنقید	پروفیسر خاوری	۱/-
طبیب مرغیاں باتصویر		خواجہ عبدالسلام فروغی	۴/-
بھیڑ بکری باتصویر		ایم۔ایل چودھری ایم۔اے	۲/۸
طبیب مرغی خانہ باتصویر حصہ اول		خواجہ عبدالسلام فروغی	۳/-
تجارتی مرغی خانہ باتصویر حصہ دوم		،،	۲/-

نام کتاب	موضوع	نام مصنف	قیمت
کامیاب مرغی خانہ باتصویر حصہ دوم		خواجہ عبدالسلام فروغی	۲/-
خار و گل	افسانے	ایم۔اسلم	۴/-
گل افرنگ	،،	،،	۲/۸
شرابی	،،	،،	۲/۸
پیغام سروش	،،	،،	۲/۸
شب نم	ناول	،،	۲/-
کوشلیا	،،	،،	۱/۴
ساز شکستہ	،،	رشید اختر ندوی	۲/-
سوز دروں	،،	،،	۲/۱۲
سودائی	،،	،،	۳/-
نسیم	،،	،،	۳/۸
تلخیاں	،،	،،	۳/۸
تشنگی	،،	،،	۳/۸
پندرہ اگست	،،	،،	۳/-
ایک پہیلی	،،	،،	۵/-
نئی کرن	،،	،،	۵/-
اختر	،،	رئیس احمد جعفری	۳/-
باغی	،،	،،	۲/۸
رُوسیاہ	،،	،،	۴/-
دیدہ و شنیدہ	،،	،،	۶/۸
دل	ناول	،،	۶/-
مجاہد	،،	،،	۵/-
عورت	،،	،،	۲/۸
نظارے	افسانے	کرشن چندر	۲/۸
دو قرآن	مذہبی	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۲/۸
جہان نو	،،	،،	۳/۸
کارٹون	ناول	شوکت تھانوی	۳/۸

نام کتاب	موضوع	نام مصنف	قیمت
خدانخواستہ	ناول	شوکت تھانوی	۲/-
بیوی	،،	،،	۲/۱۲
بکواس	،،	،،	۳/-
مسکراہٹیں	افسانے	،،	۲/۸
شیطان کی ڈائری	،،	،،	۱/۸
گرگٹ	،،	،،	۱/۸
لاہوریات	،،	،،	۲/-
سودیشی ریل	،،	،،	۳/-
قاضی جی	،،	،،	۳/۸
مابدولت	،،	،،	۲/۸
مونڈی کاٹے	،،	،،	۱/۸
معمہ خاتون	،،	،،	۱/۸
شبنم	ناول	نسیم انہونوی	۲/-
انجم	،،	قیسی رامپوری	۲/-
شاخسار	افسانے	عاشق بٹالوی	۱/۸
گھونگھٹ	ناول	قیسی رامپوری	۲/۸
دلدل	افسانے	وہبی بٹالوی	۲/۸
شرمناک افسانے	،،	،،	۱/۸
سورج مکھی	ناول	خان محبوب طرزی	۲/-
کُردی رقاصہ	،،	،،	۲/-
سبز مینار	،،	،،	۲/۸
ثریا	،،	فاطمہ مبین	۲/-
آزاد مصر (آج کی مصری دنیا کے حالات)		حسن الاعظمی	۸/-
محمد عبدہٗ اور پان اسلام ازم (سوانح)		،،	۴/-
جنرل	ناول	مضطر ہاشمی	۴/-
مہاجر	،،	،،	۴/-
نشیمن	ناول	اے آر خاتون	۵/-
تصویر	،،	،،	۴/-
شاہین	ناول	نسیم حجازی	۶/۸

کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر، اقبال روڈ لاہور

نقاشِ فطرت حضرت ایم۔ اسلم کے غیر فانی ناول

ضربِ مجاہد:۔ پاکیزہ، دلچسپ انتہا، معجز اثر انگریز اسلامی تاریخی ناول جس کے مطالعہ سے اسلام کا سچا جذبہ ایثار اور شوقِ جہاد پیدا ہوتا ہے۔ جب اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کا سیل رواں کسی سے تھمتا نہ تھا اس وقت کے مسلمانوں کا کیرکٹر دیکھنا ہو تو یہ معرکہ آرا ناول پڑھئے ۲/۸

مردِ غازی:۔ حق و باطل کے معرکوں کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کا ایک دلکش رومان ۲/۸

خوابِ جوانی:۔ اس بےمثال ناول کے صفحے پر زندگی نئی نئی کروٹیں لیتی نظر آتی ہے اور ہر کروٹ اپنے اندر ایک دلآویز رومان لیتے ہے ۲/۸

پی کہاں:۔ ایک افسانہ نگار لڑکی اور ایک افسانہ نگار نوجوان کا دلچسپ معاشقہ ۲/۸

چشمِ لیلیٰ:۔ نشیلی اور مدھ بھری آنکھوں والی حسین لیلیٰ، بربط کے جان نواز نغموں کے ساتھ ایک نوجوان کو اپنی داستانِ محبت سناتی ہے۔ ۸/۰

فریادِ خاموش:۔ ایک نوجوان لڑکی کا دلچسپ قصہ جو ناتجربہ کاری کے سبب اپنی شاندار زندگی برباد کر لیتی ہے ۵/

ٹھکر:۔ محبت کی سرگرمیوں اور حسن کی شوخیوں کی خوفناک ٹھکر۔ ۳/۸

آخری رات:۔ بےپردگی، مخلوط سوسائٹی اور کلب لائف کے خوفناک نتائج بیحد دلچسپ ناول کی صورت میں۔ ۴/-

شمسہ:۔ تہذیبِ فرنگ کی ایک فریب خوردہ حسینہ کی زندگی کے المناک نتائج۔ ۵/-

شام و سحر:۔ ایک امیر خاندان کے عروج و زوال کی دلپذیر دعبرت ناک داستان ۴/-

رقصِ بہار:۔ اس انتہا درجہ دلچسپ اور شاندار ناول میں عشق و محبت کی داستان کے ساتھ ساتھ آزاد اسلامی معاشرت کا مقابلہ مغربی متعین تہذیب سے کیا گیا ہے۔ ۴/-

ہیر رانجھا:۔ سرزمین پنجاب کی زندۂ جاوید رنگین داستانِ عشق بیحد اثر انگیز ناول ۲/-

راز و نیاز:۔ (باتصویر) ایک طوائف کا دلآویز رومان جس کا ہر لفظ جوانی اور شباب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

اشکِ ندامت: ایک شریف زادی کے ایکٹریس بننے کا عبرتناک انجام ۳/۸

شفق:۔ کالج لائف کا ایک دلکش و بےحد ہولناک رومان۔ ۳/-

رام کلی:۔ دیہاتی الھڑ حسینہ اور دانا سے نوجوان کی داستانِ محبت۔ ۴/-

رقصِ ابلیس:۔ قیامِ پاکستان پر پاکستان کے دشمنوں کے مظالم کی لرزہ خیز داستان ۴/-

یتیمی بانہیں:۔ ایک نوخیز تعلیم یافتہ دوشیزہ کس طرح ہر مشکل کا مقابلہ کر کے اپنی حیاتِ نو کے لیے راستے صبح و شام پیدا کرتی ہے۔ ۲/-

جہنم:۔ یہ دنیا مفلسوں کیلئے جہنم سے کم نہیں یہ دلچسپ ناول غریبوں سے ہمدردی کا شدت سے احساس پیدا کرتا ہے

شامِ غریباں:۔ غریبوں کی دکھ بھری زندگی کا نقشہ دلکش رومان کے ساتھ۔



ایم۔ اسلم کی دیگر کتابیں

افسانے

لاجواب آنو (مرل)	۳/-	قاتل	۲/۸
خونِ مسلم	۲/۸	بادۂ گلرنگ	۳/-
راوی کے رومان	۵/-	جامِ شکستہ	۳/-
نیلی نظارے	۲/۸	خط کا جواب	۲/۸
انقلابِ اسلام (تاریخی و سیاسی)			۲/۸

ایم۔ اسلم اور اس کا ادب
شخصیت، افکار اور ادبی جائزہ ۳/-
مرتبہ خواجہ عبدالسلام فردوسی

یہ کتابیں ہر شہر کے بڑے تاجرانِ کتب۔ اور ریلوے سٹالوں سے مل سکتی ہیں۔

فہرست کتب مفت طلب فرمایئے

دارُالبلاغ ۔ محمد نگر اقبال روڈ لاہور ۱۲ مغربی پاکستان

ادب سماج میں پروان چڑھتا ہے

اور ـــــ فرد کی آزادی کا ضامن ہے!

فرد کی آزادی قوموں کی آزادی ہے

ادب جغرافیائی حدود کا پابند نہیں

ادب فرار ہے ـــــــــ!

حقیقت سے نہیں بلکہ حقیقت کی طرف

زندگی کی رفتار ادب ہے

انشا پریس اردو بازار - لاہور میں
چھپوا کر ریاض قادر نے پٹیل روڈ لاہور سے شائع کیا

اٹک کے اس پار

فارغ بخاری ● رضا ہمدانی

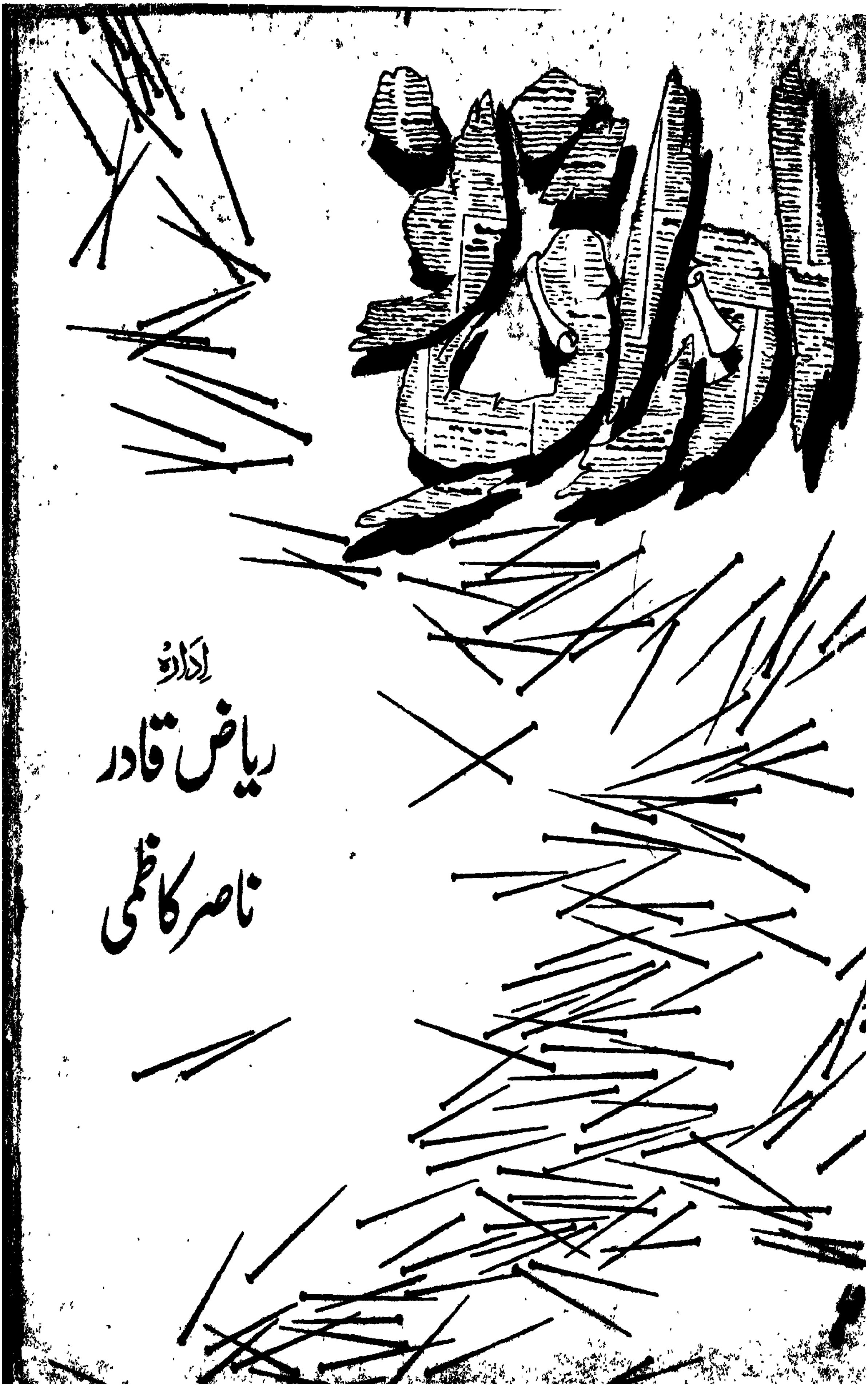
[illegible]

سنگین ماحول میں بسنے والے حریت پرست پٹھانوں کی تہذیب ، کلچر ، معاشرت اور ادب کا غیر فانی مرقع

[illegible]

گوشہ ادب چوک انارکلی لاہور

[illegible]


ادارہ
ریاض قادر
ناصر کاظمی

قائداعظم

★

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا معمار









۔ عمل شمزا

انور جلال۔ قائداعظم کی تصاویر کی کتاب تیار کررہے ھیں۔

پرنٹرو پبلشر — ریاض قادر
تزئین و ترتیب — ناصر کاظمی
رق — زوبی
ـ ن — زوبی، شمزا
آفتاب ظفر قریشی، حامد حسن (تلمیذ شیخ احمد)
کتابت — زرین رقم، الماس رقم اور دوسرے
طباعت — انشا پریس لاہور
نگران طباعت — ملک مبارک علی، امین کاشمیری

پتہ :
۳، ٹمپل روڈ ۔ لاہور
فون نمبر ۳۴۲۰

قیمت نمبر ۲
ایک روپیہ آٹھ آنہ
زرسالانہ — ۸ روپیہ
رجسٹری فیس — ۳ روپیہ

انتساب

شیخ عبدالقادر مرحوم کے نام

★

ماہنامہ

اوراقِ نو

نمبر ۲

ادارہ

ناصر کاظمی ۔ ریاض قادر

ماہنامہ

اوراقِ نو

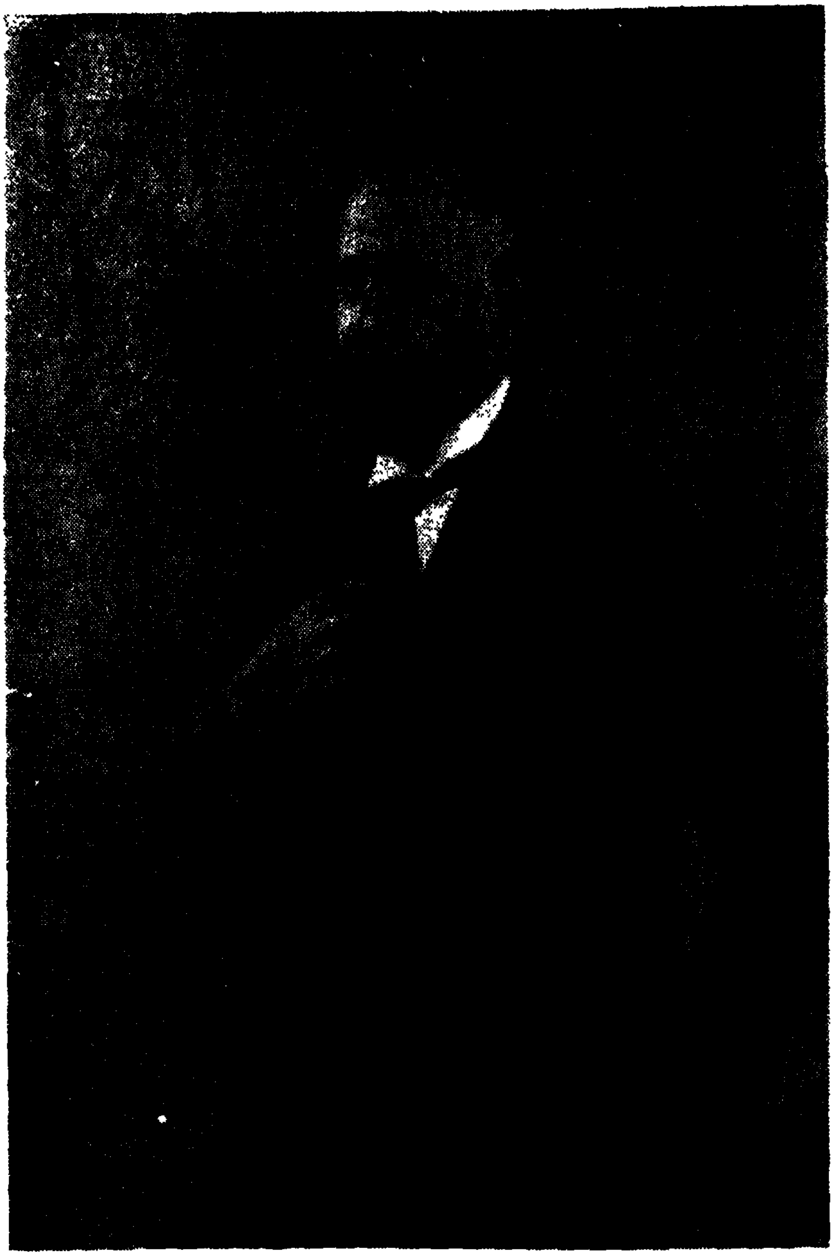
ادارہ

ناصر کاظمی — ریاض قادر

قیمت نمبر ۲ ایک روپیہ آٹھ آنہ

زرِ سالانہ ۸ روپیہ

رجسٹری فیس — ۳ روپیہ



شیخ عبدالقادر مرحوم جنہوں نے "اوراقِ نو" کی بنیاد رکھی۔

★

""اوراق نو" کی شیرازہ بندی پاکستان کے فن و ادب کی شیرازہ بندی ہوگی"۔

★

"ہرچند کہ میری صحت کچھ عرصے سے اچھی نہیں، میں حتی الوسع اپنے دوستوں کے ساتھ اس خدمت میں شریک ہوں گا"۔

مہندی باغ۔ ٹونک راج۔

عزیزم سلمہ، سلام ودعا۔ آپ کا خط پہنچا۔ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا لیکن جواب دے رہا ہوں
میں نے ایک زمانے میں لکھا تھا ؎

میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے نہاں
مہر و مہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لیے

یہی بے نام سا احساس آپ کے سینے میں شعلہ زن ہے۔ اسے جائز مصرف میں لائیے اور قائم رکھیے ؎

عشق کی دل میں خلش ہو گو جہنم بن کے ہو
خلد کو چاہیں گے کیا قبریں بسانے کے لیے؟

تابش آج ام پیشۂ اربابِ صحافت! کس رسالے میں ہیں؟ دعا پہنچا دیجیے۔

والدعا
مخلص
اختر



جناب ناصر کاظمی
ہیلی ہوسٹل۔
اسلامیہ کالج۔
لاہور

Lahore
(Punjab)

اختر شیرانی مرحوم کا عکس تحریر (۱۹۴۳)

پہلی بات

"اوراق نو" آپ کے سامنے ہے اس کی اشاعت کی تکمیل کے لئے ہمیں جن صبر آزما مرحلوں اور حوصلہ شکن حالات سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ ہم ہی کر سکتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں یہ جریدہ اپنی طباعت ' کتابت ' ترتیب و تزئین ' رنگین تصاویر ' مختلف النوع موضوعات اور بالخصوص قیمت کے لحاظ سے اپنی قسم کا پہلا ادبی تجربہ ہے ——— اس جدید ترین پیشکش میں محض ادارۂ تحریر کا حصہ ہی نہیں بلکہ پاکستان کے ممتاز ترین ادیبوں' شاعروں' فن کاروں اور خاص طور پر محنت کش کاریگروں کا خون جگر بھی شامل ہے ۔ "اوراق نو" پر آج تک جس قدر محنت اور سرمایہ صرف ہو چکا ہے ۔ اس کی تلافی ایک طویل عرصے تک نہیں ہو سکتی ۔ تاہم اگر ہمارے قارئین اور اہل قلم حضرات ہماری معاونت کرتے رہے تو ہماری محنت رائگاں نہیں جا سکتی ۔

"اوراق نو" کی بنیاد شیخ عبدالقادر مرحوم نے رکھی تھی اور اگر ہم اسے اُن کا آخری ادبی منصوبہ کہیں تو غلط نہ ہو گا ۔ اسے کامیاب بنانا ہم سب کا فرض اولین ہے ۔ ہم نہ ترقی پسند ہیں نہ رجعت پسند' ہمارا نعرہ صرف "ادب" ہے ۔ ہم پاکستان کے خیر خواہ ہیں اور ہمارا مقصد پاکستان کے فن و ادب اور پاکستان کے عوام کی فلاح ہے ۔ ہم آپ سے منافع نہیں چاہتے ' صرف "اوراق نو" کی حیات چاہتے ہیں ۔

آخر میں ہم ان تمام فن کاروں اور ادیبوں کے ممنون ہیں جن کی تحریریں اور فن پارے ان اوراق کی زینت ہیں ۔ مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے ۔ افسوس ہے کہ "اوراق نو" عین آخری منزل میں چغتائی صاحب کے بنائے ہوئے "سرورق" سے محروم ہو گیا جس کا بلاک خاطر خواہ طور پر نہ بن سکا — اس کی جگہ فی الحال ہم زوبی (جو آجکل حکومت پاکستان کی طرف سے آرٹ کے مطالعے کے لئے اٹلی میں مقیم ہیں) کا سر ورق پیش کر رہے ہیں ۔

ناصر کاظمی

رباعیات

یوں مجھکو یہ دلدوز ترانے نہ سنا
تانیں نئی بن راگ پرانے نہ سنا
سنتا ہوں میں وقت کی بدلتی آواز
تو آج کی شب مجھکو فسانے نہ سنا

ساحل پہ کھڑا کروں نظارے کب تک
جیتا رہوں ساحل کے سہارے کب تک
طوفان کی زد میں ہے نظام ہستی
انسان کو انسان پکارے کب تک

اے ہمسفرو ابھی سفر باقی ہے
اک وادئ صد بیم و خطر باقی ہے
منزل سے ورے، بہت در و بام سے دور
دشمن کی عنایت کی نظر باقی ہے

ریاض قادر



ریاض قادر

خون اور آهن

آج زندگی ایک نئی کروٹ لے رهی ہے۔ همیں انتخاب کرنا ہے اور بہت جلد۔ تاریخ کا ورق تحریر کا منتظر ہے۔

دنیا کا نقشہ عبرتناک ہے۔ ایک نئی دن بہ دن متحد هوتی هوئی دنیا جنم لے رهی ہے۔ اتنے وسیع پیمانے پر زندگی کا سانچے میں ڈھلنا خطرے سے خالی نہیں هو سکتا۔ مستقبل کا ورق حرف کا منتظر ہے۔ کانپتے هاتھوں میں کلک ارادہ ہے۔

بیسویں صدی کو اپنے شعور پرناز ہے۔ کیا کروڑها انسانوں پر مشتمل یہ دنیا زمانے کے تیز رو واقعات سے تشکیل پاتے هوئے وعدہ فردا کے ایفا کرنے کا بار چند انسانوں کے ذمے صاحبوں کی نذر کرکے خود اس میدان مسئلہ سے دامن بچانا چاهتی ہے؟ خود غفلت کی نیند سونا چاهتی ہے؟ اگر اس مرتبہ اس نے بندگان مخلوق الارض نے اپنے اجتماعی شعور کا بوجھ چند هی ذهنوں پر ڈال کر ایمان [illegible] کا ثبوت دینا چاها، تو گناہ کا دھبہ [illegible] هی کے دامنوں پر نہ هوگا!

آج انسان چند سیاسی مفاد پرستوں کے هاتھوں میں کھلونا ہے اور آج هی اسے اپنی خودداری کا پہلا اور کامل احساس هوا ہے لہذا آج هی تاریخ میں پہلی بار اس کی معاشی اور اخلاقی خود داری کی کڑی آزمائش ہے۔ کل کائنات انسانی آج موت کی وادی میں لا کر ڈال دی گئی ہے۔ ایٹم کے پرستار پسپائی کے آخری دنوں کے رومن عیش پرستوں کی طرح، اپنے هم جنسوں کے پرخچے اڑتے دیکھ کر محظوظ هونا چاهتے هیں۔ ایک جہان کی مفلسی سے اپنے جام ارغوانی میں، اور رنگ بھرنا چاهتے هیں۔ اور سچ پوچھئے تو حالت اس سے بھی ابتر ہے۔ یہ چند اشخاص خود بے بس هیں۔ انکو اپنے هی تشدد اور ظلم پر قابو نہیں ہے اتنی بڑی ذمہ داری کو چند کندھوں پر ڈال دینا، نہ دانائی ہے اور نہ انسانیت۔ پھر اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ آج سیاس اور رهبران قوم و ملت چار سو حواس باختہ نظر آتے هیں۔ ایک فرد کی موت کا پروانہ لکھتے

ہوئے منصف ترین ہاتھ کانپ جاتا ہے۔ اور یہ صاحبان تو ساری دنیا کو سنبھالے ہوئے ہیں !

شاعرو ! ادیبو ! نقادو ! مصورو ! فن کارو! تم جو انسانی ارتقا کو صدیوں سے چراغ دکھاتے آئے ہو، کیا تمہاری حسن پرستی آج محض خودغرضی ہو کر رہ جائے گی ؟ کیا تم تہذیب کو اپنے سامنے دودوآتش بن کر خاکستر میں تبدیل ہوتے دیکھ سکوگے ؟ اور تمہارے کان صرف جرس گل کی صدا سنتے رہیں گے، جب تک ایٹم تمہاری عزیز بہاروں کو صدیوں تک پیغام فنا نہ دے دے ؟

آج وقت ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے۔
''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق''!
مگر یہ عشق غالب کا عشق نہیں۔ اقبال کا عشق ہے۔ عشق حقیقی، وہ عشق جو خود داری بھی ہے، اور خود فراموشی و خود سپاری بھی۔ وہ عشق جسکو انسانوں کی مکمل آزادی، (لہذا آزادانہ سعی پیہم) سے ورے کوئی منزل منظور نہیں۔

سر منزل ندارم کہ بمیرم از قرارے

اور اب تو یہ بحث بھی پرانی ہو چکی ہے کہ دنیا خواص کے لئے ہے یا عوام کے لئے۔ عوام اور خواص کا تفرقہ سوویٹ روس کے نظام میں ڈھل کر ماضی کی یادگاروں میں شامل ہوچکا ہے۔ چین میں انسانوں کی حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہے، خواص کی نہیں۔ اقبال کا خواب تعبیر میں بدل چکا ہے۔
''گراں خواب چینی، سنبھل چکے ہیں۔
گو ابھی وہاں انسانوں کو انسان بننا باقی ہے۔ کیونکہ ابھی سرمایہ‌دار مغربی دنیا، عام اور خاص کے لغوی معنوں کو نہیں بھول پائی۔ اور جب تک اپنی اس یاددہانی کا فرض جنرل میک آرتھر جیسے مایۂ ناز فرزندان دولت خداداد مغرب کے ذریعہ ادا کرتی رہے گی، روس اور چین اور تمام‌ترمفلس ایشیا کی مفلس مخلوق بھی، اپنی گراں‌خوابی کو چھوڑ کر، آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر، امن پر جنگ کو ترجیح دیتے نظر آئیں گے۔ اور روس اور چین اپنے دشوار الحصول مقاصد کے گرد (جن کی بنیاد اس وسیع پیمانے پر کی ہوئی قربانیوں پر رکھی گئی ہے) ایک دفاعی خندق کھینچتے ہی چلے جائیں گے۔ امن کا تصور آج معنی‌خیز نہیں۔ کیونکہ لفظ ''امن'' ہر کس وناکس، جابرومجبور کی زبانوں پر گھستے گھستے اپنے لغوی معنوں کے علاوہ، باقی تمام حوالوں کو کھو بیٹھا ہے۔ امن کے اعلانوں سے امن قائم ہوچکا۔ آج دنیا امن سے بھی کہیں زیادہ، توازن کی متلاشی ہے، انصاف چاہتی ہے۔

اس وقت صدیوں کی مجبور دنیاجابجا اپنی زنجیریں توڑ رہی ہے۔ ویٹ نام میں، برما میں، ملایا میں، کوریا میں، جاپان میں، نسبتاً آزاد پاکستان، ہندوستان، اور انڈونیشیا میں، تائیوان یا فارموسا میں، ایران اور مصر میں، مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک میں، اور نہ بھی مت بھولئے، کشمیر میں، مشرقی یورپ اور بلقان کے ممالک میں، ایک نہ ایک صورت میں جنگ آزادی لڑی جری ہے۔

مگر اس جابجا احتجاج، اس جابجا پکار کا ایک ہی نعرہ جواب دیتا چلا جاتا ہے۔ ''امن کے دشمنوں سے ڈرو!'' اور اس نعرہ کا متواتر استعمال خاص وہی لوگ کرتے چلے جاتے ہیں، جو اس جنگ کا سبب ہیں۔ اس نعرہ سے یہ لوگ ستار العیوب کا کام لیتے آئے ہیں۔ لیکن تا کے !

عربوں کی آزادی عربوں سے کس نے چھینی؟ فلسطین میں کس نے یورپ کے یہودیوں کو قابض ہونے میں مدد دی؟ کیا وہاں بھی اشتراکی ہتھکنڈے پس پردہ کام کر رہے تھے؟ اس کا جواب خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں بیٹھے ہوئے تو ضروری نہیں۔ ہمارے فاضل وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان کی اس جرح کا حوالہ ہی کافی ہے، جس کی وجہ سے عرب ممالک کی تمام عرب مخلوق پاکستان کا احسان بھولنا نہ چاہیگی۔

مصر میں آزادی کی آواز کس آہنی دروازے سے بے سود ٹکرا رہی ہے؟ کیا یہاں بھی کوئی اشتراکی ہاتھ دست غیب کی طرح مصر اور انگلستان کے باہمی سمجھوتوں کے درمیان حائل ہے؟ اب تک دنیا متحیر ہے کہ سٹرلنگ کی ادائیگی کے معاہدے کے تحت جو جنگی سامان پہنچانے کا وعدہ انگلستان مصر سے کرچکا تھا اس سے بیون اور چرچل کیلم کھلا منکر ہوجانے میں ایک دوسرے سے کس شدومد سے رقیب بنے۔ انگریزی نوجوں دخل نہ دینے کے کل قوم مصر کے مطالبے پر سرکار برطانیہ نہ جواب دیتے ہوئے نہ جھینپی کہ مصر کی فوجی طاقت کی کمزوری دیکھتے ہوئے مصریوں کو مصریوں کے حال ہی پر چھوڑ دینا فرض شناسی سے کم نہ ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ نے دنیا کے سامنے فرض اس کا نیا اور ناقابل انکار تصور نہ پیش کیا ہوتا تو ہم تو یہی سمجھتے کہ مصر کو سامان پہنچانے کا وعدہ پورا کرنا بھی اسی کی ایک کڑی تھی اور اس سامان کے حصول سے مصری تدابیر دفاع میں خلل نہ پیدا ہوتا۔

سنتے آئے ہیں کہ ایران میں بھی اشتراکی دباؤ ہے۔ ایران کے تیل کے ذخیروں پر بھی روسیوں ہی کی نظر ہے۔ اور یہ الزام حرم امریکنوں اور انگریزوں کی زبانوں سے چل کر، سٹرلنگ اور ڈالر کی پیرو حکومتوں کی مخلوق کی زبانوں پر تیزی سے دوڑ جاتا ہے۔

اور غالباً سچ بھی یہی ہے، کیونکہ اس کے پیش نظر کہ امریکن اور انگریز ایرانیوں کے خاص مفاد کی خاطر، ایران کے تیل کے ذخائر پر قابض ہیں، تودہ TUDEH پارٹی کو روس کی پداحترامی ہی سے تحریک ملتی ہوگی ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے مخیر اداروں سے، جن سے شاہ ایران خود اس قدر خوش ہیں، شاہ ایران کی خادم اور مودب رعایا واقعی مطمئن نہ ہو۔

یہ بھی محض اتفاق ہی ہوگا کہ جہاں مغربی یورپین قوموں کی نوآبادیات تھیں، جہاں فرانسیسیوں اور ڈچ کے مقبوضات تھے، وہی امریکہ کے سرمائے، امریکہ کے جنگی سامان، امریکہ کی اشیاء کی منزل بھی نظر آتی ہے؟

ویت نام میں امریکی مدد فرانس کے اجارہ داروں ہی کو ملتی ہے، ڈچ حکومت انڈونیشیا سے دست بردار ہوجانے کے بعد بھی مغربی نیوگنی کے قبضہ پر قائم ہے، اور اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اتفاق ہی ہے انڈونیشیا کا یہ علاقہ جنگی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہی یو-این-او (U.N.O.) جو کوریا کی جنگ میں امریکہ سے کچھ دو قدم پیچھے، مگر امن کا پرچم بلند کئے ہوئے، پیش پیش ہے، کیا ہم یہ مان لیں کہ انڈونیشیا کے اس قومی اور جغرافیائی لحاظ سے ضروری علاقے کو ہالینڈ کے قبضہ سے چھڑانا، اس کے لئے کوریا کی جنگ سے زیادہ مشکل مہم ہے۔

کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ کوریا اور فارموسا کا قبضہ چین کے خلاف محاذ قائم کرنے میں جنگی زاویے سے نہایت مضبوط بنیاد ہے، جیسے جنرل میک آرتھر جو ان معاملات میں نہایت صاف گو ہیں، بارہا کہہ چکے ہیں؟

اس امریکہ کے مایہ ناز فوجی فرزانے کی ساحرانہ رائے میں مغربی بحرالکاہل (Western Pacific) کا دفاع، منفرد اور منقطع جنگی اڈوں سے نہیں ہو سکتا۔ اسے ایک ہی جنگی منظر تصور کرنا، لہذا ایک ہی مرکز پر لانا لابدی ہے۔ کیا یہ جنرل میک آرتھر کی خالص ذاتی آواز سمجھی جائے، یا ہم یہ سمجھیں کہ اس میں ٹرومین اور امریکی اجارہ‌داری کو بھی کچھ دخل ہے؟ چلئے اسے میک آرتھر کی ذاتی رائے ہی مان لیجئے، مگر یہ دنیا پر اب تک عیاں ہو گیا ہوگا، کہ امریکہ کی پالیسی اس وقت کوریا کی جنگ کے نرغے میں آئی ہوئی ہے۔ اور اپنے پیرو ممالک کے ساتھ اپنی ہی قیاس آرائیوں کا نشانہ بنی جاتی ہے۔

اِدھر جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دفاع کا ذکر خاص اُن لوگوں کی زبان پر ہے، جن کے خلاف اہالیان ایشیا ایک مدت سے مصروف عمل ہیں، اور جو امریکہ کے ساتھ ایشیا کی آزادی کا گلا گھونٹنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ آسٹریلیا، جہاں مدت تک کالے گورے کا سوال شدید ترین رہا ہے، تحریکات دفاع وسرپرستی میں پیش پیش ہے۔ اس کے وزرا پاکستان اور ہندوستان میں آ جا رہے ہیں۔ دولت متحدہ کی باہمی مدد اور سانجھی حفاظت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ مگر اس بار کچھ انگلستان اور آسٹریلیا کو مایوسی ہے۔ ایشیا کے لوگ بھی کچھ شکستہ خاطر سے نظر آتے ہیں۔ کچھ اعتماد میں کمی سی ہے۔ پاکستان کا مطالبہ کچھ سرکار برطانیہ کو راس نہیں آرہا ہے۔ پاکستان سے کشمیر کے فیصلے کو متحدہ دفاعی عمل کی شرط اساسی سمجھنے کی چوک ہو گئی ہے۔ مگر حکومت برطانیہ نے نہایت بے تکلفی سے کشمیر کے سوال کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ کیونکہ یہ سننے میں آیا ہے کہ "ایسی" محفلوں کا "بنیادی اصول" ہی اس کے خلاف ہے۔ اندرونی پھوٹ کا ذکر آپس میں منع ہے، کیونکہ پھوٹ کے ذکر سے "پھوٹ" پڑتی ہے۔ شگافوں اور دھبوں کا تذکرہ توہین آداب محفل ہے۔

اِدھر ایشیا میں، ٹرومن کے پوائنٹ فور (Point Four Programme) پروگرام کے وعدوں سے ایشیا کو امریکی سرمایہ کی منڈی بنانے کی کوشش ہے، اور اس کی مفلسی کو اینگلوامریکی بلاک کی جنگی طاقت میں تبدیل کرنے کی سعی۔ اُدھر یورپ میں، کہیں مارشل ایڈ (Marshal Aid) سے، کہیں بین‌الاقوامی بنکوں اور اقتصادی سرمایوں سے اور یورپین ادائیگی کی سکیم سے، کہیں مغربی جرمنی کی جنگجو قوتوں کو ڈھارس دے کر، کہیں ایٹلانٹک پیکٹ (Atlantic Pact) سے، کہیں شومان پلان کے کوئلے اور آہن کے اتحاد کے ساتھ ساتھ، جرمنی سے دیرینہ رقابت کو اخوت میں تبدیل کرتے ہوئے، مغربی یورپ کے بعد از جنگ کے بھکاری ممالک کو امریکی سرمائے، لہذا امریکی پالیسی کا دست نگر بنا کر، امریکہ محض دفاعی اخراجات پر مجبور کر رہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ جہاں یورپ امریکی صنعتی اشیاء کی خاصی محفوظ منڈی بنا جاتا ہے۔ یورپ کی اندرونی صنعتیں آہستہ آہستہ معطل ہوتی جاتی ہیں۔ امریکی ڈالر

کی مدد، باھمی معاھدوں کی تمام منزلوں کو آچکتی ھوئی' دفاعی ضرورتوں پر مرکوز ھوتی جاتی ھے۔ اور یورپ کی مفلسی کا سوال جوں کا توں کس مپرسی کے عالم میں جھانکتا کھڑا رہ جاتا ھے!

اکتیس دسمبر ۱۹۵۰ء کے "پاکستان ٹائمز" میں مابین انگلستان اور پاکستان امپیریل پرفیرنس (Imperial Preference) کے متعلق کراچی کے مباحثوں کا تذکرہ تھا۔ یہ کانفرنس نامکمل ھی رھی ھے۔ یعنی شاھی ترجیحات (Imperial Preference) کے محصول کا طوق ابھی ھماری تجارت کے گلے میں ھے۔ شاھی ترجیحات کے جاری رھنے کی اھمیت کیا ھے؟ بھی تا کہ ھماری تجارت کا دولت متحدہ سے باھر ممالک سے آزادانہ عمل ناممکن ھے؟ حالانکہ خاص حالات میں ھماری بنیادی صنعتی اور معاشرتی ترقی کا تقاضہ نیز طور پر اس کے برعکس ھو سکتا ھے۔ پھر بھی ان کڑی اقتصادی اور تجارتی زنجیروں کے باوجود' امریکہ بار بار ایک آزاد دنیا کا حوالہ دئے جاتا ھے۔ یہ وھی دنیا ھے جو امریکہ کی اقتصادی سرپرستی کے پروں کے نیچے' یا دم بخود بیٹھی ھے' یا تڑپ رھی ھے۔

امریکہ کو آجکل علاوہ اور خام مال کے' روئی کی اشد ضرورت ھے۔ امریکہ کے بہادر جنگجو سپوتوں کو میدان کارزار میں وردیوں اور کمبلوں کی ضرورت ھے۔ امریکہ میں روئی کی بنی ھوئی چیزوں کی قیمتیں بتدریج بڑھنے لگی تھیں۔ لہذا اس جنگ کی مہنگائی کے ڈرسے امریکن مارکیٹ میں افرا تفری پڑ رھی تھی۔ اندرونی خرید وفروخت دھڑا دھڑ زور پکڑ رھی تھی۔ قیمتوں کی بے طرح گرانی کا اندیشہ تھا۔ سو امریکہ اور پاکستان کے درمیان حال ھی میں ایک معاھدہ طے پایا ھے۔ تاکہ امریکہ کی اندرونی منڈی کی مہنگائی امریکہ کی رعایا کو محروم نہ رکھے' بیرونی پاکستانی منڈی کا خون بہنا' حل قرار پایا ھے۔ اب اس معاھدے سے پیشتر کے بارہ روپے کے بجائے ساٹھ روپے فی بوری کا محصول لیا جائے گا۔ قیاس کیجئے' کہ پاکستان کے اندرونی تجارتی کارندوں کے لئے' بونے اور کاتنے والوں کے لئے کیا رھے گا جسے منصفانہ طور پر تقسیم کیا جاسکے۔ موٹے موٹے پاکستانی تجار-نو پھر بھی شاید کچھ حاصل کر ھی لیں گے۔ اس معاھدے کے یہ الفاظ اور بھی قابل غور ھیں:-

'جس وقت بھی حکومت یہ دیکھے' کہ ایک معیاری رقم کی ضرورت پیدا ھوگئی ھے' آسے ایسی معیاری رقم مقرر کرنے کا اختیار حاصل ھے"

یعنی معاھدے کی روسے' باوجود محصول کے بارہ روپے کے بجائے ساٹھ روپے تک بڑھائے جانے کے' فی الحال بونے اور کاتنے والوں کی محنت کی اجرت میں کوئی کمی پیدا ھونے کا امکان نہیں ھے۔ لہذا اجرت کا کوئی ایسا معیار مقرر کرنا جس سے کم عوضانہ دینا قانون کی گرفت میں آسکے' فی الحال قطعاً غیر ضروری ھے!

امریکی تجارتی پالیسی محصول بڑھانے کے بہت حق میں ھے۔ ذرا اتنا فرق امریکہ اور بیرونی ممالک کے درمیان روا رکھا گیا ھے۔ کہ اپنے ھاں کے تو درآمد کے محصول بڑھائے جاتے ھیں' مگر یہی عنایت کی نظر بیرونی ممالک کی برآمد کے محصولوں پر رکھی جاتی ھے۔ تاکہ امریکہ کی جانب سرمایہ کا پلہ

دائمی طور پر جھکا رہے اور برعکس اسکے امریکی صنعتی اشیاء کی تجارت کی رو' مفلس ممالک کی منڈیوں کی اندرونی طاقت' ان کی قومی صنعت کی سکیمیں کچل کر رکھدے۔

یہی ہوگی وہ دفاعی "کوشش' یہی ہوگا وہ منصوبہ' حفاظت حقوق اقوام پسماندہ' جس کا قوم قوم' ملک ملک اس قدر شہرہ ہے۔ یعنی دولت متحدہ کی دفاعی کوششوں کا مقصد' سٹرلنگ کے قرض کی وفاشعارانہ ادائیگی کا جذبہ محرک' امریکہ کا ڈالر بدست خلوص' یہ سب، کچھ سمجھ میں آنے لگے۔ یعنی ہماری اپنی ھی حکومتوں کو ہمارے مفاد کے خلاف خرید لینے کی سازشیں اور پروگرام ہیں۔ ہمیں اپنی قومی معاشی' اقتصادی صنعتی بہبود اور ارتقا سے محفوظ رکھا جارہاہے!

امریکہ یورپ سے بھی ستھری ھی کر رہا ہے۔ شومان پلان سے دو نتائج نکلنے ہیں۔ جنگ! یا برق رفتاری سے یورپ کی مفلسی کا حل۔ مگر ہم دیکھتے کیا ہیں؟ نظر دوڑائیے۔ جرمنی کی آزادی کا اخلاقی قرض امریکہ اور یورپ کی پیرو اقوام نے یک لخت محسوس کر لیا ہے۔ جنرل آئزن ہاور کی قیادت میں تمام مغربی یورپ کی افواج کو جمع کرنے کا کھلے بندوں اعلان ہے۔ شومان پلان کے تخلیقی اور صنعتی مقاصد' اس کے مسیحائی امکانات' طاق نسیاں کا سرمایہ بنے جاتے ہیں!

ادھر تو امریکہ کا وافر سرمایہ' اس کا واضح اظہار برتری' برطانیہ کو یورپ کی مارکیٹ سے دھکیل کر اپنی پہلی نوآبادیات کا' ملایا کا راستہ دکھانے میں کامیاب ہے (ملایا جہاں وہ جنگی مقاصد کے لئے انمول اشیاء' ربڑ اور ٹین' برطانیہ کے دست شفقت کے منتظر ہیں') اور ادھر وہی امریکہ' اپنی سر زمین سے ہزاروں میل دور' اپنے سرمایہ سے' آلات حرب سے' افواج سے' اپنے رقیب برطانیہ کی مدد' ایشیائی اقوام کے خلاف تن دھی سے کر رہا ہے۔ یہ متضاد طریق عمل بیک وقت کیسے ممکن ہوا؟ یہ وہی ندامر دفاع ہیں' جن کے ذریعے سرمایہ دار امریکہ کی حکومت' تشنۂ سرمایہ اور اقتصادی مجبوریوں کی صید' حکومت برطانیہ' چھوٹے چھوٹے ممالک کی حکومتوں کی بے سروسامانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' بے مدار اقوام کی مخلوق کو' بیشتر مخلوق الارض کو' انکے بڑھتے ہوئے ترقی کے امکانات سے' ہر قسم کے تخلیقی اور مخلص لائحہ عمل سے محفوظ رکھنا چاھتی ہیں۔

آج زندگی کروٹ لے رہی ہے۔ ہمیں انتخاب کرنا ہے اور بہت جلد۔ کیا آج ہم اپنے ہی خلاف' معاشی اور اخلاقی اصول کے مصداق قومی جد و جہد کے خلاف' ان اینگلو۔ امریکی نام نہاد دفاعی کاوشوں کا ساتھ دیں گے' دولت متحدہ کی دفاعی تدابیر کے جھانسوں میں بار بار آتے رہیں گے۔ یا تب تک دم نہ لینگے' جب تک اس خداداد دولت پاکستان کو اجارہ داروں کے احسان سے' ان کے تحفظ سے' محفوظ اور پاک نہ کر دیں۔

کہیں سٹرلنگ اور ڈالر کی مدد سے دست بردار کئے جانے کا خوف' کہیں دولت متحدہ کی دفاع کا نعرہ' کہیں شاہی ترجیحات کا محصول' ان سب کے درمیان ہمارا قومی شعور چکرا کر رہ گیا ہے۔ ہماری تجارت' قومی مساواتی ارتقا کا زینہ ہونے کی بجائے اجارہ داروں اور دم توڑتی ہوئی طاقتوں کی

سیاست کی غلام ' اقتصادی آہنی دیوار ' اور قوم کے پاؤں میں زنجیر بن کر رہ گئی ہے ۔

آج دولت متحدہ کے اتحاد کی آزمائش ہے ۔ ہمارے قابل وزیراعظم نے اپنے رویہ سے نہایت مبارک قدم کی امید دلائی ہے ۔ کاش وہ اپنے عزم پر قائم رہیں ۔ دولت متحدہ کا رشتہ ' کشمیر کے مسئلہ کا بوجھ بھی کم کم برداشت کرتا نظر آتا ہے ۔ اب وہ وقت آگیا ہے ' کہ ہم آزمائی ہوئی چیزوں کی آزمائش پر قوم کا قیمتی وقت ضائع نہ کریں ۔ اور اپنی تجارت کی ذمہ داری کا بوجھ برطانیہ کے جھکے ہوئے کندھوں سے ہلکا کر کے ' کچھ خود بھی اپنی تجارتی ذمہ داری سنبھالیں ۔ دولت متحدہ اور امریکہ کے ڈالے ہوئے آہنی پردوں میں شگاف کریں ' اور باہر جھانک کر اپنی آزادی کے امکانات دیکھیں ۔ ان بے شمار مزارعوں کو , ان بیشمار مزدوروں کو ' جنکی ان تھک محنت میں اقتصادی ترقی کا راز ہے ' صنعتی ترقی کا حل ہے ' انہیں اسلام کے بنیادی اور سب سے بڑے مساوات کے اصول سے کام لیتے ہوئے ' انکی معاشی بہبود ' اور نہ صرف جمہوری استحقاق احتجاج وشنوائی ' بلکہ ان کے اس ازلی انسانی حق مساوات سے روشناس کرائیں ' جو کہ ہر اسلامی حکومت کا سب سے پہلا فرض ہے ' کیونکہ اسلامی حکومت بنیادی طور پر حکومت عامہ ہے ' سرکار عالیہ نہیں ——

ہاں آج ہمیں انتخاب کرنا ہے ۔ کہیں رنگینیوں کا تصور باندھتے ہوئے ' ہماری شاندار نوزائیدہ قوم کی ناؤ نہ الٹ جائے ؟

لہذا " اوراق نو " کا یہ پہلا شمارہ ' جس سے قبل شیخ عبد القادر مرحوم کی یاد میں ایک افتتاحی خاص نمبر نکل چکا ہے ' عام رسالوں کی روش سے ہٹ کر ' ان قومی اور بین الاقوامی تقاضوں کو مقدم رکھتے ہوئے ' میدان عمل میں داخل ہوتا ہے ۔ اور ادب کی ابدی اقدار کی عظمت کو یاد رکھتے ہوئے ' عمل کا خواہاں ہے ۔ ایسے نئے ادب کی تخلیق کے لئے راستہ پیدا کرنے کا مدعی ہے ' جس سے زندگی اور ادب میں فاصلہ کم ہو جائے ۔

ادب زندگی کی رفتار کا آئینہ ہے ۔ آج دنیا آئینہ میں اپنا جائزہ لیتی ہے ' تو اسے خون کا رنگ باقی تمام رنگوں پر بھاری نظر آتا ہے ۔ پھولوں کے رنگ ابھی مٹے نہیں مگر مٹائے جا رہے ہیں ۔ بہت دیر تک کے لئے مٹائے جا سکتے ہیں ۔ " اوراق نو " تفریح کا قائل ہے ' مگر اس تلخ حقیقت کو نہ بھولتے ہوئے ' عارضی بہاروں کے رنگ سے متاثر نہیں ہونا چاہتا ۔

ایک بہت بڑے سخن ور ' ہمارے اقبال ہی نے تو کہا تھا ؟

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے ۔

کسی بھی حقیقت کا پرزور اعلان کچھ اس حقیقت سے بڑھ جاتا ہے جس کا وہ اعلان ہوتا ہے ' اور کچھ اس حقیقت کے ضمن میں تشنگیٔ اظہار چھوڑ جاتا ہے ۔ اقبال یہاں سخن کے بارے میں کچھ سختی برت گئے ہیں ۔ مگر آج جب حکومت اپنی ہے ' آج جب ہمارے سامنے امید کی راہیں آزادی کی روشنی سے دمک اٹھی ہیں ' اقبال کے یہ الفاظ ہمارے قومی فرض کی طرف ایک واضح اشارہ کرتے ہیں ۔ اور ادب کو پٹی ہوئی روشوں اور محض سیر گلستاں سے بلا کر زندگی کی شاہراہ پر چلنے کی تحریک

دیتے ہیں۔

آج ہم اگر وقت کو گھور کر دیکھیں، تو اس نوزائیدہ مملکت پاکستان کی جوان اور تازہ دم قوم سے وہ للکار اٹھ سکتی ہے، جو چین کی انقلابی آواز سے بھی بڑھ کر، کل ایشیا تو، کل کائنات انسانی کو ہلا دے۔ آزادی کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر دے۔

فن و ادب ہمیشہ عارضی آوازوں کو چھوڑ کر وقت کی بلاتی ہوئی آواز کو سنتے رہے ہیں۔ "اوراق نو" کا ادیبوں اور فن کاروں سے یہی مطالبہ ہے۔ کہ وہ اپنی وسعت نظر اور رفتار قلم سے آج بھی یہ تمیز قائم رکھیں۔ اجارہ داری کے زردوز ماحول سے، قوموں کو، کل دنیا کو، بیک آواز و بصد نوع، نجات دلانے میں سیاسی رہبروں اور سپاہیوں کا ہاتھ بٹائیں۔ زمانے کے تقاضے کے زاویے سے، رہبروں کی رہبری، سپاہیوں کی سپہ گری، کو آزما اور پرکھ کر آگے بڑھیں۔ اور مغرب سے یوں مخاطب ہوں، کہ۔

● دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی
دکاں نہیں ہے

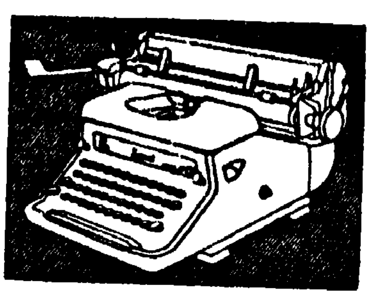
● کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب
زر کم عیار ہوگا۔

مگر اس رسالے کا مقصد سیاسی ہرگز نہیں ہے۔ اس میں صرف زندگی اور فن کی روش، ان کی اقدار، کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ سائنسی، اقتصادی، سماجی علوم اور جملہ فنون لطیفہ کے ماہروں سے معاونت کا مطالبہ ہے۔ داخلی یا خارجی غیر صالح اور صالح سیاسی، سماجی، علمی، فنی، معاشی، اور جملہ اہم اثرات میں تمیز کرنے کی خواہش ہے۔ یہ اداریہ عام اداریہ نہیں ہے، کیونکہ اس رسالے کا مقصد عام رسائل کے مقصد سے مختلف ہے۔

مضامین کی فہرست، فہرست کے کالم میں ہے۔ مضامین خود اپنی ترجمانی کر رہے ہیں۔ لہذا یہ اداریہ مضامین اور نظموں اور تصاویر کی ترجمانی، خود انہی پر چھوڑتا ہے۔ یہ اداریہ "اوراق نو" کی آواز ہے۔ زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی کے لئے احتجاج ہے۔ وقت کی پکارتی ہوئی آواز کو سننے اور سنانے کی کوشش ہے :—

● " اردو ٹائپ "

محسن اردو شیخ عبدالقادر مرحوم نے فرمایا تھا کہ اردو زبان کو متمدن دنیا میں مقبول بنانے کے لئے جدیدترین طباعت کی ضرورت ہے۔ جو ٹائپ کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ ٹائپ کی چھپائی جاذب نظر ہونے کے علاوہ طباعت اور پیشکش کے تمام محاسن کی ضامن ہے۔ "اوراق نو" کی طباعت کو دیکھ کر آپ ٹائپ کی اہمیت اور خوبیوں کا اندازہ کر سکیں گے۔ اردو ٹائپ کو مقبول بنا کر "لیتھو کے سنگ گراں" سے نجات حاصل کیجئے اور اردو زبان کی ترویج کے لئے نیا راستہ نکالئے —



محمد حسن عسکری

مسلمان اور ترقی پسندی

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس سوال پر غور کرنا ہی بیکار ہے کہ مسلمانوں پر ترقی پسندی کا کیا اثر پڑا ـ کیونکہ ترقی پسندی بہر حال ایک ادبی تحریک تھی ـ اور ہماری قوم کی غالب اکثریت ناخوالدہ ہے ـ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ قوم کی ناخواندہ اکثریت پر بھی ایک ادبی تحریک کا اثر پڑ سکتا ہے ـ بشرطیکہ وہ ادبی تحریک قوم کی مجموعی زندگی ور پورے کلچر سے ابھری ہو ـ ترقی پسندی اس سم کی تحریک نہیں تھی ـ اس تحریک نے اپنی توجہ قومی زندگی کے صرف چند پہلوؤں تک ر نوز رکھی تھی ـ اور یہ پہلو ایسے تھے کہ نکی طرف توجہ دلانے کیلئے کسی ادبی تحریک سے زیادہ نتیجہ خیز سیاسی تحریکیں یا انسے بھی یادہ عالمگیر واقعات ہوتے ہیں ـ اگر مسلمانوں یں کسی حد تک معاشی انصاف یا سیاسی ساوات کا مطالبہ پیدا ہوا تو اس میں ترقی سند تحریک کو زیادہ دخل نہیں ہے ـ س تحریک کا دائرۂ عمل اور دائرۂ اثر تعلیم تہ نوجوانوں تک محدود رہا ہے ـ اس طبقے و آپ پوری قومی زندگی میں جو اہمیت اور گہ دیں اسی کے اعتبار سے آپ یہ جان کینگے کہ مسلمانوں پر ترقی پسندی نے کیا ۔ کتنا اثر کیا ـ چونکہ ترقی پسندوں اور ان ہ متاثر ہونے والے طبقے کی حمایت کے بغیر کستان بن گیا ـ اس لئے ایک طرح آپ کہہ کتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے مسلمانوں مجموعی حیثیت سے کوئی گہرا اور وسیع اثر یں ڈالا ـ لیکن چونکہ اس تحریک سے متاثر ونے والا طبقہ بعض معنوں میں قوم کا حساس



ترین اور ذہین ترین طبقہ تھا ـ اور اگر یہ طبقہ شروع سے ہماری آزادی کی جدو جہد میں شامل ہوتا تو ہمیں پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد شاید بہت سی دشواریاں پیش نہ آتیں یا ہمارے بعض مسائل اتنی پیچیدگی اختیار نہ کرتے ـ وہی تخلیقی صلاحیتیں جو آج ہمارے لئے نقصان رساں نہ سہی تو کم سے کم معطل ضرور ہیں ـ تعمیری مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو سکتی تھیں ـ اگر ہم اس مسئلے پر اس حیثیت سے غور کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے مسلمانوں پر خاصا گہرا اثر کیا ہے ـ جو وسیع نہ سہی مگر نتائج کے اعتبار سے شدید ضرور ہے ـ وہ اسطرح کہ ترقی پسند تحریک نے بہت سے کارآمد نوجوانوں کو قوم کی زندگی سے الگ

کردیا ہے ۔ اور انہیں ایک ایسی لا یعنی کشمکش میں مبتلا کردیا ہے کہ کوئی ایسا کارنامہ تو الگ رہا جو پوری قومی زندگی کے لئے اہم ہو۔ یہ لوگ فی الجملہ کوئی اچھا افسانہ یا اچھی نظم تخلیق کرنے تک سے قاصر ہو کر رہ گئے ہیں۔

ترقی پسندی نے مسلمانوں پر کیا اثر ڈالا۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب ترقی پسندی کی تحریک شروع ہوئی تو اس وقت مسلمانوں کی کیفیت کیا تھی۔ مختصرا یوں سمجھئے کہ غدر کے بعد سے لے کر خلافت کی تحریک تک مسلمانوں کا حساس ترین طبقہ قوم کی روزانہ اور مجموعی زندگی سے بے تعلق ہوتا چلا گیا تھا۔ اسی بے تعلقی نے جمالیت پرستی کی تحریک پیدا کی ۔ اور ایسے ادب کو فروغ دیا جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے ۔ بہر حال ایک بات ضرور تھی ۔ یہ جمال پرست قوم کی زندگی سے تو بے تعلق تھے ۔ مگر قوم کی سیاسی امنگوں سے بے تعلق نہیں تھے ۔ اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے ۔ جب مسلمان من حیث القوم سیاست سے الگ ہو گئے ۔ یہ دور یوں تو پوری قوم کے لئے انتہائی تشویش ناک تھا ۔ اور مسلمان یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آخر زندگی میں ہماری جگہ کیا ہے ۔ مگر اس زمانے کا ادب تو اتنا پھس پھسا ہے کہ اردو میں اس کی مثال نہیں مل سکتی ۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ادب کی حالت میں تو کوئی فرق نہیں ایا البتہ بعض ادیبوں کے رویے میں اتنی تبدیلی ہوئی کہ وہ مسلمانوں سے تعلق رکھنا ہی شرم کی بات سمجھنے لگے ۔ ان کے خیال میں مسلمان ہونا سیاسی رجعت پسندی اور سرکارپرستی کا دوسرا نام تھا ۔ چنانچہ یہ لوگ سیاست اور کلچر دونوں میں ہندوؤں کے مقلد بن گئے ۔

۱۹۳۶ء کے قریب حالات نے ایک پلٹا کھایا ۔ مسلمان اندر ہی اندر اس فکر میں تھے کہ ہمیں کوئی ایسا نسخہ مل جائے جس میں ہماری خودداری بھی ہاتھ سے نہ جائے اور ہمارا جمود اور تعطل بھی دور ہو جائے اتفاق سے ۱۹۳۰ء کے قریب پوری دنیا میں اشتراکیت کی ایک زبردست لہر پیدا ہوئی تھی۔ اس لہر میں یوں تو ہندو۔ سکھ ۔ پارسی سبھی مذہبوں کے نوجوان بہہ گئے لیکن مسلمان نوجوانوں کے لئے اشتراکیت میں ایک تسکین کا پہلو یہ تھا کہ اشتراکیت میں مذہب کا کوئی سوال نہیں تھا ۔ بلکہ اس زمانے میں تو اکثر اشتراکیوں کو امید تھی کہ ہماری تحریک مذہبوں کو بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیگی۔ چنانچہ بعض حساس مسلمان نوجوانوں نے سمجھا کہ اشتراکی تحریک میں شامل ہو کر ہم ہندوؤں کے سامنے سر جھکائے بغیر مساویانہ حیثیت سے ان کے پہلو بہ پہلو کام کر سکیں گے۔ اور ہمارا وجود جس طرح ناکارہ اور بے معنی بن کے رہ گیا ہے وہ بات بھی دور ہو جائیگی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک صرف اس وجہ سے اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے پیدا ہوئی ۔ یہ تو بہت سے پیچیدہ ذہنی عوامل میں سے ایک عمل تھا ۔ ہم اسے یہاں اس لئے اہمیت دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی میں ترقی پسند تحریک کی جگہ متعین کرنا چاہتے ہیں ۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے ۔ بعض حضرات کو اعتراض ہوگا کہ آخر میں سیاسی عوامل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔حالانکہ بحث ایک ادبی تحریک سے ہے۔ ویسے بھی ایک بزرگ نے ایک دفعہ مجھے نصیحت کی تھی کہ تم اپنے مضمونوں میں پاکستان کی تعمیر و تخریب کا اتنا ذکر کیوں کرتے ہو ۔ تمہیں تو بس ادب سے تعلق رکھنا

امنے انہوں نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ عصمت چغتائی کے افسانوں سے ہم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے میں سیاست کا کیا رنگ تھا۔ لیکن میری گزارش ہے کہ اگر اس زمانے میں ایک خاص قسم کے سیاسی اور عمرانی خیالات رائج نہ ہوتے تو عصمت چغتائی کے یہ افسانے پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ادیب کو سیاست اور عموماً سیاسی جماعتوں سے آزاد رکھنے کی ر تو مجھے بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو ادیب کام سے ہم مارے زمانے میں اپنے شعور کو سیاست سے متعلق رکھنا چاہتا ہے۔ وہ معنی خیز پیدا نہیں کر سکتا۔ اس بات کا اس سے ا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ہمارے زمانے وہ بڑے بڑے ادیب جن پر جمالی پرستی، ابہام پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سب اسی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً کیٹس۔ فلوبیئر۔ جوئس۔ ایلیٹ وغیرہ سب ادیب سیاسی جماعتوں کو نہیں بلکہ بڑے بڑے سیاسی عوامل کو اپنے دائرہ فکر اور دائرہ احساس سے خارج کر دیتا ہے۔ وہ گویا زندگی کو تنگ اور چھوٹے سے چھوٹا بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ ۱۹۳۶ء تک ہمارا ادب اسی طرح بے جان رہا اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ادیبوں کی توجہ انفرادی زندگی کی چھوٹی چھوٹی لذتوں تک محدود رہ گئی۔ اور ان کے دل میں یہ خواہش بالکل مر گئی کہ واقعے کو کسی وسیع تر پس منظر کے ساتھ رکھکر یا اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے حقائق کے مقابل رکھکر دیکھ سکیں۔ انہوں نے سیاست اور مذہب دونوں سے کنارہ کش ہونا چاہا۔ اور یہی دو چیزیں تھیں جو اجتماعی زندگی سے متعلق کر سکتی تھیں۔

چنانچہ ان کا ادب ہوتے ہوتے کم آب ہو کر رہ گیا۔ اس کے برخلاف ترقی پسند تحریک نے کم سے کم سیاست کو خصوصیت کے ساتھ ادیب کی توجہ کا مستحق سمجھا۔ اس لئے اس تحریک کے ابتدائی زمانے میں جو ادبی تخلیقات سامنے آئیں۔ ان میں ایک نیا جوش۔ ولولہ۔ امنگ اور تازگی تھی ان ادیبوں نے اور کچھ نہیں کیا۔ تو کم سے کم ادب کے دائرہ نظر کو تو وسیع کیا۔ چند ٹھوس حقیقتوں کی طرف تو توجہ دلائی۔ ادب کو اس احمقانہ سادگی اور سادہ دلی سے تو نجات دلائی جو کم و بیش بیس سال سے ہمارے ادب پر مسلط ہو کے رہ گئی تھی۔ پوری سنجیدگی اور ذمہ داری سے نہ سہی تو کسی نہ کسی حد تک تو ان لوگوں نے چند ایسے عوامل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جو اجتماعی زندگی میں جاری و ساری تھے۔ دراصل سمجھنے اور سمجھانے کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا۔ شاید اس لفظ سے اس عمل کی پوری وضاحت نہیں ہوتی۔ جو ادب لکھتے اور پڑھتے وقت ہمارے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان لوگوں نے اجتماعی زندگی کے چند عوامل کی تجسیم کی۔ اور انہیں ٹھوس ادبی شکل میں پیش کیا۔ یہ عمل صحت مند اور متوازن اجتماعی زندگی کے لئے نہایت اہم اور لازمی ہے۔ محض عالمانہ افہام و تفہیم اس عمل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ عمرانیات کے عالموں کے لئے ان اجتماعی عوامل سے پیدا ہونے والے ذہنی، جذباتی اور حیاتی مرکبات تک پہنچنا ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس تحریک کے ابتدائی زمانے میں اس تحریک کی مخالفت کی انہوں نے اس حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھا اور غلط قسم کی نکتہ چینی کر کے ترقی پسندوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے آپ کو شہید بھی سمجھنے لگیں۔

خیر، اب اور بات کی تصریح ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں نے اس تحریک کو تخلیقی اعتبار سے وسعت دی اور ٹھوس بنایا اور جن لوگوں نے اس تحریک سے اثر لیا، ان کی اشتراکیت کس قسم کی تھی؟ جو لوگ اپنے آپ کو اس تحریک کا سرگروہ یا رہنما ظاہر کرتے تھے ان کی تو بات چھوڑیئے، مگر جن لوگوں کو اس تحریک سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ چپکے ہوئے نہیں تھے اور نہ اپنے آپ کو کسی سیاسی رہنما کا مقلد سمجھتے تھے۔ فی الجملہ ان لوگوں کی اشتراکیت جذباتی قسم کی تھی۔ اسے اشتراکیت نہیں بلکہ اشتراکیت سے حسن ظن کہنا چاہئے۔ منٹو صاحب کو تو طبعاً رہنماؤں اور مقلدوں دونوں سے بیر ہے۔ وہ ایک مبہم طریقے سے سیاسی اور معاشی انصاف کے قائل تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور آج بھی ان کا رویہ یہی ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ میں ترقی پسندی کے معنی ہی نہیں سمجھتا۔ عصمت چغتائی صاحبہ فی الحال تو متشدد قسم کی کمیونسٹ ہیں۔ لیکن دو تین سال پہلے ان کا رویہ بھی لفظ بہ لفظ یہی تھا۔ اس ضمن میں اپنا نام لیتے ہوئے مجھے شرم تو آتی ہے لیکن اپنا ذکر میں ایک مقتدر ادیب کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ بلکہ ایک عام لکھنے والے کی حیثیت سے کر رہا ہوں تاکہ ایک عمومی رجحان کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ پھر مجھے اتنی جسارت یوں بھی ہوتی ہے کہ میرے افسانے سب سے پہلے تحریک کے سرکاری پرچے 'نیا ادب' ہی نے شائع کئے۔ اور تحریک کے سرکاری رہنما سجاد ظہیر صاحب نے ہمیشہ مجھ پر بڑی شفقت فرمائی۔ خیر، نو میں نے اشتراکیت مارکس سے نہیں بلکہ ایچ۔ جی۔ ویلز سے سیکھی تھی۔ جنہیں کمیونسٹ لوگ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۳ء تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری کون ہے۔ میرے خیال میں اس تحریک کے زیر اثر آنے والے لوگ عام طور سے انصاف اور مساوات چاہتے تھے۔ انہیں کسی خاص سیاسی جماعت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔

لیکن یہ رجحان بھی بہت عام تھا کہ مذہب کو اجتماعی زندگی کے اہم عوامل اور مظاہر میں سے نہ سمجھا جائے ایسے لوگ تو بہت کم تھے جو شدید طور پر لامذہب ہوں یا دہریت کا اعلان کرتے ہوں۔ البتہ مذہب سے بے پروائی عام تھی۔ مگر اتفاق سے یہی وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں کی قومی تحریک مسلم لیگ بھی زور پکڑ رہی تھی۔ اور اسنے مذہب اور اس مذہب سے پیدا ہونے والے کلچر کی بنیاد پر اپنے چند سیاسی مطالبات ترتیب دئیے تھے اتفاق سے اس زمانے میں مسلمان عوام اپنے مذہبی اور تہذیبی وجود کے تحفظ کو اپنے معاشی اور سیاسی حقوق کے حصول سے زیاد اہم سمجھ رہے تھے۔ یہ چیز ہمارے ترقی پسند ادیبوں کے لئے بڑی پریشان کن تھی ان کے تصور حیات میں مذہب کی حیثیت فروع تھی۔ لیکن یہ حضرات اپنے آپ کو جن لوگو کا نمائندہ سمجھتے تھے ان کی نظر میں مذہب کا درجہ معاشی انصاف سے بھی بلند ت ممکن ہے مسلمان عوام فریب خوردہ ہوں سوچنے سمجھنے کی طاقت نہ رکھتے ہ یا جو کچھ بھی ہو۔ بہر حال حقیقت اور صو حال یہ تھی۔ ترقی پسندوں کے لئے بڑا پیچ

مسئلہ تھا۔ اگر وہ اپنی نظر میں وسعت اور **اجتماعی زندگی** کی **پیچیدگیوں** کا حقیقت آگیں **اور ٹھوس احساس پیدا کرنے تو** ممکن تھا کہ ان کا ذہنی انتشار بھی ختم ہو جاتا اور کوئی ایسی راہ نکل آتی جو اجتماعی طور سے مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہوتی اور ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیوں کے لئے بھی - لیکن ترقی پسندوں کے لئے حقیقت سے کنارہ کشی آسان تھی۔ بنے بنائے نظریوں کو چھوڑ کر نئے تصورات کی تلاش میں اپنے ذہن کو حرکت دینا مشکل تھا عوام اپنا تصور حیات نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ترقی پسند اپنے نظریوں سے کنارہ کشی نہیں ہو سکتے تھے - چنانچہ ترقی پسندوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا کہ وہ حقیقت کو مجموعی طور سے نہ دیکھیں۔ بلکہ حقیقت کے جزوی مشاہدے سے مطمئن ہو جائیں۔ حقیقت کے بعض پہلوؤں سے بالکل بے حس رہنا اور بات ہے۔ شاید اس سے اس قسم کا ذہنی انتشار بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ترقی پسند کو حقیقت کے ان پہلوؤں کے وجود کا احساس تھا۔ مگر اپنے نظریوں کی سلامتی کونسل کی خاطر وہ ان پہلوؤں سے جان بوجھ کر آنکھ چراتے تھے۔ حقیقت سے اس طرح آنکھیں چرانا ادب کے لئے بھی مہلک ہے۔ اور زندگی کے لئے بھی۔ ایسے ادیب جو حقیقت سے آنکھیں چار نہ کرسکیں زندگی کو تو کیا بدلیں گے۔ ادب کو بھی نہیں سنبھال سکتے۔

میں نے کہا تھا کہ ۱۹۳۶ء سے پہلے ہمیں مسلمانوں میں ایسے ادیب ملتے ہیں۔ جو قوم کی روزانہ زندگی اور بھرپور زندگی سے تو الگ ہیں۔ مگر سیاست میں قوم کے ساتھ ہیں۔ ۳۶ء کے بعد ہمیں ایسے ادیب نظر آتے ہیں۔ جو قوم کی روزانہ زندگی سے تو دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کے بعض پہلوؤں کو تشکیل دیتے ہیں۔ مگر قوم کے سیاسی عزائم کے خلاف ہیں۔ یا ان سے پوری طرح بیگانہ ہیں۔ کوئی اور سرزمین ہوتی جہاں دو مختلف قومیں اور تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوتیں تو یہ رویہ بھی چل سکتا تھا۔ ادیب قوم کی سیاست میں ساتھ نہ دیتے تو کم سے کم اس کی مجموعی تہذیبی زندگی میں شامل ہونے کا کم سے کم اسے قابل غور تو سمجھتے مگر ہند و پاک برصغیر میں تو لازمی تھا۔ کہ ادیب زیادہ احساس مندی سے کام لیں اور حقیقت کو مجموعی طور سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن ترقی پسندوں نے اپنے نظریوں کی شکست سے ڈر کر اور ذہنی قوت خرچ کرنے سے گھبرا کر عجیب سی رویہ اختیار کیا۔ قوم کی سیاست سے الگ رہنا تو خیر پہلے بھی ایسی نئی بات نہیں تھی۔ انہوں نے تہذیبوں کے اس تصادم ہی سے انکار کر دیا۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو مسلمانوں کی مجموعی تہذیب کے تصور کو قابل قبول نہ پایا۔ چنانچہ جب پاکستان بنا تو ان لوگوں کو ذہنی صدمہ پہنچنا ہی چاہئے تھا۔ ترقی پسندوں کے سیاسی رہنماؤں کو چھوڑ دیجئے' تمام ترقی پسندوں کو پاکستان کا قیام کسی بدنیتی یا بدبینی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نظریوں کے مجروح ہونے کی وجہ سے ناگوار گذرا۔

تو آج صورت حال یہ ہے کہ جو تحریک عوام کی نمائندگی کے لئے اٹھی تھی۔ پاکستان میں عوام کو اپنا مخالف نہیں تو بیگانہ ضرور پاتی ہے۔ مسلمان قوم اور مسلمان ترقی پسندوں میں اس سے زیادہ خلیج اور کیا ہوگی۔ جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ صرف

بھی ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنی ادبی حیثیت سخنی سے قائم نہیں رکھی - اور سیاسی نظریوں کی طرف ڈھلکتے چلے گئے ۔ یہ عجیب قسم کے ادیب ہیں - جو احساسات اور تجربات سے بچتے ہیں ۔ محض اس لئے کہ نظریوں کے گڈ مڈ ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ اگر ان لوگوں نے اپنے آپ کو سیاسی نظریوں کا پابند نہ بنایا ہوتا اور ادیبوں کی طرح آزادی سے بڑھ کر نئے تجربات کو قبول کیا ہوتا ۔ حقیقت کو مجموعی حیثیت سے اور سیاسی تصورات کے پردے اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی ہوتی تو یہ نا ممکن تھا کہ انہیں مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی ضروریات کے ساتھ روحانی ضرورتوں کا احساس بھی پیدا نہ ہوتا ۔ کیونکہ پاکستان ایک بات میں بالکل بے نظیر ہے - انسان کی تاریخ میں ہمیں اور کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ انسانوں کے ایک گروہ نے خالص طور سے چند غیر مادی تصورات کو محفوظ رکھنے کے لئے اتنی زبردست قربانیاں دے کر اور بڑے سے بڑے خطرات مول لیکر ایک الگ مملکت بنائی ہو - اور اس مملکت اور ان تصورات کو مستحکم بنانے کے لئے وہ گروہ ابھی تک قربانیاں دینے کو آمادہ ہو - اور اس حد تک آمادہ ہو کہ بعض دفعہ اپنے معاشی حقوق کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہو -

جارج برنارڈ شا



جسکی موت کیساتھ ایک دور کا خاتمہ ہو گیا — -

خود نوشتہ کتبہ !

جارج برنارڈ شاہ

”آخر وہ تھا کون ؟“

”لوگ مجھے پوچھتے ہیں کہ میں اپنے سوانح حیات کیوں نہیں لکھتا - میرا جواب یہی ہوتا ہے کہ میری زندگی چنداں دلچسپ نہیں - میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور مجھے کسی غیر معمولی حادثے نے آنہیں لیا -

جہانتک میری ذات کا تعلق ہے میری متاع حیات کتابوں کی الماریوں اور سٹیج پر بکھری پڑی ہے - مجھے جو کچھ پہنچانا تھا اس طویل زندگی میں پہنچا چکا ہوں جسکے متعلق میں شاید یہ نہ کہہ سکوں کہ کوئی دن ایسا گذرا ہے جب میں نے کچھ نہ لکھا ہو -

تمام خود نوشت سوانح جھوٹ ہوتے ہیں اور اس سے میرا مطلب لاشعوری یا غیرارادی غلطی سے نہیں بلکہ دانستہ جھوٹ ۔ کوئی شخص اتنا برا نہیں ہوسکتا کہ اپنی زندگی میں اپنے بارے میں سچ کہہ دے — سچ جو اسکے خاندان ۔ اسکے احباب اور جلیسوں کو لامحالہ بے نقاب کردیتا ہے - اور کوئی شخص اتنا نیک نہیں ہوسکتا کہ وہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں صداقت کا ایک ایسا مسودہ دے جائے جسکو وہ اسوقت تک منظر عام پر نہ لائے جبتک کوئی شخص اسکی تردید کے لئے زندہ نہ ہو -

(انگریزی سے ترجمہ)

عبداللہ بٹ

انسانی تہذیب میں کتب خانوں کی اہمیت



سوں اور ملکوں کے عروج و زوال کی
میدان جنگ کے فیصلوں کو بہت بڑا
ہے - اس داستان میں بعض ایسی قوموں
حالات بھی ملتے ہیں - جنہوں نے محض
بل بوتے پر تسخیر عالم کی مہمیں
ں - اور زمین کے وسیع علاقوں پر قبضہ
لیکن وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر
سکیں اور ان کی یہ فتوحات دیر پا
ت نہ ہوئیں - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ
تھی کہ ان مہموں کی تحریک کسی
مربوط و مرتب عقیدے کی وجہ سے نہ ہوئی
تھی - بلکہ ہوس ملک گیری کا ایک وحشیانہ
جذبہ تھا - جس سے ان کے قدم کچھ دیر کے
لئے آگے بڑھتے گئے - مذہبی - سیاسی یا قومی
عقائد کی تخم ریزی لائبریری ہی میں ہوتی
ہے - لائبریری کے کمروں میں قوموں کے ذہن
ترقی و تہذیب کے سانچے میں ڈھالے جاتے
ہیں - فیکٹری اور کارخانے کی پیداوار جسموں

نہیں کرسکتی۔ تلوار کا وار روکا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا حملہ جسم پر ہوتا ہے۔ لیکن عقیدے کا وار کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ کہ اس کا وار ذہن پر ہوتا ہے - اور جن قوموں کے پاس اپنے ایمان اور عقیدے کی ڈھال موجود ہو۔ بیرونی حملوں کی کوئی شدت ان کے عزائم کو متزلزل نہیں کر سکتی - اور ظاہر ہے کہ ذہن کی تعلیم و تربیت ایوان مطالعہ ہی میں ہو سکتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تلوار نے قلم کی طاقت کے سامنے ہمیشہ اپنا سر خم کیا ہے - انسانی تہذیب میں کتب خانوں کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ کتب خانوں کی تاریخ انسانی تہذیب کے ارتقا کی داستان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

فن تحریر کا آغاز

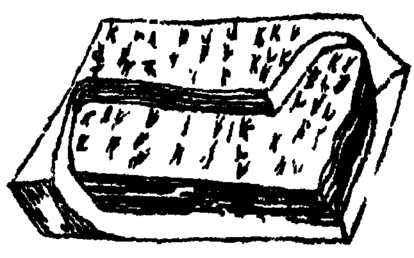
دنیا میں جب تہذیب نے جنم لیا - اور لکھنے پڑھنے کی ضرورت نے وقت اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو جن سانچوں میں ڈھالا اس کا ریکارڈ ہمارے سامنے موجود ہے - دنیا میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کی کہانی اسی ریکارڈ سے مرتب ہوئی ہے۔ چنانچہ کیش اور ار کی کھدائیوں نے طوفان نوح سے پہلے کی تحریروں کو بھی منظر عام پر لا رکھا ہے - مصر میں مسیح کی پیدائش سے اڑھائی ہزار برس پہلے کی تحریریں برآمد ہوئیں ہیں - یہ تحریریں پیپر پر لکھی ہوئی ہیں۔ جو ایک قسم کا درخت ہے - جس کے چھلکوں کو تحریروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا - میسو پوٹیمیا میں جن تحریروں کا پتہ چلا ہے وہ زیادہ تر تاجرانہ نوعیت کی ہیں۔ یاپھر ان پر مختلف عبادت گاہوں کی تعمیر سے متعلق کچھ یاد داشتیں ہیں۔ تحریروں کے ان مجموعوں کو مختلف عبادت گاہوں یا شاہی محلات میں رکھ دیا جاتا تھا - ان ہی مجموعوں میں موجودہ زمانے کی لائبریری کے جراثیم موجود تھے۔ جو اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد موجودہ شکل و صورت میں ہمارے سامنے ہیں -

اہرام مصر میں مقدس تحریروں کے مجموعے پروہتوں کی نگرانی میں دے دئے جاتے تھے۔ جو کہ ان کی دیکھ بھال کرتے اور ان کے منتظم کی حیثیت سے کام کرتے تھے - وادی نیل کی سب سے پہلی لائبریری یہی تھی - لائبریریوں کی تاریخ مرتب کرتے وقت سب سے پہلی شہادت مصر اور میسو پوٹیمیا ہی سے ملتی ہے - کیونکہ تحریروں کو جمع کرنے کا منظم طریقہ یہیں رائج تھا - اور یہی چیز آئندہ لائبریری کی بنیاد قرار پائی - ممکن ہے کہ مزید تحقیق ہمارے وضع کردہ اصول کو بدل دے - اور ہمیں اس وقت سے پہلے کی کسی لائبریری کا پتہ چل جائے لیکن اس وقت تک جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں - ان کی روشنی میں ہم اسے ہی بنیاد کا پتھر قرار دیتے ہیں - ۱۹۰۰ء میں فرات کے کنارے ایک لائبریری کے وجود کا پتہ چلا - جس میں تیس ہزار تاجرانہ تحریروں کے علاوہ کئی ہزار ادبی تحریریں بھی برآمد ہوئیں - یہ تحریریں مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوتی تھیں چنانچہ اشور بنی پال کے محل کا ایک بڑا کمرہ ان تختیوں سے بھرا ہوا تھا - ابڈ نو کے مقام پر جو لائبریری برآمد ہوئی تو اسمیں تحریرات کی ایک فہرست بھی ملی - جو ترتیب کے ساتھ دیوار پر درج تھی - اسی طرح تل العمارہ کے مقام پر جو لائبریری ملی - اس میں دربار مصر اور شام کے گورنروں کی خط و کتابت بھی موجود تھی - تعجب ہے کہ یونان اور روم کو مرعوب کرسکتی ہے - لیکن دلوں کی تسخیر

میں جو بعد میں اپنی علمی اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور ہوئے ۔ اس زمانے میں لائبریریوں کا کوئی پتہ نہیں ملتا ۔ اور ارسطو سے پہلے کوئی ایسی شہادت نہیں کہ کسی شخص کے پاس لائبریری موجود ہو ۔ لیکن یونان کی قدیم تاریخ اسکندریہ کی لائبریری سے ہی مرتب ہوئی تھی ۔

یہ تحریریں ایک خاص قسم کی چکنی مٹی سے تیار کی ہوئی تختیوں پر درج ہوتی تھیں ۔ ان تختیوں کا رقبہ چند مربع انچ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا ۔ بعض تحریریں گلاس سے ملتے جلتے برتنوں پر بھی درج ہیں ۔ قلم کی جگہ ایک نوکیلا آلہ استعمال کیا جاتا تھا ۔ مصر میں اس کام کے لئے پیپرس استعمال ہوتا تھا ۔ اور اس پر تمام تحریریں سیاہی سے لکھی ہوئی ہیں ۔

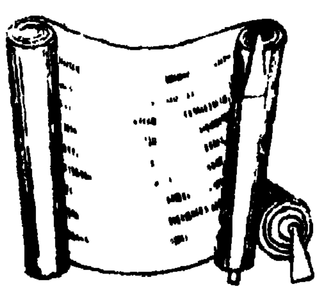
پیپرس کے استعمال میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا خوف نسبتاً بہت کم تھا اور اسے کسی حد تک تہ بھی کر لیا جاتا تھا ۔ یہی طریقہ بعد میں یونان اور روم نے اختیار کیا ۔ فلسطین میں یہ تحریریں جانوروں کی کھالوں پرلکھی جاتی تھیں ۔ یہ طریقہ پائداری کے اعتبار سے پہلے دونوں طریقوں سے بہتر تھا ۔



فن تحریر کا آغاز

سکندریہ کی لائبریری

تاریخ کی تمام لائبریریوں میں اسکندریہ لائبریری نہایت اہم اور نمایاں ہے ۔ اشوری بادشاہوں اور مصری پروہتوں کو چھوڑ کر یہ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری تھی ۔ جس کی بنیاد بطلیموس اول نے رکھی تھی ۔ بطلیموس دوئم نے اس لائبریری میں معتد بہ اضافہ کیا اور دنیا کے دوسرے حصوں سے کتابیں سمیٹ کر اس میں جمع کردیں ۔ اس میں مسودات اور تحریروں کی مجموعی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ سے سات لاکھ کے درمیان لگایا گیا ہے ۔ اس لائبریری کی بدولت اسکندریہ یونانی علوم کا مرکز بن گیا ۔ اور بڑے بڑے ادیب اور شاعر اس میں جمع ہو گئے ۔ ایشیائے کوچک میں اس کے مقابلے کی ایک اور لائبریری موجود تھی ۔ جو برگامون کے مقام پر واقع تھی ۔ یہ لائبریری بھی اپنی وسعت اور عظمت کے اعتبار سے کافی اہم تھی ۔ اس لائبریری کے ساتھ عشق و محبت کی دلفریب داستان وابستہ ہے ۔ انطونی اور قلو پطرہ کا تعلق کتاب عشق کا ایک نہایت حسین باب ہے ۔ آسمان محبت کے یہ دو ستارے اپنی تابندگی کے باعث آج بھی وارفتگان جادۂ محبت کی راہنمائی کرتے ہیں ۔ یہ روایت ہے کہ انطونی نے علم و ادب کا یہ ذخیرہ اپنی محبوبہ کے قدموں میں رکھ دیا ۔ عشق کی یہ پیشکش حسن کے حضور میں قبول ہوئی اور اسے اسکندریہ کی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ۔ اسکندریہ کی لائبریری علمی اور تاریخی ذخیرے کے باعث اور بھی اہم ہو گئی ۔ اور اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ۔



جب تہذیب نے جنم لیا

رومیوں کے عہد میں لائبریریوں کا شوق زیادہ ہوتا گیا۔ اور شخصی لائبریریوں نے خوب فروغ حاصل کیا۔ اس زمانے میں لائبریری ہر مہذب امیر کا ایک ضروری جزو بن چکی تھی اور اس کے بغیر کوئی گھرانہ مہذب نہیں کہلا سکتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی تک پیپرس کا استعمال ہوتا رہا۔ لیکن بعد میں جانوروں کی کھال نے رواج پایا۔ حالیہ دنوں اس عہد کی بائیبل بھی کھال پر لکھی ہوئی ہے۔ تحریر کی اس تبدیلی کے باعث بائیبل کے تمام ابواب کو ایک جگہ مرتب کر دیا گیا۔ کھال کا استعمال ازمنہ وسطیٰ تک رہا۔ یہاں تک کہ اسکی جگہ کاغذ نے لے لی۔ اور کتابت کی جگہ طباعت معرض وجود میں آئی۔

ازمنہ وسطیٰ کے کتب خانے

رومیوں پر جب جنگلی قبائل نے حملے کئے۔ تو یہ انفرادی لائبریریاں بھی تباہ و برباد ہو گئیں۔ حملہ آور ادبی ذوق سے بے بہرہ تھے۔ جو باقی بچیں۔ وہ بے اعتنائی اور بے توجہی کی نذر ہوئیں۔ اگرچہ گرجے اور مقبرے بھی حملہ آوروں کی زد سے محفوظ نہ تھے۔ لیکن مقابلتاً یہاں زندگی زیادہ محفوظ تھی۔ لوگوں نے اپنے کتب خانے پادریوں کی تحویل میں دیدئے۔ اور یہ سلسلہ اس کثرت سے ہوا۔ کہ ازمنہ وسطیٰ میں کتب خانوں کی تاریخ گرجوں اور عبادت گاہوں میں کتابیں منتقل کرنے کی داستان ہو کر رہ گئی۔ ان کتابوں میں مذہبی عنصر زیادہ شامل ہو گیا۔ کیونکہ پادری اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کیلئے مذہبی کتابوں کی حفاظت پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور مذہبی کتابوں کے سوا دوسری کتابیں پڑھنے کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتے تھے۔

تیرھویں صدی میں جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو کتابیں فراہم کرنے کا کام بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ چودھویں صدی کے شروع میں کرائسٹ چرچ لائبریری میں اٹھارہ سو نسخے موجود تھے لائبریری کے لئے علیحدہ کمرے مہیا کئے گئے یہ کمرے محض کتابوں کے گودام نہیں تھے بلکہ طلباء کے لئے وہاں پڑھنے کا بھی مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ سب سے پہلا کالج جس کے نقشہ تعمیر میں لائبریری کے لئے جگہ مخصوص کی گئی تھی۔ آکسفورڈ کا نیو کالج تھا۔ جس کی بنیاد ۱۳۸۰ء میں رکھی گئی اس کی تقلید میں دوسرے کالجوں نے بھی لائبریریوں کا انتظام کیا لیکن کتابت کا تمام کام گرجوں اور مقبروں ہی میں ہوتا تھا۔

دنیائے اسلام

دنیائے اسلام میں کتب خانے بہت مقبول تھے ان کے تفصیلی بیان کے لئے اس قسم کے کئی مضامین بھی کافی نہیں ہو سکتے مسلمان بادشاہوں کا علمی ذوق لائبریریوں میں بیش قیمت اضافوں کا باعث ہوا۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں نوح ثانی شاہ بخارا کے ہاں ایک عظیم الشان لائبریری تھی جس میں مختلف علوم وفنون کے علاوہ یونانی مصنفین کی نادر اور نایاب کتابیں بھی جمع کردی گئی تھیں۔ اسی طرح سرزمین اندلس میں کتابیں جمع کرنے کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سپین کے تاجدار حکم ثانی کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ کہ اس نے ہر علم و فن کی کتاب خریدنے کے لئے اپنے کارندے دنیا کے ہر گوشے میں بھیجے۔ نقدمہ ۱۰

کہ اس تاجدار نے اپنے محل میں چار لاکھ کتابیں جمع کرلیں - جن کی ترتیب اور جلد بندی کے لئے ایک بہت بڑا عملہ رکھنا پڑا بغداد اور دمشق کی لائبریریاں تو دنیا کے طالب علموں کی علمی پیاس بجھانے کے لئے مشہور تھیں۔ اس کے علاوہ انفرادی اور شخصی کتب خانوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اسلامی دور اپنی علمی سرگرمیوں کے لئے بہت اہم ہے۔ کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا۔ کہ علما اپنے ہمراہ کتابوں سے لدے ہوئے ساتھ ساتھ اونٹ سفر میں لے جاتے تھے۔ اموی دور میں کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ اور جاھلیہ کا تمام لٹریچر مرتب کیا گیا۔ عباسی دور میں فنون لطیفہ کا زیادہ چرچا رہا۔ لیکن تعمیری علمی سرگرمیوں کی اہمیت سے کبھی غفلت نہ برتی گئی - قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی اسی دور کی یادگار ہے۔

ہندوستان کے کتب خانے

کتب خانوں کی کہانی بیان کرتے ہوئے ہندوستان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتب خانے یہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔ ہندوستان کا قدیم ادبی خزینہ باپ سے بیٹے اور گرو سے چیلے کو منتقل ہوتا رہا ہے۔ ابتدائی عہد میں رشیوں کی حیثیت بالکل وہی تھی جو موجودہ زمانے میں گشتی کتب خانوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ اپنے سینوں میں علم و حکمت کی روشنی لے پھرتے تھے۔ اور ان سے شانتی اور نروان حاصل کرتے تھے۔ جب فن تحریر و کتابت کا تعارف ہوا تو وہ تمام علوم جو سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے بڑی احتیاط کے ساتھ لکھ لئے گئے۔ ان نوشتوں کو مٹھوں اور عبادت گاہوں میں محفوظ کر دیا گیا۔ یہی کتب خانوں کی بنیاد تھی۔

چینی سیاح فاہیان پاٹلی پترا (پٹنہ) میں ایک عظیم الشان کتب خانے کا ذکر کرتا ہے کہ گپتا عہد کے کتب خانے بہت مشہور تھے۔ اور نالندہ کا کتب خانہ نو منزل کی عمارت میں تھا۔ اس کے بعد کتب خانوں کی تاریخ پر گم نامی اور بے توجہی کی گرد پڑی رہی۔ جیسے مسلمانوں کے عہد حکومت میں گمنامی کی دنیا سے نکال کر دلدادگان علم و ادب کے لئے دوبارہ منظر عام پر لایا گیا۔ مسلمانوں کے عہد میں ان کتب خانوں کو با قاعدگی میسر ہوئی۔ اور انہیں اس وقت کے بڑے بڑے علماء کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ چنانچہ سلطان جلال الدین کے کتب خانہ کا انتظام امیر خسرو کے سپرد تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا کا کتب خانہ بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ تغلق بادشاہوں نے سنسکرت کی بیشمار کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کر دیا۔ محمد تغلق خود بھی سنسکرت کا بہت بڑا فاضل تھا۔ اور کتب خانوں سے اسے خاص شغف تھا۔

مغل بادشاہوں کی علم و ادب کے ساتھ دلچسپی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مغلیہ دربار علم و ادب کا مرکز تھا۔ اور ان کے انہماک علمی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک روایت کے مطابق ہمایوں کی موت اس کے کتب خانہ کی سیڑھیوں پر ہوئی۔ اکبر کا عہد اپنی علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے بہت نمایاں ہے۔ شاہجہان کی فنون لطیفہ سے محبت کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے مغل بادشاہوں نے اپنی ان شاندار روایات کو برقرار رکھا۔ حتیٰ کہ انگریزوں

در آمد کے بعد حالات میں تبدیلی ہوئی ۔
م کی ضرورتوں کے باعث جو یونیورسٹیاں
کالج قائم ہوئے ن کے ساتھ لائبریریاں
ی ہوئیں ۔ اس دور میں ہندوستان میں
بریاں مغربی نمونے پر قائم کی گئیں ۔
رچہ اپنی افادیت کے اعتبار سے ان کا مقابلہ
رب کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن یہ
بریریاں کم و بیش نقل مطابق اصل کا
مداق ضرور ہیں ۔

پرنٹنگ کی ایجاد اور احیائے علوم کی
ریک کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کا خاتمہ ہو
ا تھا ۔ اس انقلاب نے پرانے اداروں کی جگہ
ے ادارے پیدا کئے ۔ اور پرانی اقدار کو تہ
بالا کر دیا ۔ یہیں سے کتب خانوں کی
ملاح کا آغاز ہوتا ہے ۔ حتیٰ کہ موجودہ
مانے کی لائبریریاں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔
ٹش میوزیم لائبریری کا سہرا سر رابرٹ
رٹن کے سر پر ہے ۔ جس نے جیمز اول کے
ہد میں کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ یہاں
نتقل کیا ۔ اٹھارویں صدی اپنی تخلیقی
ر تخئیلی خامیوں کے باوجود اس اعتبار سے
ہم ہے کہ ادب کو تہذیب کا آئینہ قرار
یا گیا ۔ اور اسے احترام کی نگاہوں سے دیکھا
انے لگا ۔ اسی زمانے میں اٹلی' فرانس اور
رمنی میں عظیم الشان کتب خانے قائم ہوئے ۔

پبلک لائبریریاں

پبلک لائبریریاں قائم کرنے میں برطانیہ
نے پہل کی ۱۸۵۰ء میں پبلک لائبریری
یکٹ کی رو سے ایسی شہری کونسلوں
کو جن کے حلقۂ اختیار میں دس
ہزار کی آبادی تھی یہ اختیار دیا گیا کہ
ہ لائبریری قائم کریں جس سے عوام فائدہ
ٹھا سکیں ۱۸۵۵ء میں یہ مراعات پانچ
ہزار کی آبادی والی کونسلوں کو بھی دے دی

۱۸۴۷ء میں قائم ہوئی ۔ بڑھتے بڑھتے
لائبریریوں کی تعداد ۱۹۲۷ء میں ۵۳۹
تک پہنچ گئی ۔ اس سلسلہ میں مسٹر
اینڈریو کارنیگی کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا ۔
کہ اسے انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔
اور اس نے اپنی گرہ سے اس تحریک کی کامیابی
کے لئے ۱۷۶۸۴۰۳ پونڈ خرچ کئے ۔ یورپ کے
دوسرے ملکوں میں بھی اس تجربہ کو چلایا
گیا ہے ۔ وہاں ایک مرکزی لائبریری چھوٹی
لائبریریوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہتی
ہے ۔ یہ تجربہ جرمنی اور ڈنمارک میں نہایت
کامیاب رہا اور اسے سلیقے اور قابلیت کے ساتھ
چلایا گیا ۔ فرانس اور اٹلی میں اسے اتنی کامیابی
نہیں ہوئی ۔ روس اور امریکہ میں یہ تجربہ
اپنی وسعت کے اعتبار سے لاثانی ہے ۔ لائبریریوں
کے مختلف شعبے ہیں ۔ جس میں بچوں کے
شعبے کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ کیونکہ آج
کل کے بچے شہری ہوں گے ۔ اور اگر ان کی
تربیت اور فکری تعمیر کی طرف پوری توجہ
نہ دی جائے ۔ تو کوئی قوم ترقی نہیں کر
سکتی ۔ آزاد قومیں ان لائبریریوں کو صحیح
تربیت گاہوں کے طور پر استعمال کرتی ہیں ۔

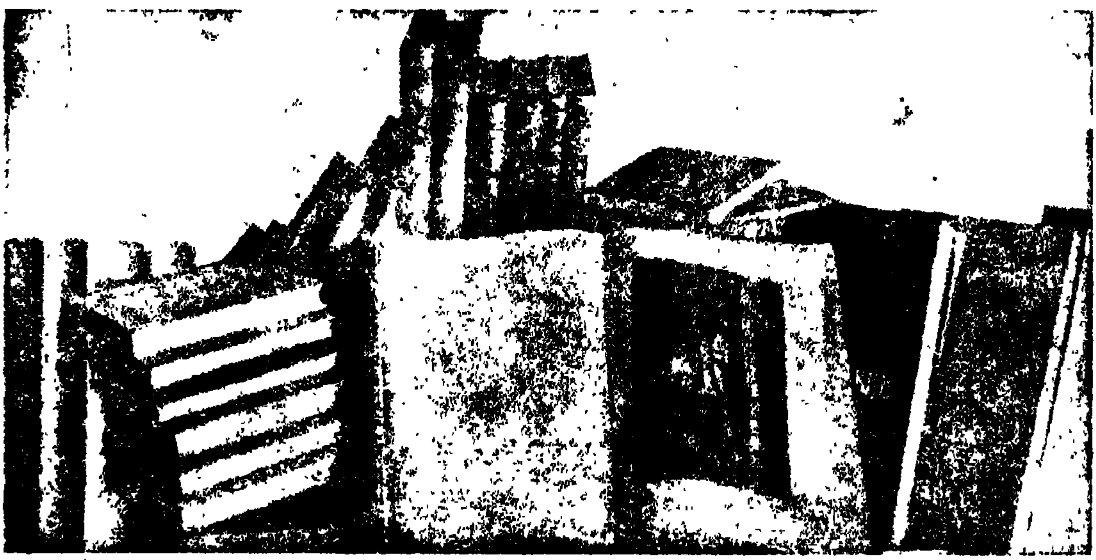
لائبریرین

لائبریری کی کامیابی کا انحصار افراد پر
ہوتا ہے ۔ اجتماعی کوشش کو اس میں
بہت کم دخل ہے ۔ لائبریرین کتابوں کا
منتظم اور مہتمم ہوتا ہے ۔ ابتدائی لائبریریوں
کے منتظمین کے نام معلوم نہیں ۔ لیکن اسکندریہ
کی لائبریری اس وقت کے بہترین علمی
و ادبی ہاتھوں میں تھی ۔ لائبریرین کی زندگی
اختیار کرنا ایک بہت بڑی قومی خدمت اور
قربانی ہے ۔ جس کی ساری محنت محبت کی
محنت ہوتی ہے ۔ وہ محبت و مروت کا مجسمہ
ہوتا ہے ۔ وہ زندگی کے ظاہری شور و شر سے

زندگی وقف کر دیتا ہے ۔ اور اپنی زندگی ختم کر کے قومی زندگی کی بنیادیں مستحکم کرتا ہے ۔ لوگوں میں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا اور پھر اس ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچانا لائبریرین کے ساتھ وابستہ ہے ۔ جس کے لئے بے حد صبر ، ان تھک محنت ، ہمدردی اور انتہائی انتظامی قابلیت کی ضرورت ہے ۔ اس لئے عزت کی یہ جگہ کانٹوں کا تاج ہے ۔ اور جو شخص یہ ذمہ داری اٹھاتا ہے ۔ یقیناً وہ آرام کی زندگی نہیں ہو سکتا ۔

قیام پاکستان کے بعد

اس انقلاب کے بعد جہاں بہت سی قیمتی چیزوں کا اتلاف ہوا ہے ۔ وہاں علم و ادب کو بھی ایک ناقابل برداشت دھکا لگا ہے ۔



وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصروفیتوں نے حکومت کا پورا وقت اور توجہ اپنی طرف مبذول رکھی اور اسے مہلت نہیں ملی ۔ کہ وہ علمی ذخیروں اور ادبی خزانوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھا سکتی ۔ قومی جماعتیں بھی روز مرہ کے مسائل میں اس طرح الجھی رہیں ۔ کہ کسی فرد نے اس قومی سرمایہ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا ۔ لیکن شکر ہے کہ اب اس طرف بھی توجہ شروع کی گئی ہے ۔ اور پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کا قیام معرض وجود میں آیا ہے ۔ اس جماعت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے مگر محض جماعت بنا لینا ہی کافی نہیں ہے ۔ کام شروع کرنے کی ضرورت ہے ۔ تا کہ اس ملک کی لائبریریوں کے لئے مناسب لائبریرین مہیا کئے جا سکیں اور اس کام کو باقاعدگی کے ساتھ سر انجام دیا جا سکے ۔ اس سلسلہ میں دوسرا قدم خود پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے اٹھایا گیا ہے ۔ اور پاکستان نیشنل لائبریری کے قیام کا اعلان ہوا ہے ۔ پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری لاہور دو نہایت ہی عظیم الشان کتب خانے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں قومی تربیت گاہوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ۔ یہ کام عوام کی دلچسپی اور حکومت کی عملی ہمدردی اور سر پرستی کے بغیر نا ممکن ہے ۔ ماضی کی غفلت اسی صورت میں معاف ہو ہو سکتی ہے کہ مستقبل کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے ۔ اور جو قوم اس سے غفلت کریگی ۔ وہ اس کے منطقی نتائج سے بچ نہیں سکتی ۔

★

ڈاکٹر نذیر احمد



سائنس اور آزادی

(اس مضمون کا بیشتر حصہ آلڈس ہکسلے کی تصنیف سے لیا گیا ہے)

اچھی زندگی گزارنے کے لئے بعض چیزوں کی طلب ناگزیر ہے، ان میں سے کچھ مادی ہیں اور کچھ غیر مادی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی زندگی خوراک، لباس اور گھر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانوں کو ازدواجی رفاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ایسے کام کاج کی بھی ضرورت ہے جو سماج کو نقصان پہنچائے بغیر ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا موقع دے۔ ان سے ما ورا انہیں ایک ایسی طلب بھی ہے جسے اس مشینی سائنس کے دور میں جھٹلایا تو بہت گیا ہے لیکن بالکل دبایا نہیں جاسکا۔ یہ وہ ضرورت ہے جسے اہل مذہب کی اصلاح میں "بندوں کا خدا سے تعلق" کہا جاتا ہے۔

خوراک اور پوشاک کی ضرورتوں سے فی الحال قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم انسان کی نفسیاتی ضروریات مثلاً اس کے ازدواجی اور دوستانہ تعلقات، اس کے تخلیقی کام اور اس کے فطرت سے لگاؤ کی طرف توجہ دیتے ہیں تو یہ صاف دکھائی دیتے لگتا ہے کہ ان کی تسکین بغیر ایک گونا شخصی آزادی کے ممکن نہیں۔ لیکن جب حکومت اور سماج کی ساخت اتنی فاسد ہو کہ انسانوں کی

اکثریت کو ایسے بے تکے گندے اور حد سے زیادہ گنجان آباد گھروں اور محلوں میں رہنا پڑے جہاں مظاہر قدرت کی ہر خوبی کو اندر آنے سے روک دیا گیا ہو، یا جہاں مزدور اپنے دن ایسی مشینوں پر کام کرنے میں کاٹ دیں، جن کی پیداوار کی اہمیت کو وہ سمجھتے تک نہ ہوں، یا جہاں کھیے پڑے لوگ کلرکی کرتے کرتے، اپنے قلم کے ساتھ اپنی زندگی بھی گھسا ڈالیں، یا جہاں پر منقولہ اور غیر منقولہ اسباب زیست اتنے کمیاب کردیئے جائیں کہ لوگ کسی شے کو بھی اپنا نہ کہہ سکیں اور مدن کے کسی کونے کو بھی اپنا سمجھ کر اس میں قرار نہ پاسکیں، تو شخصی اختیار اور انسانی زندگی کی اقدار جو اختیار کے بغیر بے معنی ہوجاتی ہیں، موہوم بلکہ مفقود ہونے لگتی ہیں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صورت حالات صرف سائنس ہی کی آوردہ ہے۔ موجودہ عہد کے پیچیدہ سماجوں میں جو پیچیدہ امراض ظاہر ہوئے ہیں، وہ کسی ایک مجرد سبب سے پیدا نہیں ہوئے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اسباب میں سے ایک سبب دور حاضر میں مشینی سائنس کی حیرت انگیز ترقی بھی ہے۔

نصف صدی سے اوپر وقت گزر چکا ہے کہ ٹالسٹائے نے کہا تھا کہ اگر سماج کی طبقاتی ساخت ایسی فاسد ہو جیسی کہ ہمارے یہاں ہے، یعنی اس میں ایک اقلیت اکثریت پر تشددانہ حکمران ہو تو پھر سائنس کی ہر تسخیر اور ہر فتح اس اقلیت ہی کی قوت کو ترقی دے گی عوام تک اس کے فائدے نہیں پہنچیں گے۔ آج کل جو حالات ہم اپنے گرد و پیش دیکھ رہے ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے کے یہ اندازے کچھ بہت غلط نہ تھے۔ عملی یا مشینی سائنس کے نام کے تعین سے ہمارا مقصود اس کے موہوم کو نظری سائنس سے الگ کرنا ہے۔ یہ امتیاز ضروری ہے۔ ورنہ آگے چل کر خلط مبحث کا اندیشہ ہوگا۔ عملی سائنس ہماری زندگی پر کئی پہلو سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اسی لحاظ سے اس نے نئی طرح اقلیت کے تسلط کے لئے بھی راہیں کھول دی ہیں۔ انہیں ہم یہاں ایک ایک کر کے گنواتے ہیں۔

(۱) عملی سائنس کی اکثر و بیشتر اختراعیں اور نئے نئے تجربے ایسے ہوتے رہے ہیں۔ کہ ان سے کام لینے کے لئے بڑے بڑے اندوختہ سرمایوں، بڑے بڑے کارخانوں اور بڑی بڑی آبادیوں کی ضرورت رہی ہے۔ کم خرچ میں ایسی ایجادیں شاذ ہی ہیں کہ ان میں اوسط درجے کے سرمایہ رکھنے والے یا تھوڑے آدمیوں کی کوئی انجمن امداد باہم فائدہ اٹھا سکے۔ یہ نہیں کہ باہمی اشتراکوں کے لئے کچھ زیادہ دقت نظر درکار ہوتی ہو۔ صرف اتنا ہے کہ پہلی قسم کی ایجادیں مالکوں کے لئے ایک بڑے پیمانے کا نفع اٹھا کر لاتی ہیں جس سے ایجاد بازی کرنے والے ان سائنس دانوں کو بیش بہا مشاہرے مل سکتے ہیں اور انہیں اپنے طاقتور آقاؤں کی طفیل اطمینان اور فراغت کی زندگی نصیب ہوسکتی ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یورپ میں بھی سائنسی دور سے پہلے سرمائے کے چند ہاتھوں میں اکٹھا ہوجانے کا میلان موجود بلکہ روز افزوں ترقی پر تھا اور یہ سرمائے کے اسی میلان اور لزوم ہی کی بدولت ہے کہ آج کل کے صنعتی شہر اور صنعتی مدن اتنے بد وضع نہیں جتنے کہ تھے۔ عام لوگوں کے پاس پہلے بھی منقولہ اور غیرمنقولہ اسباب وافر نہ تھا۔ یہ چیزیں

لواحوں کا حصہ تھیں ۔ پھر اُن سے بطور ورثہ سرمایہ داروں کو ملیں ۔ لیکن جوں جوں سرمائے کا بھاؤ کم سے کم تر مرکزوں کی طرف ھوتا گیا ۔ عملی سائنس کی افادیت بھی انہیں مرکزوں کے مالکوں کی ھوتی چلی گئی ۔ وھی ایجادیں اور اختراعیں بروئے کار آنے دی جاتی ھیں جن سے بڑا سرمایہ ، بڑا کارخانہ اور بڑی منڈی میں پنپ سکتی ھے ۔ ظاھر ھے کہ اس معاملے میں سائنس عوام کی آزادی کے دشمنوں کی توحلیف ھے لیکن وہ کوئی ایسی ایجادیں نہیں کرتی کہ ایک عام کاریگر یا کاریگروں کی ایک چھوٹی برادری اُن سے تقویت پاکر بڑے آدمیوں کی گیرائی سے بچ جائے ۔

صنعت گری کے بڑے بڑے کارخانوں میں مرکوز ھو جانے سے دیہاتی آبادی بھی مزدوری کے لئے شہروں کی طرف کھنچی چلی آتی ھے ۔ یہ لوگ جب یہاں ھر قسم کے منقولہ اور غیر منقولہ اسباب سے تہی دست ھو جاتے ھیں تو وہ چند بڑے سرمایہ داروں کے یا حکومت کے جو ایک مرکز واحد ھے غلام بن کررہ جاتے ھیں وہ نہ صرف اپنے کسب کے اوزاروں کے لئے اپنے مالکوں کے دست نگر ھوتے ھیں بلکہ اکثر اوقات وہ کسب سے بھی بے بہرہ رھتے ھیں کیونکہ کئی اٹومیٹک (خود کار) مشینیں ایسی ھیں کہ انہیں چلانے کے لئے کسی قسم کی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ھی نہیں ھوتی۔ بس بٹن دبانے کا کام ھے کبھی یہ دبا کبھی وہ دبا ۔ یہ درست سہی کہ مزدور اپنے بچاؤ کے لئے ٹریڈیو نینوں کا سہارا لیتے ھیں لیکن بسا اوقات خود ٹریڈ یونین اُن کے حق میں ایسے جابر بن جاتے ھیں کہ حریف اور حلیف کی تمیز مشکل ھو جاتی ھے ۔ گویا شخصی آزادی جس کے جمہور حقدار ھیں نہ یوں ملتی ھے نہ یوں ۔ اور یہ منجملہ اور وجوہ کے عملی سائنس کا نتیجہ ھے جسے موجودہ دور میں بڑے بڑے ادارے اور مرکز ھی استعمال میں لاسکتے ھیں یا لار ھے ھیں ۔

ھر وہ مشین جو تھوڑے وقت میں کئی آدمیوں کا اور اس سے بعد ایجاد ھونے والی وہ مشین جو اس سے بھی زیادہ آدمیوں کا کام کر سکتی ھے ۔ زیادہ اور پھر اس سے زیادہ کاریگروں کو ان کے کام سے ہٹاکر بے کار بنائے چلی جاتی ھے ۔ اپنے کام سے چھوٹ کر یہ بے کار مرد زیادہ آزاد نہیں بلکہ اور زیادہ غلام ھو جاتے ھیں ۔ کیونکہ اب انہیں روٹی کے ایک لقمے سے خریدا جاسکتا ھے ۔ اس میں کلام نہیں کہ بعد میں مال کے زیادہ نکالنے میں اور منڈیوں کے وسیع تر ھو جانے سے انہی آدمیوں کو پھر کچھ کام مل جاتا ھے لیکن انہیں روزگار سے کبھی پورا اطمینان حاصل نہیں ھوتا ۔ انہیں ھر وقت یہ دھڑکا رھتا ھے کہ کسی نئی سائنسی ایجاد سے انہیں پھر معطل ھو جانا پڑے گا ۔ حیاتیات کے ماھروں کا خیال ھے اور غالباً آپ کا مشاھدہ بھی اس کی تائید کرے گا کہ زندہ چیزیں تیزی سے بدلنے والے ماحول میں صحت اور توانائی سے بسر نہیں کر سکتیں ۔ آپ جانتے ھیں کہ کیوں اچھے حماموں میں تین تین یا چار چار بتدریج زیادہ گرم ھوئے ھوئے کمرے گرم غسل کے آخری مرحلے تک آپ کو حرارت پہنچاتے ھیں حرارت تدریجاً نہ بڑھے تو آپ بیمار ھوجائیں ۔ لیکن بڑی بڑی پیداوار دینے والی مشینوں کے ماڈل اتنی جلدی جلدی بدلتے رھتے ھیں کہ ان سے کام لینے والے اپنے آپ کو ھر تھوڑے عرصہ کے بعد ایک نئے اقتصادی سیاسی (بلکہ اخلاقی) ماحول میں دن

گزارنے پر مجبور پاتے ہیں ۔ ان سب کا نتیجہ ایک مزمن بے اطمینانی اور ایک مستقل روحانی بے چینی ہوتی ہے جو ایسی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ اس سے بچنے کے لئے آدمی خود ہی اپنے آپ کو ہر اس غلامی میں بیچ دیتا ہے جس کے عوض اسے اطمینان کا کچھ نصیب ہو سکے ۔ حالیہ فسادات ہی کو دیکھ لیجئے کہ کس طرح ان میں اچھے اچھے اور شریف آدمیوں نے محض اپنے بچاؤ اور اطمینان کی خاطر اپنے آپ کو غنڈوں کی حفاظت میں دے دیا ۔ اور پھر یہ غنڈے کس طرح نت نئی افواہوں سے ڈرا ڈرا کر انہیں اپنا زیادہ سے زیادہ مطیع بناتے رہے ۔ عین اسی طرح زمانۂ بھر کے مرکزی ادارے خواہ وہ سرمایہ داروں کے ہوں یا حکومتوں کے ، اپنے متعلقین کو مستقل اطمینان سے ارادتاً دور رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کی گرفت سے باہر نہ جا سکیں ۔ اور اس بات میں عملی سائنس سے زیادہ تقویت بخش آلہ انہیں کہیں نہیں ملتا ۔

(۲) سائنس اور مشینی صنعت گری کے اجرا سے پہلے اکثر سماجوں کی حالت ہزاروں سال تک ایک ہی سی رہی ہے ۔ مشینی صنعت گری نے جسطرح سماجوں کی صورت کو بدلا ہے وہ کارل مارکس کا ایک موضوع ہے جس سے غالباً اب کوئی نا آشنا نہیں ہوگا ۔ قبل از سائنس کے طویل دور میں ہر معاشرہ اپنے رنگ میں اور اپنی مخصوص مصطلحات میں اس دنیا کو کلجگ یا ایک روبہ تنزل جگ ہی کہتا رہا ہے ۔ مثال کے طور پر دیکھئے ۔ کعبے کے پتھر کے سیاہ تر ہوتے چلے جانے کی روایات وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن مشینی سائنس اور اس کی کامیابی کے دور میں جو اصل میں اس کے پراپیگنڈا کرنے والوں کی کامیابی کا دور ہے ۔ خیال کا یہ الحاد فروغ پر ہے کہ اب گویا ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے جس میں ہر آنے والا دن سائنس کی برکتوں سے ہر گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے اور بہتر ہوتا چلا جائے گا ۔ غرض یہ کہ سائنس سے پہلے ایک قدامت برپا کر کے سائنس و صنعت کی جدت دکھائی جا رہی ہے ۔ جدتوں کی دلفریبی سے لوگ [illegible] ہوئے جا رہے ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصد فردائے جنت میسر ہے ۔ بلکہ ''طلب حق'' اور ''وصل بحق'' ہے جس میں آج اور کل کی تخصیص نہیں کیونکہ اس کا ہر لمحہ لازمان ہوتا ہے ۔ اور یہی خیال ہے جو ہزاروں سال سے صاحب نظر لوگوں کا مسلک رہا ہے ۔ لیکن ادھر جب مشینی سائنس کے ساتھ ابھرنے والی طاقتوں کو اپنے خیال میں یہ نظر آیا کہ صرف وہی ہیں جو صحیح ترقی کی راہ پر چل رہے ہیں اور یہ کہ ان سے انحراف کرنے والے گویا ترقی ہی کے خلاف ہیں تو ان کو انہیں کشتنی و گردن زدنی قرار دیتے ہوئے اپنے ضمیر میں ذرا بھی خلش نہیں محسوس ہوئی ۔

سائنس جس طریق سے اپنے نظریوں تک پہنچتی ہے اس کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کسی شے کا بھی ، اس طرح جیسے کہ انسان کا دل اور دماغ اسے اس کی سالم حالت میں یا بطور ایک وحدت کے جانتا اور پہچانتا ہے ۔ مطالعہ نہیں کرتی ۔ وہ کسی سالم شے سے اس کی لمبائی چوڑائی کا یا اس کے بوجھ کا یا اس کی حرارت کا یا اس کا کوئی اور ایسا پہلو لے لیتی ہے جسے ناپا یا تولا یا جمع تفریق اور ضرب تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ وہ اپنے زیر مطالعہ اشیا کے بیان میں ان اشیا کے ہر پہلو کو چھوڑ دیتی ہے جنہیں ناپا یا تولا نہیں جاسکتا ، یا جن کا ناپ تول صرف

انسانی اقدار یعنی نیکی بدی کے ترازو میں ہی ہوسکتا ہے یا جنہیں محض علت اسبق کے بیان اور پیمائش سے پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا اور جن کو زیادہ کامل طریق سے سمجھنے کے لئے ان کے نتائج مابعد کا جائزہ لینا بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا ماسبق کا محض ناپے تولے جانے والے پہلوؤں کا مطالعہ اور اس شے کا مطالعہ کہ کس طرح وہ ایک دوسرے سے علت و معمول کے سلسلے میں پروئے ہوئے ہیں سائنس کو مادی اجسام اور قوائے فطرت کا ایک مالک بنادیتا ہے جس سے ایسے بے حد قوت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اشیاء کے بعض پہلوؤں کو مروڑنے توڑنے کی قدرت حاصل ہونا اور بات ہے اور اشیا کی حقیقت کو زیادہ اچھی طرح جاننا اور بات ہے۔ فلسفیانہ ذوق رکھنے والے سائنس دان ان حقائق نظری سے خوب واقف ہیں لیکن سوئے قسمت کہ کئی سائنس باز اور اکثر مشین ساز ان سے ناواقف ہیں۔ عملی سائنس کی کامیابی نے انہیں اچھی تعلیم اور انسانیت حاصل کرنے کا موقع اور وقت ہی نہیں دیا اور وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ سائنس حقیقت کے پہلو کو نہیں بلکہ اسے سالماً بے نقاب کرچکی ہے۔ آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند......

جب اس قسم کے نیم سائنس دان دیکھتے ہیں کہ کسی شے کی پوری حقیقت میں سے قابل پیمائش اجزا انتخاب کرلینا اور ان کے ذریعہ مکمل حقیقت کے مطالعے کا آغاز کرنا بیحد مفید اور شاندار عملی نتائج کا پیش خیمہ ہے تو وہ اسی طریق مطالعہ سے انسانی مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی ضرورتوں' خواھشوں اور طلبوں کی بھی تنصیف ہوتی ہے ، اوسطیں نکلتی ہیں اور افراد کی یکتائی کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ انسانوں کی رنگا رنگی کو بھلا کر سبھی کو ایک جیسا فرض کیا جاتا ہے گویا وہ ایک سانچے سےنکلی ہوئی مورتیاں ہیں۔ سبھی کو ایک لین ڈوری میں باندھکر "چپ راست ' " چپ راست" چلوا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہی طریقہ جولیبارٹری اور سائنسی معمل میں اینٹ پتھر اور کانچ کلسیم کے لئے درست تھا جب انسانوں کی طلبوں کی کانچ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ انسانی آزادی کے لئے سدراہ بن جاتا ہے۔ جن ملکوں میں انسانی اعداد و شمار زیادہ تندھی سے اکٹھے کئے جاتے ہیں وھاں کی حکومتیں بقول برنارڈشا ان سے "جونتائج چاھتی ہیں اخذ کرلیتی ہیں" اور چونکہ یہ نتائج سائنس کے اسم اعظم سے مستند ہوتے ہیں اس لئے جو کوئی ان کے منشا کے خلاف قدم اٹھاتا ہے ظاھر ہے وہ اپنی بربادی ہی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

(۳) عملی سائنس نے اپنے اعمال کے ہاتھوں کو اب ایسا مضبوط کردیا ہے کہ پہلے کسی دور میں کوئی اقلیت اکثریت پر اس طرح حاوی نہ تھی جس طرح یہ لوگ اب جمہور پر حاوی ہیں اگلے زمانے میں چھوٹے چھوٹے گروہ بڑی بڑی طاقتوں کے خلاف بغاوتیں کرتے تو کبھی کامیاب ہوجاتے اور کبھی ناکامیاب۔ مرھٹوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کی تو کامیاب رہے لیکن ستنامیوں کی شورش ناکامیاب رہی لیکن سائنسی فنون کے ماھروں یعنی کیمیا گروں ، آھن گروں ، انجنیئروں اور مستریوں نے مل کر ایسی ایسی مشین گنیں ، ٹینک اور بمبار جہاز بنائے ہیں جو ھر بغاوت کو حرف غلط سے مٹاسکتے ہیں۔ اگر ھمارا ملک

انگلستان کی گرفت سے آزاد ہوسکا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ آزادی کو سطح حرب و ضرب سے پرے ہی رکھکر اس کا فیصلہ کیا گیا تھا ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ محض خون اور گوشت ان آلات حرب کے سامنے کبھی نہ ٹھہر سکتے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے ۔

بعض رجائیت طبع اہل قلم کہتے ہیں کہ ایٹومک یعنی جوہری قوت کے استعمال سیکھ لینے کے بعد جنگ اس درجہ ہلاکت خیز ہوگئی ہے کہ اب کوئی فریق بھی جنگ پر آمادہ نہیں ہوگا ۔ لیکن یہ دلیل پرانی اور بودی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب کبھی بھی آتشیں اسلحہ کی کوئی زیادہ مہلک قسم دریافت ہوئی ہے بعض آدمیوں نے کہہ دیا ہے کہ بس اب جنگ نہ ہوسکے گی لیکن پھر کوئی صورت ان زیادہ مہلک ہتھیاروں سے بچنے کی پیدا ہوہی جاتی رہی ہے اور نہ بھی ہوتی حب بھی جنگیں ضرور ہوکررہتی ہماری دنیا میں جہاں نیشنلزم کا دور دورہ ہے ہر حکومت اپنی ہمسایہ حکومتوں سے بر سر پرخاش ہے ۔ مرکزیت کا مسلک ان کے لئے مفید ہے بلکہ یہ کہنا روا ہوگا کہ مرکزیت برپا کئے بغیر ایسی حکومتیں نہ جنگ کی قابلیت رکھ سکتی ہیں اور نہ رہ سکتی ہیں ۔ کوئی جنگ مرکزیت کی حکمت عملی پر چلے بغیر نہیں لڑی جاسکتی ۔ اور عملی سائنس مرکزیت پیدا کرنے کا سب سے بڑا آلۂ کار ہے ۔ پھر کیوں نہ حکومتیں اور سرمائے عملی سائنس کے فروغ میں دن رات معاونت کریں اور کیوں نہ عملی سائنس بھی ان حکومتوں اور سرمائے ہی کا دم بھرے جو اس کی ان داتا ہیں ۔ ایسے عوام کی حالت سدھارنے سے واسطہ کیا ہوسکتا ہے ۔ ہاں اتفاقیہ اس سے کوئی مفید کام عوام کے لئے بھی ہوجائے تو ایسے سائنس کی برکتوں'' کے پراپیگنڈے کے لئے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے ۔

(۲) عصر حاضر میں قلم وزبان بھی اتنی ہی طاقت رکھتی ہے جتنی کہ توپ و تفنگ ۔ کیونکہ لوگوں کو حرب و ضرب پر آمادہ کرنے کے لئے آخرالفاظ ہی سے تو مدد لی جاتی ہے ۔ عملی سائنس نے الفاظ کی نشرواشاعت اور پراپیگنڈا کو جیسا ہمہ گیر بنا دیا ہے ۔ آج سے پہلے کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا ۔ روٹری پریس اور پھر ریڈیو نے ایک بڑی حد تک سیاسی اور دوسری طاقتوں کو تھوڑے سے آدمیوں کے ہاتھ میں دے کر مرکزیت کے رجحان کو بڑی تقویت بخشی ہے ۔ ہٹلر کی آتشناک خطابت اب تک ہمارے دل سے محو نہیں ہوئی ۔ کیا اسے اس کامیابی کا دسواں حصہ بھی حاصل ہو سکتا تھا اگر ہر جرمن گھر میں ریڈیو نہ ہوتا ۔ کسی وقت میں یہ خیال تھا کہ اگر تعلیم عام کر دی جائے تو زندگی کے تمام حل خود بخود پیدا ہوجائینگے ۔ لوگوں میں عقل اور شعور ترقی کرے گا اور وہ بہتر اور آزادتر انسان بن سکیں گے ۔ لیکن ہوا یہ کہ لوگوں کی عام قابلیت اور خواندگی نے صرف سنسنی پھیلانے والے اخباروں اور اشتہار نویسوں' اور ان کے آقاؤں کو جو ہر حالت میں اونچے سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں اصلی اور ٹھوس فائدہ پہنچایا ہے ۔ اگر کوئی حق پرستی کا دعویدار اخبار یہ کہے کہ وہ اشتہاروں کی مدد حاصل کئے بغیر اپنے اخبار کو عام لوگوں کے لئے جاذب توجہ بنا سکتا ہے تو جان لیجئے کہ وہ ٹھیک نہیں کہہ رہا ۔ اور سب سے اچھے اور زیادہ اشتہار دینے والی چند ہی فرمیں ہوں گی جو اونچے سرمایہ داروں کی ملکیت

هوں ۔ یا پھر حکومتیں هوں گی جو اپنے اشتہار اخباروں کو دیتی هوں گی ۔ یعنی بڑے بڑے اور مرکزی ادارے ۔ الغرض هم دیکھتے هیں کہ سائنسی ایجادوں سے ٹھوس فائدہ اٹھانے والے لازماً بڑے سرمائے والے یا حکومتیں هی هو سکتی هیں ۔ اور یہ تو ظاهر هے کہ ان اداروں کا مقصد جمہور کی آزادی کی حفاظت نہیں ۔ بلکہ اپنی طاقت کا زیادہ کرنا هے ۔ اور ان کی طاقت کا زیادہ هونا عوام کی آزادی کا کم هونا هے ۔

(نا تمام)

★★★

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ هے ساز بدلے گئے

هوا اسطرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں هے شیشہ باز فرنگ

پرانی سیاست گری خوار هے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار هے

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
هماله کے چشمے ابلنے لگے

اقبال

میراجی

جدید شاعری کے علمبرداروں میں میراجی کا نام پیش پیش ہے۔ میراجی اپنی آزاد نظموں میں ابہامی کیفیت پر زیادہ توجہ دینے کے باعث عام قاری کی نگاہ سے اوجھل رہتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُس نے بعض نہایت خوبصورت، سادہ اور عام فہم نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن کی اشاعت کسی نہ کسی طرح خاطر خواہ طور پر نہ ہو سکی۔

دراصل میراجی تقسیمِ ملک سے پہلے اپنی پابند نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے بارے میں پیدا شدہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکے۔ افسوس ہے کہ پہلے ملک کے بدلے ہوئے حالات اور پھر اس کی اپنی بے وقت موت نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور اُس کی پابند نظموں کا مجموعہ جس کا نام بھی اس نے "پابند نظمیں" ہی رکھا تھا آج تک شائع نہ ہو سکا۔ یہ نظمیں اسی مجموعے سے لی گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ناصر کاظمی

گھنا گرم جادُو

گھنا گرم جادو کسی رات کا
مرے دل کی رگ رگ میں جاری ہوا
ترا پیرہن جسم سے ہٹ گیا
تو رادھا بنی میں بھکاری بنا

مگر رات کا خواب جب کھو گیا
تو آئیں نظر میں کئی گوپیاں
ترا چاند نظروں سے اوجھل ہوا
ستاروں کی دھارا تھی ہر سُو رواں

گرفتار تھا حُسن کے جال میں
تھرکتا تھا لذّت سے ہر ایک تار
حیا مست و بے خود تھی مدہوش تھی
تھے بے باک دونوں شکاری شکار

تصوّر ترا داستانِ کہن —
بنا — عکس بھُولی ہوئی بات کا
بہا کر مرے دل کو روپوش تھا
گھنا گرم جادو نئی رات کا

میراجی

اُمید

شگوفہ ہائے زندگی کے برگ تھے کھلے ہوئے
مگر وہ حُسنِ بوئے گل فسردہ ہو کے چل دیا
بکھر کے پتیاں گریں گل و گیاہ مل گئے
خزاں کے ہاتھ نے اُنہیں مسل دیا، مسل دیا
وہ بوئے گل کا شرمگیں خمار اب نہ تھا کہیں
وہ نور وہ شعاع وہ شرار اب نہ تھا کہیں
مگر اکیلی اک کرن تھی مہرِ شوخ و گرم کی
سمٹ کے چھپ گئی فسردہ شاخسار کے تلے
وہی کرن خزاں کے دور میں برنگِ نو بڑھی
شکستہ قلب میں اُسی سے جذبہ ہائے نو پلے
اُسی سے ہمتیں بڑھیں اُسی سے نور آ گیا
نئی حیاتِ گرم کا نیا شعور آ گیا
فضائے تیرہ کو اُسی نے سیم تن بنا دیا
اُسی کی برقِ آتشیں سے ابرِ غم بکھر گیا
نمودِ نو ہوئی: مٹی ہوئی حیاتِ گرم کی،
چمن پھر ایک بار پہلے رنگ سے سنور گیا
شگوفہ ہائے زندگی میں پھر سے آئی تازگی
یہ جلوہ تھا اُمید کا، یہ روح تھی اُمید کی

یوسف ظفر

دوام

گئی بہاروں کے تذکرے سے نئی بہاریں سُلگ رہی ہیں
کہ ہم میں کس بات کی کمی ہے، ہمارے جلووں میں کیا نہیں ہے
ہمارے پھولوں میں نغمگی ہے ہمارے نغموں میں تازگی ہے
ہماری خوشبو میں کیف و مستی ہے، سازِ ہستی ہے آرزو کا
ہماری تعمیر میں تبسّم ہے گرمیِ سوزِ رنگ و بُو کا
مگر ابھی تک گئی بہاروں کی نکہتوں سے فضا ہے بوجھل"

زمیں پہ دامِ نظر بچھا ہے، مگر خیالوں میں جو خلش ہے
اُسے بہاروں سے کیا غرض ہے — بہار گرچہ روش روش ہے
مگر زمانہ رُکا ہوا ہے ابھی تک اُس مرکزِ وفا پر
جہاں تمہیں اُس نے جاتے دیکھا —
قدم قدم پر نجوم بکھرے ہیں، گُل کھلے ہیں
گئی بہاروں کے سلسلے ہیں

گئی بہاریں یہ سوچتی ہیں کہ ہم کہاں ہیں
ہمارے آنے کا فائدہ کیا، یہاں تو وہ پھول جاوداں ہیں
کہ جن کی خوشبو میں داستانیں ہیں، جن کے خاروں میں گلستاں ہیں۔

قیوم نظر

بُلاوا

حسیں ہیں، رنگیں ہیں، انجمیں ہیں
مگر سبھی کچھ یہیں نہیں ہیں
یہ جنگلی پھول کوہساروں میں مجھ کو یوں کھینچ لانے والے

وہ شہر ــــ وہ فتنہ زارِ آدم
وہ ہاؤ ہو ــــ وہ سکوں کا ماتم
جہاں دمکتا ہے کاغذی حسن کتنے افسردہ دل سنبھالے

جہاں ہیں تہذیب کے خزانے،
نئی تجلّی کے تازیانے
جہاں خود انسانیت کو قدرت ہے اپنی عظمت کا راز پالے

جہاں میری جنس کھپ رہی ہے
صعوبتوں میں پنپ رہی ہے
مجھے بلاتا ہے پھر وہی شہر ــــ میں اسی شہر کے حوالے

محمد صفدر

خواہش

دیوی! اس سنگیں دیواروں سے دور ـــــ
وہاں جہاں سبزے کی نیلی موجوں میں
پھولوں کی شمعوں کے بوجھ سے چوُر
ہانپتے پیڑ کھڑے تھے ۔ ہر نوخیز کلی
ہر کونپل، ہر بوجھل شاخ کی، رگ رگ میں
مست آسودہ خواہش خوں چھلکاتی تھی
جھیل کے عُریاں سینے کے آئینے میں
ابر کے ٹکڑے دوشیزہ یادوں کی طرح گزرتے تھے ۔
دیوی! واں یادوں کے سوا اب کچھ بھی نہیں

تپتے آکاش سے سورج پگھلا تانبا پھینک رہا ہے
ساکن گرم خموشی میں اک ہلکی سی لرزش بھی نہیں
ہر مُرجھائی شاخ کے ویراں سینے میں
ناآسودہ خواہش کا بے نور دیا ہی باقی ہے
بھوری ریت سے پانی کا اک آخری قطرہ لینے کو
دُور اُفق سے صرصر کالے کالے بازو پھیلائے
آہستہ آہستہ بڑھتی آتی ہے
دیوی! اس ویران آنکھوں کی وادی میں
میرے آنسو ۔ یہ بیمار شگوفے ہی میری دولت ہیں ۔
یا میری یادیں مٹ جائیں ۔ میں مٹ جاؤں ۔
یا پھر سبزہ لہکے ۔ کلیاں جاگیں ، پھر سے پھول کھلیں ۔
جھیل کے عریاں سینے کے آئینے میں
ابر کے ٹکڑے دوشیزہ یادوں کی طرح سے پھر گزریں

محمد خلیل الرحمٰن

فوجی بینڈ

خون خون خون
خون خون خون

خون
خون
خون
بڑھ رہی ہے سیلِ بے پناہ کی طرح صدا
خون ہی سے خوش رہا ہے زندگی کا دیوتا
خون ہی سے آدمی کی داستاں میں رنگ ہے
زندگی میں کچھ نہیں ہے جشنِ خون کے سوا
آدمی کی سرگذشت، سرگذشتِ جنگ ہے
گرم خون، تیز خون
بڑھ رہی ہے سیلِ بے پناہ کی طرح صدا
خون خون خون
خون

خون
خون

موت سے نہیں مفر
اس کی ماہیت پہ ٹھنڈے دل سے خوب غور کر
زندگی کے پیار ہیں
جو بھی پھنس گیا رہا وہ زندگی کی مار میں
اس فریب سے گزر
مقصدِ حیات کی بلندیوں پہ رکھ نظر
نذرِ زندگی کے وقت
فرضِ زندگی کی لَے پہ مست ہو کے رقص کر
رقص کر، رقص کر
رقص کر
رقص کر

ھ بھی ہو مگر جیو !
دمی پہ اس خیال نے بڑا ستم کیا
ندگی میں اُس کا ذوقِ زندگی فنا کیا
دمی کو آدمی کے سامنے جُھکا دیا
ب کو مٹا دیا
دسرے کو اس خیال نے دیا ہے درسِ شر
نجتی رہی ہے اس کی اک صدا کہ ظلم کر
نت د : ر کے نام پہ
ہبوں کے نام پر
توں کے نام پہ
لم کر، ظلم کر
لم کر
لم کر

ے اسیرِ رنگ و بو
سفِ : ندگی کی روح جانِ بے قرار ہے
رِ ندگی کو توڑ

تیری راہِ آرزو، راہِ اختیار ہے
راہِ اختیار ہے
دیکھتا ہے آج تجھ کو زندگی کا دیوتا
کچھ نہیں چڑھے گا اس پہ تیرے خون کے سوا
گرم خون، تیز خون
خون خون
خون
خون
بڑھ رہی ہے سیلِ بے پناہ کی طرح صدا
وقتِ نذر آگیا
مقصدِ حیات کی بلندیوں پہ رکھ نظر
فرضِ زندگی کی لَے پہ مست ہو کے رقص کر
رقص کر، رقص کر
رقص کر
رقص کر

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھی گئی)

ریاض قادر

من کی دنیا

دکھتی رگ رگ کو تڑپائے — جینا ہم کو راس نہ آئے
کوئی نہ سمجھے من کی بانی — کوئی بھی دل کے پاس نہ آئے
لمحہ لمحہ، ڈھلتے ڈھلتے — دکھ کے راگ میں ڈھلتا جائے

چوٹ سی لگتی ہر سوچ بدن پر — آنکھوں میں آنسو تھرائے
تنہا تنہا، پریم نگر میں — پھرتے رہے، بیری کہلائے
جب بھی عشق بڑھا جینے کو — بڑھتے گئے زنداں کے سائے
جس جا ہوش نے ڈیرے ڈالے — اندھیاروں نے ہاتھ بڑھائے
کس کس یاد میں چھپکے چھپکے — ان آنکھوں نے نیر بہائے
رَین رَین رو رو ہارا من — بھور بھئی گلشن مسکائے
من کی دنیا من کی رہے گی — لاکھ زمانہ اس کو بلائے
کون ہے جس نے من کو سمجھا؟ — کون ہے جو من کو سمجھائے؟
منزل منزل تنہائی تھی — دنیا والے ساتھ نہ آئے
جینا ہم کو راس نہ آئے — کوئی بھی دل کے پاس نہ آئے
پھر بھی من ہے ایسا چنچل — پل چھن جیون رنگ دکھائے
میت بنے جب کوئی نہ جگ میں — درد کو اپنا میت بنائے
لمحہ لمحہ ڈھلتے ڈھلتے — دکھ کے راگ میں ڈھلتا جائے
بستی کے بپھرے ساگر میں — من کی نیا ڈولتی جائے
پھر بھی من ایسا ہے چنچل — درد ہی کو پتوار بنائے
تنہائی کے اندھیاروں میں — درد ہی اپنا دیپ جلائے
توڑ توڑ کے تار رگوں کے — درد نے اپنے ساز بنائے
اک اک ساتھی چھوٹ گیا جب — دکھ نے من میں راگ جگائے

درد ہے اپنا جیون ساتھی
درد ہی اپنے من کو بھائے

سعادت حسن منٹو

خالد میاں (افسانہ)



منٹو اور آنکی بیگم

ممتاز نے صبح سویرے اٹھ کر حسب معمول تینوں کمروں میں جھاڑو دی۔ کونے کھدروں سے سگرٹوں کے ٹکڑے ، ماچس کی جلی ہوئیں تیلیاں اورچیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں ۔ جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہوگئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی بیوی باھرصحن میں سورھی تھی۔ بچہ پنگوڑے میں تھا ۔ ممتاز ھر روز صبح سویرے اٹھ کر صرف اس لئے خود تینوں کمروں میں جھاڑو دیتا تھا ۔ کہ اس کا لڑکا خالد اب چلتا پھرتا تھا اورعام بچوں کی مانند ھر چیز اس کے سامنے آئے۔ اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا ۔

ممتاز ھر روز تینوں کمرے بڑی احتیاط سے صاف کرتا مگر اسکوحیرت ھوتی جب خالد فرش پر سے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لیتا۔ فرش کا پلستر کئی جگہ سے اکھڑا ھوا تھا ۔ جہاں کوڑے کرکٹ کے چھوٹے چھوٹے ذرے پھنس جاتے تھے ۔ ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا جو اسکا پلوٹھی کا بیٹا خالد جسکی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ھوئی تھی ۔ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیتا تھا ۔

ممتاز کو صفائی کا خبط ھو گیا تھا۔ اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر

اپنے منہ میں ڈالتے دیکھتا تو وہ خود کو اسکا مجرم سمجھتا ۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اُس نے کیوں بد احتیاطی کی ۔ خالد سے اُس کو پیار ہی نہیں عشق تھا ' لیکن عجیب بات ہے کہ جوں جوں خالد کی پہلی سالگرہ کا دن نزدیک آتا تھا اُس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اُس کا بیٹا ایک سال کا ہونے سے پہلے مرجائیگا ۔

اپنے اس جونما کے وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کرچکا تھا ۔ ممتاز کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں ۔ اُس کی بیوی نے جب پہلی بار اُس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا " آپ اور ایسے وہم ۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹا سو سال زندہ رہے گا ۔ میں نے اس کی پہلی سالگرہ کے لئے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے "

یہ سن کر ممتاز نے دل کو ایک دھکا سا لگا ۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا زندہ نہ رہے ' لیکن اُس کے وہم کا علاج کیا تھا ۔

خالد بڑا تندرست بچہ تھا ۔ سردیوں میں جب نوکر ایک دفعہ اُس کو باہر سیر کے لئے لے گیا تھا تو واپس آکر اُس نے ممتاز کی بیوی سے کہا تھا " بیگم صاحب ' آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں ۔ کسی کی نظر لگ جائیگی "

یہ سن کر اُس کی بیوی بہت ہنسی تھی بیوقوف" مجھے کیا ضرورت پڑی ہے سرخی لگانے کی ۔ ماشااللہ اسکے گال ہی قدرتی لال ہیں "

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے ۔ مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے ۔ اُسکو پانی کا بہت شوق تھا '
چنانچہ جب وہ انگڑائی لیکر اُٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو دفتر جانے سے پہلے ممتاز اُس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کردیتا ۔ دیر تک وہ پانی کے چھینٹے اُڑا اُڑا کر کھیلتا رہتا ۔ ممتاز اور اُس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے ۔ لیکن ممتاز کی خوشی میں غم کا ایک برقی دھکا سا ضرور ہوتا ۔ وہ سوچتا "خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے ۔ لیکن یہ کیا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے ۔ یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائیگا ۔ کیوں مرے گا ؟ اچھا بھلا صحت مند ہے ۔ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند ۔ میں پاگل ہوں ۔ اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے ۔ لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے ؟ کیا سارے باپ اسی طرح اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں ۔ کیا ہر باپ کو اپنی اولاد کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے ؟ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے ۔

ممتاز نے جب حسب معمول تیلوں کو رے اچھی طرح صاف کرلئے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا ۔ یہ اسکی عادت تھی ۔ صبح اُٹھکر جھاڑو وغیرہ دیکر وہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لئے چٹائی پر لیٹا کرتا تھا ۔ بغیر تکیے کے اسطرح اسکو لطف محسوس ہوتا تھا ۔

لیٹ کر وہ سوچنے لگا ۔ پرسوں میرے بچے کی سالگرہ ہے ۔ اگر یہ بخیر وعافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہوجائے گا ۔ یہ میرا وہم بالکل دور ہوجائے گا ۔ اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے ۔

اسکی آنکھیں بند تھیں ۔ دفعتاً اسنے اپنے

لنگے سینے پر بوجھ سا محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا خالد ہے۔ اسکی بیوی پاس کھڑی تھی۔ اسنے کہا ،، ساری رات بے چین سا رہا ہے۔ سوتے میں جیسے ڈر ڈر کے کانپتا رہا ہے ،،

خالد' ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا۔ ممتاز نے اسپر ہاتھ رکھا اور کہا " خدا میرے بیٹے کا محافظ ہو ،،

ممتاز کی بیوی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا ،، توبہ' آپ کو بس وھموں نے گھیر رکھا ہے۔ ہلکا سا بخار ہے۔ انشا اللہ دور ہوجائے گا ،،

ممتاز نے خالد کے بدن کی حرارت محسوس کی۔ واقعی بخار ہے۔ خدا کرے پرسوں تک ٹھیک ہوجائے؟ ،،

" ہو جائے گا ٹھیک" یہ کہکر ممتاز کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ممتاز نے ہوئے ہوئے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اسکی چھاتی پر اوندھا لیٹا تھا اور سوتے میں کبھی کبھی کانپ اٹھتا تھا۔ تھپکنے سے وہ جاگ پڑا۔ آھستہ آھستہ اسنے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھکر مسکرایا۔ ممتاز نے اس کا منہ چوما " کیوں میاں خالد کیا بات ہے۔ آپ کانپتے کیوں تھے ،،

خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باپ کی چھاتی پر گرا دیا۔ ممتاز نے پھر اسکو تھپکنا شروع کردیا۔ دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اسکے بیٹے کی عمر دراز ہو۔ اسکی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لئے بڑا اھتمام کیا تھا۔ اپنی ساری سہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں۔ درزی سے خاص طور پر اسکی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے۔ دعوت پر کیا کیا چیز ہوگی' یہ سب سوچ لیا تھا۔ ممتاز کو یہ ٹھاٹ پسند نہیں تھا۔ وہ چاھتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گذر جائے خود اسکو بھی پتہ نہ چلے اور اس کا بیٹا ایک برس کا ہو جائے اسکو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔

خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا۔ ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خالد بیٹا' سلام نہیں کروگے اباجی کو"

خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سرپر رکھدیا۔ ممتاز نے اسکو دعا دی "جیتے رہو" لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل پر اسکے وھم کی ضرب لگی اور وہ غم و فکر کے سمندر میں غرق ہو گیا۔

خالد سلام کر کے کمرے سے باھر نکل گیا۔ دفتر جانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ممتاز چٹائی پر لیٹا رہا اور اپنے وھم کو دل و دماغ سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں باھر صحن سے اسکی بیوی کی آواز آئی " ممتاز صاحب' ممتاز صاحب۔ ادھر آئیے ،،

آواز میں شدید گھبراھٹ تھی۔ ممتاز چونک کر اٹھا۔ دوڑ کر باھر گیا۔ دیکھا کہ اسکی بیوی خالد کو غسل خانے کے باھر گود میں لئے کھڑی ہے اور وہ اسکی گود میں بل پہ بل کھا رہا ہے۔ ممتاز نے اسکو اپنی بانہوں میں لیا اور بیوی سے جو کانپ رہی تھی پوچھا " کیا ہوا۔

اسکی بیوی نے خوف زدہ لہجے میں کہا " معلوم نہیں۔ پانی سے کھیل رہا تھا۔ میں نے ناک صاف کی تو دوھرا ہو گیا " ممتاز کی بانہوں میں خالد ایسے بل کھا رہا تھا۔ جیسے

کوئی اسے کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہے۔ سامنے چارپائی پڑی تھی۔ ممتاز نے اسکو وہاں لٹا دیا۔ میاں بیوی دونوں سخت پریشان تھے۔ وہ بڑا بل پہ بل کھا رہا تھا اور ان دونوں کے اوسان خطا تھے کہ وہ کیا کریں۔ تھپکانا چوما۔ پانی کے چھینٹے مارے مگر اس کا تشنج دور نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور خالد پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ ممتاز نے سمجھا، مر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا "ختم ہو گیا"

وہ چلائی "لاحول ولا۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ کنولشن convulsion تھی ختم ہو گئی ابھی ٹھیک ہو جائے گا "خالد نے اپنی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا ممتاز کی ساری دنیا زندہ ہو گئی۔ بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا "کیوں خالد بیٹا۔ یہ کیا ہوا تھا آپکو؟"

خالد کے ہونٹوں پر تشنج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ممتاز نے اسکو گود میں اٹھا لیا اور اندر کمرے میں لے گیا۔ اٹا نے والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی۔ خالد پھر بل کھانے لگا۔ جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے۔ یہ تشنج بھی اسی قسم کا تھا۔ ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ خود اس اذیت کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے۔

دوسرا دورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مرجھا گیا۔ اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں۔ ممتاز اس سے باتیں کرنے لگا۔

"خالد بیٹے یہ کیا ہوتا ہے۔ آپکو؟"

"خالد میاں اٹھونا۔ چلو بھرو"

"خالدی۔ مکھن کھائیں گے آپ؟"

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی۔ لیکن جب ممتاز نے کہا۔ بیٹے گگو کھا ئیں گے؟ تو اسنے بڑے نحیف انداز میں نہیں کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ ممتاز مسکرایا اور خالد کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ پھر اسکو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا "تم اس کا دھیان رکھو۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں"

ڈاکٹر کو ساتھ لیکر آیا تو ممتاز کی بیوی کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اسکی غیر حاضری میں خالد پر تشنج کے تین اور دورے پڑ چکے تھے۔ ان کے باعث وہ بیجان سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا "تردد کی کوئی بات نہیں۔ ایسی کنولشن بچوں کو عموماً آیا کرتی ہے۔ اس کی وجہ دانت میں معدے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں۔ میں دوا لکھ دیتا ہوں۔ آرام آجائے گا۔ بخار تیز نہیں ہے آپ کوئی فکر نہ کریں"

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اسکو دو مرتبہ اور دورے پڑے۔ اس کے بعد وہ نڈھال لیٹا رہا۔ شام ہو گئی تو ممتاز نے سوچا "شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے اتنے عرصہ میں کوئی کنولشن نہیں آئی۔ خدا کرے رات اسی طرح کٹ جائے"

ممتاز کی بیوی بھی خوش تھی "اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد دوڑتا پھرے گا"

رات کو چونکہ مقررہ اوقات پر دوا دینی تھی، اس لئے ممتاز چارپائی پر نہ لیٹا کہ شاید سو جائے۔ خالد کے پنگوڑے کے پاس آرام کرسی رکھ کر بیٹھ گیا اور ساری رات جاگتا رہا۔

دیونکہ خالد بے چین تھا ۔ کانپ کانپ کر بار بار جاگتا تھا ۔ حرارت بھی تیز تھی ۔

صبح سات بجے کے قریب ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا تو ایک سو چار ڈگری بخار تھا ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے کہا فکر کی کوئی بات نہیں ۔ برونکائٹس ہے ۔ میں نسخہ لکھہ دیتا ہوں ۔ دو چار روز میں آرام آجائے گا ۔

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا ۔ ممتاز دوا بنوالایا ۔ خالد کو ایک خوراک پلائی مگر اسکو تسکین نہ ہوی ۔ دس بجے کے قریب وہ ایک بڑے ڈاکٹر کو لایا۔ اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا اور تسلی دی، ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔۔ سب ٹھیک ہوجائے گا“

سب ٹھیک نہ ہوا ۔ بڑے ڈاکٹر کی دوا نے کوئی اثر نہ کیا ۔ بخار تیز ہوتا گیا ۔

ممتاز کے نوکر نے کہا 'صاحب بیماری ویری کوئی نہیں ۔ خالد میاں کو نظر لگ گئی ہے ۔ میں ایک تعویذ لکھوا کر لاتا ہوں ۔ اللہ کے حکم سے یوں چٹکیوں میں اثر کرے گا “ ۔

سات کنوؤں کا پانی اکٹھا کیا گیا ۔ اس میں یہ تعویذ گھول کر خالد کو پلایا گیا کوئی اثر نہ ہوا ۔ ہمسائی آئی۔ وہ ایک یونانی دوا تجویز کر گئی ۔ ممتاز یہ دوا لے آیا مگر اس نے خالد کو نہ دی ۔ شام کو ممتاز کا ایک رشتہ دار آیا۔ ساتھ اس کے ایک ڈاکٹر تھا ۔ اس نے خالد کو دیکھا اور کہا ملیریا ہے- اتنا بخار ملیریا ھی میں ہوتا ہے آپ اسپر برف کا پانی ڈالئیے ۔ میں کونین کا انجکشن دیتا ہوں“ ۔

برف کا پانی ڈالا گیا‘ انجکشن دیا گیا ۔ بخار ایک دم کم ہوگیا ۔ درجۂ حرارت ننانوے ڈگری تک آگیا ۔ ممتاز اوراس کی بیوی کی جان میں جان آئی لیکن تھوڑے ھی عرصہ میں بخار بہت ہی تیز ہو گیا ۔ ممتاز نے تھرما میٹر لگا کر دیکھا ۔ درجۂ حرارت ایک سو چھ تک پہونچ گیا تھا ۔

ہمسائی آئی ۔ اس نے خالد کو مایوس نظروں سے دیکھا اور ممتاز کی بیوی سے کہا ” بچے کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا ہے ۔

ممتاز اور اسکی بیوی کے دل بیٹھ گئے ممتاز نے نیچے کارخانے سے ہسپتال فون کیا ۔ ہسپتال والوں نے کہا مریض کو لے آؤ ۔ ممتاز نے فوراً تانگہ منگوایا خالد کو گود میں لیا ۔ بیوی کو ساتھ اٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا سارا دن وہ پانی پیتا رہا تھا پیاس تھی کہ بجھتی ھی نہیں تھی ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں اس کا حلق بے حد خشک ہو گیا ۔ اس نے سوچا آؤ کر کسی دوکان سے ایک گلاس پانی پی لے لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن ٹپکا ”دیکھو ممتاز اگر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالد مرجائیگا“۔

ممتاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا لیکن اس نے پانی نہ پیا ۔ پیاسا ہسپتال کے قریب تانگہ پہنچا تو اسنے سگریٹ سلگایا دو ہی کش لئے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ پھینک دیا ۔ اسکے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا ۔ ممتاز سگریٹ نہ پیو تمہارا بچہ مر جائیگا۔

ممتاز نے تانگہ ٹھہرایا ۔ اسنے سوچا یہ کیا حماقت ہے یہ وہم سب فضول ہیں ۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آسکتی ہے“

تانگے سے اتر کر اسنے سڑک پر سے سگرٹ اٹھایا ۔ واپس تانگے میں بیٹھ گیا جب اس نے

کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اُسے روکا - نہیں، ممتاز ایسا نہ کرو خالد مرجائےگا ممتاز نے سگریٹ زور سے پھینک دیا -- ٹانگے والے نے گھوڑے کے اس کو دیکھا - ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اُس کو اسکی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اپنی خفت دور کرنے کی خاطر اُس نے ٹانگے والے سے کہا 'خراب ہو گیا تھا سگریٹ' یہ کہکر اس نے جیب سے ایک نیا سگریٹ نکالا ' سلگانا چاہا مگر ڈر گیا اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی -اور ایک کہتا تھا کہ اوہام سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی ' حواس کے متعلق اسکے استدلال اس کے ادراک پر غالب ہوجاتی تھی -

ٹانگہ ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اُسنے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا - اُسکو اپنے اُوپر بہت ترس آیا کہ وہ اوہام کا غلام بن گیا ہے -

ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا - ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا " برونکو نمونیا ہے - حالت مخدوش ہے "

خالد بے ہوش تھا - ماں اُس کے سرہانے بیٹھی ویران نگاہوں سے اُسکو دیکھ رہی تھی - کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا - ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی - نل کھولکر اُس سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اُسکے دماغ میں گونجا " ممتاز ' یہ کیا کر رہے ہو تم - مت پیو پانی - تمہارا خالد مر جائیگا "

ممتاز نے دل میں اس وہم کو گالی دی اور انتقاماً اتنا پانی پیا کہ اُس کا پیٹ اپھر گیا - پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اُس کا خالد اُسی طرح مرجھایا ہوا بے ہوش ہسپتال کے آہنی پلنگ پر پڑا تھا - وہ چاہتا تھا کہیں بھاگ جائے - اُس کے ہوش و حواس غائب ہوجائیں - خالد اچھا ہوجائے اور وہ اُس کے بدلے نمونیا میں گرفتار ہوجائے

ممتاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے - اُس نے سوچا ' یہ سب اُسکے پانی پی لینے کا باعث ہے - اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی حالت بہتر ہوجاتی - اُس کو بہت دکھ ہوا - اُس نے خود کو بہت لعنت ملامت کی ، مگر پھر اُسکو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی کہ وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا - یہ اور کون تھا ؟ کیوں اُس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہونے لگے - پیاس لگی تھی ' پانی پی لیا - اس سے خالد پر کیا اثر پڑسکتا ہے - خالد ضرور اچھا ہو جائیگا - پرسوں اسکی سالگرہ ہے - انشاالله خوب ٹھاٹ سے منائی جائیگی -

لیکن فوراً ہی اُس کا دل بیٹھ جاتا -کوئی آواز اُس سے کہتی " خالد ایک برس کا ہونے ہی نہیں پائیگا " ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان پکڑے اور اُسے گدی سے نکال دے - مگر یہ آواز تو خود اُس کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی - خدا معلوم کیسے ہوتی تھی - کیوں ہوتی تھی -

ممتاز اسقدر تنگ آیا کہ اُسنے دل ہی دل میں اپنے اوہام سے گڑگڑا کر کہا " خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو - کیوں تم مجھ غریب کے پیچھے پڑ گئے ہو -

شام ہو چکی تھی - کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے - دوا دی جارہی تھی - کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد ابھی تک بے ہوش تھا - دفعتاً ممتاز کے دماغ میں

یہ آواز گونجی ”تم یہاں سے چلے جاؤ - فوراً چلے جاؤ ' ورنہ یاد رکھو خالد مر جائیگا“

ممتاز کمرے سے باہر چلا گیا - اس کے ہسپتال سے باہر چلا گیا - اسکے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں - اسنے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا - اپنی ہر جنبش ' اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دیں - یہ آسے ایک ہوٹل میں لے گئیں - انھوں نے اسکو شراب پینے کیلئے کہا - شراب آئی تو آسے پھینک دینے کا حکم دیا - ممتاز نے ہاتھ سے گلاس پھینک دیا تو اور منگوانے کیلئے کہا - دوسرا گلاس آیا تو آسے بھی پھینک دینے کے لئے کہا -

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کا بل ادا کرکے ممتاز باہر نکلا - اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے - صرف اسکا دماغ ہے جہاں شور برپا ہے - چلتا چلتا وہ ہسپتال پہونچ گیا - خالد کے کمرے کا رخ کیا تو آسے حکم ہوا ” مت جاؤ ادھر - تمہارا خالد مر جائیگا “

وہ لوٹ آیا - گھاس کا میدان تھا - وہاں ایک بنچ پڑی تھی - اس پر لیٹ گیا - رات کے دس بج چکے تھے - میدان میں اندھیرا تھا - چاروں طرف خاموشی تھی - کبھی کبھی کسی موٹر کے هارن کی آواز اس خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی - سامنے اونچی دیوار میں هسپتال کا روشن کلاک تھا - ممتاز خالد کے متعلق سوچ رہا تھا ” کیا وہ بچ جائیگا - یہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں جنہیں مرنا ہوتا ہے - وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں چلا جانا ہوتا ہے - خدا ضرور - “

ایک دم اسکے دماغ میں ایک وہم پھوٹا - بینچ پر سے اتر کر وہ سجدہ میں گر گیا - حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے ممتاز سجدے میں پڑا رہا وہ دعا مانگنا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو - ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ خالد کے لئے نہیں اپنے لئے دعا مانگنے لگا - خدایا مجھے اس اذیت سے نجات دے دے تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو مار دے یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو“ دفعتاً اسے آوازیں سنائی دیں اس سے کچھ دور دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے“ —

” بچہ بڑا خوب صورت ہے“

”ماں کا حال تو مجھ سے دیکھا نہیں گیا بیچاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی“

” ہم نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی - بچنا محال ہے“

میں نے یہی کہا تھا ماں سے کہ دعا کرو بہن !“

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا - اس کو زور سے آواز دی ” اے کیا کر رہا ہے تو — ادھر آ “ —

” ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا - ایک نے اس سے ” پوچھا کون ہو تم “ ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا ”جی میں ایک مریض —“

ڈاکٹر نے سختی سے کہا ” مریض ہو تو اندر جاؤ — یہاں میدان میں ڈنڑ کیوں پیلتے ہو ؟“

ممتاز نے کہا ” جی میرا بچہ ہے - ادھر اس وارڈ میں “

” وہ تمہارا بچہ ہے جو —“

" جی ھاں - شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے - وہ میرا بچہ ہے - خالد "
آپ اسکے باپ ھیں ؟ "
ممتاز نے اپنا غم و اندہ سے بھرا ھوا سر ھلایا " جی ھاں، میں اس کا باپ ھوں "
ڈاکٹر نے کہا " آپ یہاں بیٹھیے ھیں - جائیے آپکی وائف بہت پریشان ھیں "
" جی اچھا " کہہکر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ھوا - سیڑھیاں طے کرکے جب اوپر پہونچا تو کمرے کے باھر اس کا نوکر رورھا تھا - ممتاز کو دیکھکر اور زیادہ رونےلگا " صاحب خالد میاں فوت ھوگئے "
ممتاز اندر کمرے میں گیا - اسکی بیوی بے ھوش پڑی تھی - ایک ڈاکٹر اور نرس اسکو ھوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے - ممتاز پلنگ کے پاس کھڑا ھوگیا - خالد آنکھیں بند کئے پڑا تھا - اسکے چہرے پر موت کا سکون تھا - ممتاز نے اسکے ریشمیں بالوں پر ھاتھ پھیرا اور دل چیر دینے والے لہجے میں اس سے پوچھا " خالد میاں گگو کھائیگے آپ ؟ "
خالد کا سر نفی میں نہ ھلا - ممتاز نے پھر درخواست بھرے لہجے میں کہا " خالد میاں میرے وھم ے جائیگے اپنے ساتھ " ؟
ممتاز کو ایسا محسوس ھوا کہ جیسے خالد نے سرھلا کر ھاں کی ھے -

بقیہ صفحہ ۵۲ (افسانہ صلاح الدین اکبر)

صاحب نے اسے بتایا - " ھم نے تو بڑی کوشش کی تھی مگر ــــ "
" باقی تو اپنی قسمت ھے " دفتر کے ھیڈ کلرک صاحب بولے " میری بیوی کو اس سے بھی زیادہ تکلیف تھی - آدھی رات گئے انہیں ھسپتال پہنچایا تھا - اب بالکل ٹھیک ھے - اچھا اللہ صبر دے -
" بچوں کے سر سے سایہ اٹھ گیا - مصیبت ھے بچاروں کے لئے -
" کسی اور نے کہا - " جی ھاں ' اپنی ماں ' اپنی ھی ماں ــــ "
اور مکان کے احاطے سے لیڈر صاحب کی بیوی اپنی بچی کو انگلی سے لگائے بڑے اطمینان سے چلی آرھی تھیں -
" انہوں نے ھمیں اطلاع ھی نہیں دی - آخر آدمی ھوتا کس لئے ھے - ھم قریب ھی تو تھے - وہ خود قومی کاموں کے لئے باھر گئے رھتے ھیں مگر ھم سب - اور پھر رات کو تو لڑکے سنیما دیکھ کر ھوٹل سے چائے وغیرہ پی کر کافی دیر سے گھر لوٹے تھے - شاید جاگ ھی رھے ھوں اسوقت انہیں ھی کہہ دیا ھوتا ــــ بڑا ردی ملک ھے جی ــــ '
" ابا جی ! " کسی نے جنگلے پر سے آواز دی '
" کیا ھے " فالج زدہ آدمی نے سڑک پر سے جواب دیا -
" ننھا رو رھا ھے ــــ "
" گلہ گھونٹ دو اسکا ' چھہ کیا کم تھے یہ اور آگیا ھے - مصیبت نئی ــــ ! "

صلاح الدین اکبر



[illegible] افسانه

" ڈاکٹر صاحب ؟ " وہ لنگڑاتا ہوا ایک چارپائی میں گر گیا ' چارپائی کا موٹی لکڑی کا فریم ڈھیلی ڈھیلی رسیوں میں بندھا ہوا چیخ اٹھا اس نے بان کی رسیوں پر پڑی ہوئی دلائی کو ہاتھ سے درست کیا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنی ٹانگ کو اٹھا کر چارپائی پر رکھ لیا۔

" میری حالت بڑی کمزور ہے ' ہر طرح سے ' یوں توآپ دیکھ ہی رہے ہیں میں ٹھیک سے چل پھر نہیں سکتا ' میرے ہاتھ میں بھی طاقت کم ہے۔ ویسے بھی میں کئی ماہ سے بیکار ہوں۔

اسی لئے آپ کی کچھ خدمت نہیں کر سکتا۔ آپ کو میں نے تکلیف تو بہت دی ہے سردی کے موسم میں۔ اتنی رات گئے آپ کو بےآرام کیا مجبوری تھی۔ آپ نے مہربانی کی ' میں کہاں جاتا ' میری بیوی سخت تکلیف میں تھی ' دو گھنٹے سے اسی سوچ میں تھے کہ شاید حالت بہتر ہو جائے ! مگر اب تو اس کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی "

اور ڈاکٹر چارپائی کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر سے جھک کر انگیٹھی سے آگ پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گہری سوچ میں غرق ہو جاتا اور پھر سر ہلاتا جیسے اس کی کچھ سمجھ میں آ رہا ہو۔ کہ ساتھ کے کمرے سے ایک لمبی چیخ سنائی دی جیسے کوئی زخمی فریاد کر رہا ہو۔ یا وہ شخص اپنی رہائی کے لئے چلائے۔ جس کے گلے کے گرد مضبوط ہاتھ اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے ہوں۔

" اوئی میرے اللہ۔ آو مجھے پکڑو ' میری جان نکلی۔ "

" آپا ! آپا ' ایسا نہ کہو "

" مجھے تھامو ' مجھے پکڑو ! "

اور ڈاکٹر نے ہاتھ آگ سے پرے ہٹا لیا ' اپنے بیگ میں سے چیزیں ادھر ادھر پلٹتا رہا۔

" میں ذرا دیکھ لوں ان کو — " اس نے کہا۔

" ہاں ہاں! " چارپائی پر بیٹھے ہوئے مردنے اپنے ہاتھ سے اپنی ٹانگ چارپائی پر سے اُٹھائی اور اسے زمین پر چھوڑ دیا ' ایک کبڑا سا پاؤں کی پرانی سی چپلی میں گھس گیا اور دوسرے لمحے سارا جسم اس ٹانگ پر زور دیتا ہوا ایستادہ ہو گیا۔

" تم ذرا پردہ کر لو کلثوم ! "

" جی اچھا ! "

" چلئے ڈاکٹر صاحب! " اور ڈاکٹر صاحب لنگڑاتے ہوئے انسان کے ساتھ' پاس کے کمرے میں بیگ ایک ہاتھ میں تھامے اور دوسرے میں سیٹتھوسکوپ لئے پہنچ گئے۔

ساتھ کے چھوٹے سے کمرے میں قریب ہی قریب دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں ' ایک چارپائی پر مریض تھا۔ اور دوسرے پر کوئی چیز لحاف میں بیٹھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مریض کی نبض دیکھی ' اس کی عام حالت پر غور کیا ' سٹیتھوسکوپ سے ہتھیلی کو ٹھکورتے ہوئے مریض کے قریب بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت سے کہا۔

" انکی یہ حالت کب سے ہے ؟ "

اور بوڑھی عورت نے جو اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جواب دیا" دو گھنٹے سے زیادہ عرصہ ہو گیا "

" دو گھنٹے سے بے ہوش ہیں ؟ "

" ہاں جب سے بچہ پیدا ہوا ہے ! "

" اور اسکے بعد ! اب پیٹ میں کوئی حرکت نہیں ؟ "

" جی نہیں "

" پھر یہ اضطراب کیوں ؟ " ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا جیسے وہ یہ سوال خود سے کررہا تھا، بوڑھی کے پاس شاید اس کا جواب نہیں تھا۔ یا جو جواب وہ دینا چاہتی تھی نہ کہہ سکتی تھی۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ یہی معلوم کرنے کے لئے تو انہوں نے اسے تکلیف دی تھی۔

" یہی تو دیکھنا ہے۔ اگر درد نہیں تو......."

" درد آھی نہیں رہا یا......."

" اس کی حالت تو دیکھئے کیا سے کیا ہوتی جارہی ہے۔" لحاف میں سے آواز بلکہ چیخ سنائی دی۔ " اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے " ہلدی کی طرح زرد اور بے جان۔"

اور ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے مریض کے چہرے کی طرف دیکھا نبض سست تھی اور رنگ۔ جب سفید رنگ میں سے خون کی سرخی چھین لی جائے تو بے جان زرد ہی رہ جاتا ہے۔

" معلوم ہوتا ہے کافی خون ضائع ہو گیا ہے "

" اس کی نبض کیا کہتی ہے ڈاکٹر صاحب " مریضہ کے خاوند نے لنگڑاتے ہوئے ایک قدم لیا اور ڈاکٹر کے قریب ہو کر پوچھا۔ اس کے قدم کی گھسٹتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی پاس چارپائی پر لحاف کے بنے ہوئے خیمے سے ایک سسکی سنائی دی۔

" گھبرائیے نہیں میں ایک ٹیکہ دیتا ہوں "

اور ڈاکٹر پھر ساتھ کے کمرے میں چلا آیا۔

" میرے ہاتھ دھلادیجئے " اور ڈاکٹر اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے پٹ کھول دئیے سرد ہوا کے نرم جھونکے نے اس کی آنکھوں کو ایک عجیب ٹھنڈک کا احساس دیا۔

" ناصر حسین،ناصر! ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ دھلاؤ! گرم پانی اور صابن لے لو۔"

" جی اچھا ،، ایک سفید پھر تیلا بچہ چارپائی میں سے کودا اور اس کے منہ سے آواز نکلی ،

" یا اللہ ، مری امی جی گو—ا ،، اس نے قمیض کے گھیرے سے اپنی آنکھیں پونچھویں—،،

ڈاکٹر کھڑکی میں سے بلڈنگ کے صحن کو بیکار دیکھ رہا تھا ۔ صحن میں تاریکی ہوتی اگر چاند روشن نہ ہوتا—اس کا مریض غالباً اس مکان کے تیسویں یا چالیسویں حصے کا کرایا دار تھا ہر کرایہ دار کے حصے میں یہ دو کمرے اور علیحدہ تاریک سیڑھیاں تھیں ، ان دو کمروں کے ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ کے لئے دو چھوٹے کمرے تھے ۔ اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی جنگلہ لگی جگہ تھی ۔ جو سڑک کی طرف کھلتی تھی ، چالیس حصوں میں آبادی تھی مگر اس وقت سب تاریک تھے ۔ کسی میں روشنی ، زندگی یا حرکت کا نام تک نہ تھا ساتھ کے حصے میں بھی جس کی دیواریں مشترک تھیں کوئی حرکت یا کوئی آواز نہ تھی جیسے ان میں سے کسی کو بھی اس حصے سے تعلق نہ تھا ۔

ڈاکٹر اسی آبادی کا رہنے والا تھا ۔ اسے کسی قدر معلوم تھا کہ اس جگہ کس کس قسم کے لوگ رہتے تھے ۔ اس نے ہمیشہ اس ایک بلڈنگ کو ایک مکان سمجھا تھا ۔ جس کے یہ بہت سے حصے اس کا جزو تھے ۔ مگر اسوقت اسے بڑی حیرت ہورہی تھی کہ اس جسم کے ایک حصے کو تکلیف تھی اور باقی حصے بیکار اندھیرے میں گم تھے ۔

یہ بھی ہوسکتا تھا اس نے سوچا کہ ساتھ کے حصے میں رہنے والے ریلوے کے ملازم ابھی ڈیوٹی سے آنے والے ہیں ' ان کے بال بچے ' ان کی بیوی ان کا انتظار بھی کر سکتی تھی اور اس انتظار کا کوئی نشان تو ہونا چاہئیے تھا ۔ یا وہ اسے بالکل میکانکی عمل سمجھ چکے تھے ۔ جیسے وہ اس خاندان کا محض ایک پرزہ تھا ' بے جان اور خود کام کرنے والا پرزہ ' متحرک جسم یا روح نہ تھا ۔

یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ قریب ہی کے دفتر کے ہیڈ کلرک صاحب دن بھر دفتر میں جھک کر بیٹھنے کے بعد رات کو چارپائی میں جھک کر بیٹھنے پر مجبور ہوں ۔ مگر آج انہیں بھی دمے کا دورہ نہ تھا ۔ اور وہ اس رات کو غنیمت جان کر سورہے تھے اور اسی بلڈنگ میں جو لیڈر صاحب تھے ۔

"ھانہ دھولجئے" لڑکے نے بدھا زور سےزمین پر دھرے ہوئے کہا ۔ ھانہ دھلاتے ہوئے بھی اس کے لب ہل رہے تھے ۔ 'یا اللہ جی—میری امی' یااللہجی——'' لفظ آکھڑے آکھڑے اس کی زبان پر تھے ۔ اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں ۔ اور لب سردی کی وجہ سے نیلے — سرنچ بھرتے ہوئے اس نے لڑکے سے کہا ' تم لحاف میں گھس جاؤ ۔ کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے''

" ہاں اوڑھ لے لحاف " اس کے باپ نے بھی اسے تلقین کی ۔ اور پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہو گیا " مجھے بھی سردی لگی تھی ۔ ایسے ہی "

آئیے ٹیکہ کردیں پہلے ۔ آپ گبھرائیے نہیں ''ڈاکٹر نے اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا ۔ " آپ ذرا پردا کروادیں "

" تم پردے ہی میں ہو نہ کلثوم " — چلئے ڈاکٹر صاحب " ٹیکہ لگانے کے بعد ڈاکٹر اس کے قریب بیٹھا رہا "

" آپ نے پہلے کیوں کوشش نہیں کی " ؟

" آپ دیکھ ہی رہے ہیں - جو میری حالت ہے - اس پر بھی صبح سے بھاگ رہا ہوں ' ایک ہسپتال ' دوسرا ہسپتال مگر جناب ہم جیسے لوگوں کو کہاں جگہ ملتی ہے - " یہ دیکھئے ' تشریف لائیے اس طرف میں آپ کو پرچیاں دکھاؤں --- آج سے پہلے بھی کئی بار دکھا چکا ہوں ہسپتال میں ' تشریف لائیے " اس نے دوسرے کمرے کی طرف گھسٹتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر نے بھی مناسب سمجھا کہ دوسرے کمرے ہی میں چلا جائے ' مریض کے ساتھ کی چارپائی میں حبس جیسا بنا ہوا تھا - اس میں کسی کا دم گھٹ جانے کا خطرہ تھا -

" یہ دیکھئے ' آپ ملاحظہ کیجئے ' میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا لکھا ہے - انہیں صبح سے تکلیف تھی - ہم نے سمجھا تھا داخلہ مل جائیگا ' ہمارا وقت کٹ جائیگا - اس وقت مالی حالت بھی ایسی ہی ہے -

اب آپ سے کیا چھپائیں ' دل پر بڑا جبر کر کے ان دو کمروں میں گزارہ کرتے ہیں - کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہیں - اپنے گھر تھے - زمین تھی - سبھی کچھ تھا مگر اب --- اب بھی اللہ کا شکر ہی کرنا چاہئے -

" آپا --- آپا " ساتھ کے کمرے سے آواز آرہی تھی - " آپا دیکھو تو ڈاکٹر آئے ہیں ' پردہ کر لو ! "

اوو ' میری جان نکلی ! مجھے پکڑو "

" پہلو نہ بدلنے دو کلثوم " بوڑھی عورت کی آواز آئی - " اسے پکڑو ' سیدھی لیٹی رہے اور وہ کپڑا لینا ' اس کے پیٹ پر ذرا کس کر باندھ دیں - یہ بھی بعض اوقات فائدہ مند ہوتا ہے - شاید اس کے دبانے سے --- ہاں بیٹی ذرا باندھ دے ' ذرا سا دباؤ ' ذرا سی گرمی --- ! "

" اللہ جی ! میری امی " لحاف میں سے لڑکے کی آواز آئی -

" اللہ مصیبت کے وقت ہی یاد آتا ہے - " آدمی نے کہا - " یہ میری شکل دیکھئے نا ' یہ مشرع داڑھی بھی اسی مصیبت کی پیداوار ہے - ورنہ میں بالکل کلین شیو تھا ' جب سے مجھے یہ عارضہ ہوا ہے - یہ داڑھی بڑھ گئی ہے - انسان بڑی عجیب چیز ہے - آدم اور حوا کی اولاد کو اگر ذرا بھی سکھ نصیب ہو تو خدا کو بھول بیٹھتی ہے ' اب آپ سے کیا کہوں کہ اس ایک مکان میں ' یہاں ہر قسم کے آدمی ہیں - ہم نے راتوں کی تاریکی میں ارد گرد کیا نہیں دیکھا -

ہم بھی اپنے خدا کو بھول بیٹھے تھے مصیبت نے یاد دلایا اب اگر اس نے ہمیں توفیق دی ذرا اس تکلیف سے نجات ہوئی تو سب کو بتائیں گے نماز روزہ سب بھول بیٹھے ہیں ڈاکٹر صاحب سب اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے - ویسے ہم بھی آل رسول ہیں ' سید زادے ہیں ' ---

' او آئی ' " پھر ایک چیخ اٹھی

آو اپا " دوسری آواز سے کہ وہ بھی چیخ سے کم نہ تھی " امی " لڑکے کی آواز سنائی دی -

ذرا بوڑھی اماں کو اس طرف بلوائیے ڈاکٹر نے کہا -

کچھ حرکت ہوئی ؟ "

" بالکل نہیں "

پھر اس کی وجہ ڈاکٹر سوچنے لگا اور بوڑھی عورت اسے سوچ میں غرق دیکھ کر مریض کے پاس چلی گئی ڈاکٹر سٹیتھوسکوپ سے ویسے ہی کھیلتا ہوا بولا -

بچے کی پوزیشن ! ''

اور اس نے مڑ کر جب دیکھا کہ بوڑھی عورت جا چکی تھی اور اس کے قریب کی چارپائی پر بیٹھا آدمی اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا تھا ۔ تو اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اسے اس سے پہلے کچھ کہنا چاہئے تھا اور جب اس نے یہ سوال کر ہی لیا تھا تو اس کا جواب ؟ اس نے آدمی کی طرف دیکھا

''جی'' آدمی نے یہ سوال سنا ہی نہ تھا اسے تو افسوس ہوا کہ وہ نہ ہی سنتا تو اچھا تھا ۔ اس نے اگر آواز سن ہی لی تھی تو بات بھی سن لیتا ۔

'' بچہ ٹھیک پیدا ہوا تھا ؟ میرا مطلب ہے ... '' '' جی ! بالکل ٹھیک !'' اس نے یقین سے کہا ۔ آپ کے اور کتنے بچے ہیں ۔ ؟ ''

'' جی یہ ساتواں بچہ ہے ' اب آپ سے کیا چھپانا ہے '' اس نے رضائی اپنے اوپر کھینچتے ہوئے کہا ۔ '' باوجود ہماری کوشش کے میرا مطلب ہے ہمارے ذرائع اتنے نہیں کہ اتنا بوجھ برداشت کیا جا سکے -- بوجھ ہی تو ہے آخر اپنی ساری اولاد --- لاکھ مصیبت ہوتی ہے ۔ پالنا ' پوسنا آپ تو اس جھنجٹ میں نہیں پڑے نا ؟ ''

'' جی نہیں ! ''

'' اچھا کیا ' جتنی دیر انسان بچ سکے اسے بچا ہی رہنا چاہئے جی تو چاہتا ہوگا ۔ اور جی چاہا ہی کرتا ہے -- لیکن میں ۔ یہی کہوں گا میرا تجربہ یہی ہے کہ محفوظ رہ سکو تو اچھا ہے ' لاکھ جھنجٹ ہوتے ہیں ہمارا بھی یونہی جی مچل اٹھا تھا ۔ ان دنوں جوانی کا جوش تھا ۔ چار پیسے بھی آنے شروع ہو گئے تھے ۔ ماں باپ کی جائداد بھی تھی -- خود کھلوا کے میری شادی کراوئی تھی --

'' کچھ وقت نہ '' اس نے ایک بازو کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا ۔ '' چونچلے نازبرداری میں گزر گیا ' کچھ وقت اس طرح گذر جاتا ہے ۔ انسان سمجھتا ہے ... ماں کی گود سے نکل کر جو جنت اس سے چھن گئی تھی اس نئی عورت کی آغوش میں سے پھر سے مل گئی ہے ۔ مگر بہت جلد سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اگر اس کی آہ و زاری سے اسے مل بھی جائے تو اسے جنت نہیں ملتی صرف دنیا ملتی ہے ۔ اور پھر دنیا داری کے جھگڑے ۔ !''

'' بھائی ادھر آنا ذرا سا آپ '' کروٹ نہ لو بھائی ''۔

سامنے کے کمرے سے گھبرائی اور بھرائی سی آواز آئی ۔

آیا ہوں --- کیا بات ہے آخر ''

اور ویسے ہی کوستا ہوا وہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا ۔ تھوڑی دیر سے کچھ سمجھاتا رہا ' الجھی الجھی سی آوازیں آتی رہیں اور پھر وہ واپس آ گیا ۔

' یا اللہ جی مرتی ہوں '' لڑکی کا ورد جاری تھا ۔ لحاف میں سے اٹھتی ہوئی آوازیں ڈاکٹر سن رہا تھا ۔

'' کیا بات تھی جی !'' ڈاکٹر نے پوچھا

'' کچھ خاص بات نہیں ' حالت ویسی ہی ہے ' لڑکی پریشان ہو رہی تھی ' بیچاری ! اسے کیا پتہ --

دنیا داری کے جھگڑے ' اللہ جانے ان سے یہ لڑکی میری بیوی کی بہن ہے ' یہ بھی ہمارے پاس ہے ۔ جب ادھر ہندوستان میں گڑبڑ ہوئی تو ان کے والدین نے سوچا کہ اور چیزیں تو خیر جو پڑے کی لپیٹ لیں گے ان کو

ادھر بھیج دیا پھر ان کے والد کا انتقال ہوگیا ماں پہلے ہی نہیں تھی ایک بھائی ہے سو ادھر ہے وہ اس کا خرچ بھیج دیا کرتا تھا تھوڑا بہت مگر جب سے یہ جھگڑے پڑ گئے ہیں سرحد سے آ جا کچھ نہیں سکتا نہ پیسہ نہ کپڑا' نہ لتا۔ کپڑا لتا اس کا سب کچھ ادھر ہی ہے ۔ ہم نتظار کر رہے تھے اس نے جہیز کا سامان ہم غریب لوگ تو پس گئے تھے یونہی —— اب ان بیماریوں نے آلیا میں چھ ماہ سے چارپائی پر پڑا ہوں' چار پائی ہی پر سمجھئے' اب یہ ذرا گھسٹ کے ادھر ادھر آ جا سکتا ہوں پہلے یہ بھی نہیں تھا۔ تین ماہ تو آدھی تنخواہ پر چھٹی ملگئی۔ اب بغیر تنخواہ کے چھٹی پر ہوں —— جو کچھ جمع تھا ۔ تھوڑا بہت اس کی نظر ہو گیا ۔

ڈاکٹر نے بیگ بند کر کے چار پائی پر رکھ دیا اور خود کھسک کر کرسی کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے آگ سینکنی شروع کردی ۔

اس نے جمائی لیتے ہوئے گھڑی پر نظر کی —— ایک بج رہا تھا ۔ اس نے بلا وجہ سٹریپ پر زور دے کر گھڑی کو کلائی پر مروڑنا شروع کر دیا سٹریپ کئی جگہ سے کریک ہو رہا تھا ۔ مریضہ کا خاوند اپنی کہے جارہا تھا ۔

"میں بالکل نہیں چاہتا تھا کہ ۔ اور اولاد کا بوجھ مجھ پر پڑے' آخر کل کو انہیں بڑا ہونا ہے ۔ ان کا لکھنا پڑھنا —— اور سو قسم کی مصیبت ہوتی ہے ——

ویسے بھی نور جہاں — ناصر کی امی 'کی صحت اس طرف سے ادھر آنے اور گھر کے غم نے خراب کردی تھی ۔ رہی سہی میری بیماری اور روپے کی اس کمی نے پوری کردی 'اسی لئے ہم نے بڑی کوشش کی تھی کسی طرح یہ بات ٹل جائے۔ مگر جو خدا کو منظور ہو' ہو کر ہی رہتا ہے ۔ اور پھر اگر میاں بیوی میں محبت زیادہ ہو اور وہ یکایک خاموش ہو گیا ۔ ابھی تک اس کی مدھم اور (Monotonous) غیرمانوس آواز ڈاکٹر کے تھکے ہوئے ذہن کے خیالات کو تھپک سی رہی تھی اس کے یوں خاموش ہونے سے اس کے خیالات منقطع سے ہو گئے ۔

ڈاکٹر نے کرسی انگیٹھی سے ذرا اور پرے کھسکائی اور جمائی لیتے ہوئے پھر سے گھڑی کو کلائی پر مروڑ دیا اور اسے احساس ہوا کہ اگر اسے ذرا زور سے کھینچا گیا تو اسی وقت گھڑی کو اپنی گرفت سے آزاد کردے گا کتنا نازک رشتہ ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ اسے مروڑ کر توڑ دے ۔

"کیا کہہ رہے تھے آپ ؟"

"جی میں کہہ رہا تھا کہ یہ محبت کے رشتے !"

'کتنے نازک ہوتے ہیں' اس سٹریپ کی طرح جب چاہا' 'جی نہیں مضبوط" آدمی نے بات کاٹ دی ۔

"جی ہاں ڈاکٹر نے جواب دیا" سٹریپ کی جگہ طلائی زنجیر بھی ہو سکتی ہے ۔

طلائی زنجیر کہاں ڈاکٹر صاحب" اسنے پھر ویسی ہی بھاری سی آواز میں بولنا شروع کردیا۔ "ناصر کی امی کے لئے بالیاں بنوائی تھیں بڑا اوور ٹائم کام کیا اور ایسے ہی اوور ٹائم کے بعد رات کو دفتر سے آتے ہوئے سردی لگ گئی' بس اس دن سے اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا طلائی بالیاں تو ایک طرف جو کچھ پہلے تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا ۔ اور اب یہ حال ہے کہ مجھے آپ سے معذرت کرنا پڑ رہی ہے میرا خدا جانتا ہے میں کس قدر شرمندہ ہوں ' مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے آپ کو

بہت بے وقت تکلیف دی ہے۔

" بھائی ذرا ادھر آنا سڑک کی طرف کوئی صاحب ہیں" ساتھ کے کمرے سے آواز آئی۔

" اچھا؟" ناصر! دیکھ تو بیٹا کون ہے

" جی اچھا" اور وہ سیڑھیوں سے جلدی جلدی اترنے لگا۔

" ارے ادھر ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔" مگر وہ جا چکا تھا، اور اتنی ہی تیزی سے واپس ہو گیا۔ " سامنے والے بابو جی ہیں"

" کون سامنے والے۔"

" جی وہ جو گلی کی نکڑ پہ رہتے ہیں— "

" کیا کہتے ہیں وہ!"

" جی! جی، لڑکا سوچ رہا تھا کہ یہ تو اس نے پوچھا ہی نہ تھا جلدی جلدی آنے جانے کی وجہ سے اس کا سانس چل رہا تھا۔

" پوچھوں!"

" خیر، گھس جاؤ تم لحاف میں، اور مصیبت کھڑی کرو گے تم، میں خود ہی پوچھ لیتا ہوں— اماں ذرا بلا لینا ان کو ادھر سے—"

" خیر تو ہے۔" آنے والے نے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

" ناصر کی امی کو تکلیف ہے حمید صاحب" اس نے کہا۔

" اوہو شب سے، میں تو ابھی آرہا تھا سنیما دیکھ کر آپ کی بتی روشن دیکھی اور کچھ چیخیں سی سنائی دیں رات کے سناٹے میں یہ آوازیں بھی تو دور دور تک سنائی دیتی ہیں۔ میں نے سوچا پوچھ لوں۔ آپ کی طبیعت— !"

" مجھے کہاں، میں تو گھسٹ ہی رہا ہوں اب ناصر کی امی—بچہ ہوا ہے نا، دیکھئے میں کتنا پریشان ہوں کہ ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی—"

" خیر وہ تو ہونا ہی رہے گا۔" حمید صاحب نے کہا۔ " میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں—ڈاکٹر صاحب کیسی حالت ہے ان کی—"

" دیکھئے ایک ٹیکہ دیا ہے میں نے اگر اس کا کچھ اثر ہوا تو خیر ورنہ انہیں ہسپتال ہی لیجانا پڑے گا۔ انہوں نے بلایا مجھے بہت دیر میں—"

او ہو! یہی تو خرابی ہے ہم لوگوں میں ڈاکٹر صاحب میں کچھ دیر یورپ میں رہا ہوں، کیا مجال جو ایسی بات ہوجائے ادھر ذرا کوئی تکلیف ہوئی جھٹ ڈاکٹر کا مشورہ، یہاں بس آخری وقت ہی ڈاکٹر کو بلانا ہوتا ہے۔ اور بیچارہ ڈاکٹر وہاں— ایک بار میرے پاؤں کو موچ آگئی میں نے سرراہ یونہی دکھا دیا کہ کچھ ملنے ولنے کو دیں گے۔ مگر یقین مانئے چھ ایکسرے ہوئے کوئی ادھر سے کوئی ادھر سے، اس زاویے سے اس زاویئے سے وہاں کی کیا بات ہے۔

یہ ساتھ کے ہیڈ کلرک صاحب ہیں نا، ان کی بیوی کو بھی تکلیف ہوگئی تھی کچھ اس بچے کی پیدائش پر، بیچاری کئی گھنٹے بے ہوش رہی۔ عورتیں ادھر ادھر کے ٹونے ٹوٹکے لگاتی رہیں۔ ان کے میاں سخت پریشان، مجھے پتہ چلا، میں نے انہیں ہسپتال جانے کی صلاح دی، مگر اسکے لئے راضی کوئی نہ ہوتا، مشکل سے منایا اور اب وہ اچھی بھلی ہے۔ یہ بروقت طبی امداد—"

" جی ہم نے تو بہت کوشش کی تھی، ہم تو خود چاہتے تھے۔ کہ ہمارا یہ وقت کسی طرح اس بڑے خرچ کے

بغیر ٹل جائے مگر ہمیں داخلہ ہی نہ مل سکا ، آج شام بھی گئے تھے مگر —،،

،، اس کیس کو داخلہ نہیں ملا تو ملتا کن کو ہے ، کمال ہو گیا ،،

،، معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب ، یہ حالت ہے ہمارے ہسپتالوں کی — ،،

،، آپ یہاں کچھ نہیں کر سکتے ،، مریضہ کے خاوند نے ڈاکٹر سے کہا ،، جی نہیں ،، دیکھئے اگر کوئی چیز دی تو اس سے Bleeding زیادہ ہو گئی تو ؟ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی ثانئے میں سارے جسم کا خون بہہ نکلے ۔ ایسی حالت میں خون کی گردش بھی تو اسطرف بہت ہوتی ہے ۔ اور ہمارے پاس اتنا مکمل انتظام نہیں ہے ۔ یہاں ۔ بڑی ذمہ‌داری کا کام ہے ۔ ،،

ذمہ داری ' وہ تو سب کچھ خدا کے ہاتھ ہے ۔ اس کے قبضئہ قدرت میں ہے ۔ اگر آپ کچھ — ! ،،

جی میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا ایسی حالت — میرا خیال یہی ہے کہ انہیں ہسپتال پہنچا دیا جائے — حمید صاحب اگر تکلیف کرکے ایمبولینس کا انتظام کردیں ،،

،، ان کی کرم فرمائی ہے ،،

،، جی کرم فرمائی کی کیا بات ہے ۔ انسان اگر دوسرے انسان کے ایسے وقت بھی کام نہ آئے تو — میں ابھی جاتا ہوں ۔ میری کار حاضر تھی مگر اس پر یہ لے جائی نہیں جا سکتیں — ،،

،، خدا آپ کا بھلا کرے ، آپ کوشش کیجئے ' مجھے تو شام ایمبو لینس نہیں ملی ۔ کہہ رہے تھے خراب ہو گئی ہے ۔

،، خراب ہو گئی ہے ؟ خراب ہو گیا ہے ان کا سر ، لاتا ہوں ابھی ،،

،، مل جائے سہی ہماری مشکل آسان ہوجائے گی ۔ بڑے اچھے آدمی ہیں ورنہ کون آرام چھوڑتا ہے اپنا ۔ ایسے موسم میں اتنی رات کو ۔ آپ نے اتنی زحمت فرمائی ہے ۔ آپ کا احسان میں عمر بھر نہیں بھولونگا ۔ اور اگر خدا نے کچھ ہمت دی تو آپکی کچھ خدمت کر سکونگا ۔ میں ہی نہیں سب بچے آپ کو دعا دیں گے ۔ بچوں کی پرورش ماں ہی کا حق ہے ۔ وہی کر سکتی ہے ۔ خدا اسے سلامت رکھے ۔ ،،

حمید صاحب کے آنے تک ڈاکٹر وہاں بیٹھا بیکار سوچتے ہوئے آگ سینکتا رہا ۔ لنگڑاتے ہوئے آدمی کی باتیں ۔ عورت کی چیخیں ۔ اس کی بہن کی سسکیاں اور بچے کی دعائیں سنتا رہا ۔ ،،

،، ابا جان امی کو کہاں — جارہے ہیں ،، ناصر نے اپنے باپ سے پوچھا جب اس کی امی کو گٹھڑی سی بنا کر سیڑھیوں سے نیچے آتارا جارہا تھا ۔

،، کہیں نہیں بیٹے ' تو جا چپکے سے سو جا — '

،، مگر ابا جی آپ — ! ،،

،، میں جو کہہ رہا ہوں تجھے — ! ،،

اسنے تلخی سے جواب دیا ۔ اور بچہ چپکا ہو گیا ۔ اس کی آنکھیں خشک ہوگئیں ۔ چہرہ اداس ہو گیا ۔ اس نے ثانئے بھر کے لئے سانس بھی روک لی اور چپکے سے لحاف میں گھس گیا ۔

مگر جب ڈاکٹر صبح وہاں سے گزر رہا تھا ۔ تو لڑکے کی آنکھیں پھر بھیگی ہوئی تھیں وہاں بہت سے لوگ جمع تھے ۔ وہ ان کے قریب پہنچا تو فالج زدہ آدمی کا اترا ہوا چہرہ ۔ لنگڑاتی ہوئی ٹانگ پر اسکے قریب آیا ۔

،، ڈاکٹر صاحب وہ تو چل بسی ،، اس نے کہا ۔

،، رات ہسپتال پہنچتے ہی — حمید

(باقی صفحہ ۷۴ پر دیکھیں)

سیف الدین سیف

○

تو نہ سمجھے ترا دیوانہ تجھے بھول گیا
تیری الفت کی قسم کھا کے چلا جاؤں گا

تو اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رقصاں ہے
دامنِ شوق کو پھیلا کے چلا جاؤں گا

ایک برسے ہوئے بادل کی طرح گذرا ہوں
موج میں آیا ہوں لہرا کے چلا جاؤں گا

رات کی رات مسافر ہوں تری بستی میں
شب کا تارا ہوں نظر آ کے چلا جاؤں گا

اک نظر دُور سے دیکھوں گا در و بام ترے
دیدۂ شوق کو تڑپا کے چلا جاؤں گا

میں سمجھتا ہوں کہ آنا مرا لاحاصل ہے
حسرتِ دید کو ترسا کے چلا جاؤں گا

انجم رومانی

○

دل کہاں عمر بسر کرنے کو
ہم ہیں اب شام و سحر کرنے کو

تھی کبھی کم نگہی، وہ بھی نہیں
پرسشِ زخمِ جگر کرنے کو

کس قدر خشک ہیں مژگانِ خیال
بوند بھر خوں نہیں تر کرنے کو

تجھے دیکھا تو یہ معلوم ہوا
ایک عالم ہے نظر کرنے کو

آج کی رات یہاں رک جاؤ
کل زمانہ ہے سفر کرنے کو

کوئی حسرت کوئی غم کوئی خیال
کچھ تو ہو عمر بسر کرنے کو

نہ بنی عیب چھپائے انجمؔ
آئے تھے عرضِ ہنر کرنے کو

سیّد رضی ترمذی

○

کیسی انوکھی راہ میں نکلے ملا نہ کوئی رستہ بھی
روتی آنکھ کے رُکے نہ آنسو آپ نے دل سے چاہا بھی

گھر کی ویرانی کیا کم تھی ڈھونڈ رہا ہے صحرا بھی
اب اس دل کو کیا کہیے جو آفتِ جاں ہے پیارا بھی

اب دن بھر روتا پھرتا ہے گلیوں میں ہنستے ہیں لوگ
کس نادان کا دل تھا، نہ سمجھا، آپ نے جھاڑا جھڑکا بھی

آنسو پونچھ بھی لے دیوانے ساری محفل برہم ہے
تیرا دُکھ تیرا ہی دُکھ ہے تو نے زمانہ دیکھا بھی

جانے کن جلتی جلتی راہوں سے راہی آتے ہیں
ہائے کیا شے بن جاتا ہے اک دیوار کا سایہ بھی

رُت بدلی، وہ پھول جلے اب بادوں میں انگارے ہیں
رُت بدلی تھی، گلشن بنتے دیکھا تھا اک صحرا بھی

عبداللہ بن عارف

جگ کی شوبھا جگ کا بل
تیرا آنچل میرا ہل

پھول کھلیں کلیاں چٹکیں
پُروائی کی صورت چل

ساتھ دیا ہے اور نہ دیں
ڈھلتے سورج بجھتے کنول

دھیر بندھا، رستہ دکھلا
دیپک بن کر پگ پگ جل

دل ہے وقت کی قید سے دور
اس نگری میں آج نہ کل

عارف تیری دھن بلوان
وقت زمانہ سب نربل

اصغر سلیم

حسن سے بھی نباہ کرنا کیا
عمر بھر آہ آہ کرنا کیا

دیر ہو یا حرم ہو جو کچھ ہو
اپنی دنیا سیاہ کرنا کیا

لاکھ مائل سہی وہ برقِ نظر
خرمنِ غم تباہ کرنا کیا

ڈوب کر دیکھ زور دھارے کا
دور سے واہ واہ کرنا کیا

بن پڑے تو لپٹ کے ملتا جا
غائبانہ گناہ کرنا کیا

مار رکھنے کا اور ہے جادو
ڈرتے ڈرتے نگاہ کرنا کیا

او مقدر کو جھیلنے والے
آ پڑے تو پناہ کرنا کیا

آنکھ ملتے ہی جو پگھل جائے
دل میں ایسے کے راہ کرنا کیا

ٹھن گئی ہے اگر بتوں سے سلیم
برہمن کو گواہ کرنا کیا

ناصر کاظمی

○

تنہا عیش کے خواب نہ بُن
کبھی ہماری بات بھی سُن

تھوڑا غم بھی اُٹھا پیارے
پھول چُنے ہیں تنکا بھی چُن

سُکھ کی نیندیں سونے والے
محرومی کے راگ بھی سُن

یوں آتی ہے تیری یاد
جیسے ایک سُریلی دُھن

جیسے چاند کی ٹھنڈی لَو
جیسے کرنوں کی گُن مُن

جیسے جل پریوں کا ناچ
جیسے پائل کی جھُن جھُن

آرٹ

عبدالرحمٰن چغتائی

از — ناصر کاظمی

ایشیائی مصوروں میں چغتائی کا فن سب سے نرالا اور منفرد ہے۔ وہ آرٹ کی دنیا میں ایک ایسا مضبوط ستون ہے جسکے سہارے ایک عظیم الشان روایت کی عمارت کھڑی ہے۔ اس کے مانوس خطوط کی موسیقی اور تغزل اُسکے دل آویز، رنگوں کی جمالی کیفیت، عورتوں کا طبعی سبک پن، لباس کی تزئین و ترتیب، ساسانی عمارات کا پس منظر اور مشرق کی تہذیب و تمدن، اُس کی تصاویر میں ہر اہلِ فہم کو دعوتِ فکر و نظر دیتی ہے۔

چغتائی نے ملکوں ملکوں کی سیر کی، شہر شہر کے میلے دیکھے، موسم موسم کے میوے چکھے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا اور دو دفعہ یورپ کا سفر کیا۔ لندن، پیرس، برسیلز، ہالینڈ، اٹلی، رومانیہ، وینس، فلورنس، وی آنا، برلن، اور سوئٹزر لینڈ اور دنیا کے دوسرے بڑے بڑے شہروں کے آرٹسٹوں سے ملاقات کی اور وہاں کے آرٹ کا گہرا مطالعہ کیا۔ دنیا کی نمائشوں میں اُسکی تصاویر رکھی گئیں اور موجود ہیں۔ اس کے فن کی مرکزی وحدت، اجنبیت اور انفرادیت اُسے دنیا کی آرٹ گیلریوں میں ہمیشہ جگہ دیگی۔ جو لوگ اُسے جدید فنی رجحانات سے ناآشنا سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اس کی انفرادیت اور مشرقیت ہی نے اُسے دوسرے ممالک میں ممتاز کیا۔ چغتائی نے ہمارے ملک میں آرٹ کا آغاز اُس وقت کیا۔ جب مسلمانوں کی تہذیب مر چکی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ ایسے نازک دور میں اُسنے مسلمانوں کی تہذیب کو زندہ کیا۔ اور اُنہیں اُن کی عظیم الشان روایت کا احساس دلایا۔

چغتائی کے متعلق یہ عام شکایت ہے۔ کہ اُسکی تصاویر میں چین اور جاپان کی گلکاریاں، ہرزین مجم کے رنگ اور ایلورہ اجنتا کے جسم اور یونان کا احساسِ جمال جھلکتا ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اُس نے کسی فن کار کی براہِ راست نقل نہیں کی۔ بلکہ دنیا کے عظیم فن کی روایت اور عظمت کو محسوس کر کے ایک منفرد انداز پیدا کیا ہے۔ اور مشرقی ممالک میں تو اُس نے اپنے معاصرین اور آئندہ آنیوالی نسلوں کیلئے فن کا ایک کلاسیکل ماڈل قائم کیا ہے۔ کسی ملک اور کسی تہذیب سے اثر قبول کرنا عیب نہیں۔ بشرطیکہ وہ اُسکی بھونڈی نقالی نہ ہو۔ انگلستان کے مایہ ناز شاعر جان کیٹس (JOHN, KEATS) ہی کو لیجئے اُسکی شاعری میں یونان اور اٹلی کی تہذیب کے نشانات ملتے ہیں۔ لیکن اُسکا اسلوب اور احساس اپنا ہے۔ اسی طرح گوئٹے اور دوسرے جرمن شاعر عرب اور ایران سے بے حد متاثر ہیں۔ کارلائل اور خلیل جبران قرآنِ کریم کی زبان اور انداز پر فریفتہ ہیں۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے مغل آرٹ کے بعض ماہرین پکّے ہندو تھے۔ لیکن اُنکا فن مسلمانوں کی تہذیب کا عکاس ہے۔ ہمارا اقبال جو دنیا کے بڑے شاعروں اور مفکرین میں سے ہے۔ شیخ سعدی، مولانا روم اور بالخصوص جرمن شعراء اور فلاسفروں سے متاثر ہے۔ لیکن اُسکا انداز اور اسلوب سب سے نرالا اور منفرد ہے۔ اردو زبان کے بیشتر جدید شعراء



عمل چغتائی (اچنگ) Etching

مغربی ادب اور مغربی رجحانات سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اُنکی تکنیک اور (APPROACH) خالص مغربی ہے ہمارے جدید شاعروں اور فنکاروں نے مغربی زاویۂ نظر اور اندازِ فکر پر اپنے فن کی عمارت کھڑی کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چند فن کاروں کو چھوڑ کر اگر ہمارے جدید فنکاروں کی تحریروں اور تصویروں کو مغربی ممالک میں بھیجا جائے۔ تو وہ پاکستان یا کسی مشرقی ملک کی صحیح نمائندگی نہ کر سکیں گی۔

چغتائی نے اپنے فن کو تجارتی رُوپ میں نہیں ڈھالا۔ اور نہ ہی اُس نے فن برائے فن یا فن برائے زندگی کے پیل کے تحت اپنے فن کی پرورش کی۔ اُس نے اپنی ہر تصویر پر ایک جفاکش مزدور کی طرح خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اُس کے ہر نقش میں مشرق کی زندہ روایت دھڑکتی ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر مسلمانوں کا فن کار ہے۔ اور اُسے اپنے مشرقی ہونے پر ناز ہے۔

یہاں میں چغتائی کی ایک جدید ترین تکنیک کا ذکر کرونگا۔ جو براہِ راست مغربی ممالک سے آئی ہے اُس تکنیک کو فنی اصطلاح میں ایچنگ (ETCHING) کہتے ہیں۔ جسکی معنی کندہ کی ہوئی نقاشی یا (GROOVE DRAWING) ہے۔ لکڑی اور بالخصوص دھات پر نقش کندہ کرنے کو ایچنگ کہتے ہیں۔ یہ تکنیک کاغذ اور شیشے کی پینٹنگ سے کہیں زیادہ مشکل اور پائیدار ہے۔ سخت اور تیز آلات کے ذریعے دھات پر ڈرائنگ کرنیکا فن ہندوستان میں یورپ سے آیا ہے۔ پاکستان میں اس تکنیک کو چغتائی کے سوا کسی نے نہیں اپنایا۔ اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔

اطالوی زبان میں کندہ کاری یا ایچنگ کو (INTAGLIO) کہتے ہیں۔ اس کی تکنیک دوسرے فنی اسالیب سے کہیں زیادہ محنت طلب، صبر آزما اور دقیق ہے۔ جو موضوع یا (THEME) یا ..... مرکزی خیال کی آدائیگی کے رستے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ سخت دھات پر مصوری اور فنی کمال دکھانا ایک غیر معمولی ماہر فن کا کام ہے مرکزی خیال، اور کیفیاتی تاثر (TONAL EFFECT) کو اسیر کرنے میں دھات کی سختی مزاحمت کرتی ہے۔ دھات پر جو خط ایک دفعہ کھینچ دیا جائے۔ وہ بڑی یا کسی چیز سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہر موضوع ہر صنف اور ہر (MEDIUM) کی ایک اپنی زبان ہے۔ اور فن کار سے ایک الگ طریقۂ کار کا تقاضا کرتی ہے۔ جس فنکار کی روح اپنے موضوع کی پکار کو سنتی

ہے۔ ایچنگ کی ہر لائن مکمل، واضح اور صاف روشن (VIVID) ہوتی ہے۔ اس میں فن کارانہ ابہام (vagueness) (ARTISTIC) کی گنجائش بہت کم ہے۔ لہذا وہی فنکار اس تکنیک سے فائدہ اٹھانیکی جراءت کرسکتا ہے۔ جو فن کی ایک ترقی یافتہ منزل اور خاص مقام نظر پر پہنچ چکا ہو۔ اور اسی لئے ایچنگ کے موضوعات کی کیفیاتی خصوصیت (TONALQUALITY) خطوط اور جسموں کی لجاجت مدوّنی کیفیات کا عکس، خیال کی مرکزی وحدت اور جذباتی شدت کا نیا اظہار اسوقت تک ممکن نہیں جب تک فنکار اپنے فن کے موضوع سے براہِ راست تاثر نہ لے۔ اور اس تکنیک پر پورا عبور نہ رکھتا ہو

ہر عظیم فنی تکنیک کیطرح ایچنگ بھی روایت کی پابند نہیں۔ صرف انفرادی طریقۂ کار ہی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ ایچنگ کے بعض مخصوص انداز اور اس کی روایت سے بغاوت کرنا ہر فن کار کے بس کا کام نہیں۔ فنکار اس تکنیک

کی تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں کے باوجود مسلسل تگ و دو۔ انفرادی تجربوں اور فنکارانہ قوتِ احساس کے ذریعے مرئی خطوط تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ موضوع کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے

ایچنگ کیلئے خاص آلات اور ساز و سامان کی ضرورت ہے جسکی تفصیلات یہ ہیں۔ (۱) دھات کی پلیٹ (METAL PLATE) (۲) تیزاب کو برداشت کرنیوالی سطح۔ (۳) ایک نوکیلا اور تیز دھار والا قلم جو دھات کی سطح کو آسانی سے تراش دے (۴) ایک خاص قسم کا تیزاب (A MORDANT) ایچنگ کیلئے پیتل یا جست کی پلیٹ بہت ضروری ہے۔ بعض جدید ماہر فن لوہے اور تانبے کی پلیٹ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ سیاہی ایک خاص قسم کا کاغذ اور ایک چھاپہ خانہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ چھاپہ خانے کے بغیر کندہ کی ہوئی تصویر کو کاغذ پر لانا ناممکن ہے۔ چغتائی کے پاس ایک ہینڈ پریس ہے۔ جو سارے دن کی سخت محنت کے بعد ۲۵ یا ۳۰ پرنٹ نکال سکتی ہے۔ پریس کے علاوہ ایک خاص قسم کا کاغذ بھی لازمی ہے۔ جو مدت مدید تک خراب نہ ہو سکے۔ یہ کاغذ تصویر کی پائیداری اور موثر پیشکش کا ضامن ہے ایچنگ کی پلیٹ کو کندہ کرنیکے بعد تیزاب سے صاف کیا جاتا ہے۔ اور پھر اسے پریس کے ذریعے کاغذ پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو انگریزی میں (DABBING) کہتے ہیں۔ یہ کاغذ عام طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔
(۱) شہتوت کے پتوں یا چھال کا بنا ہوا ملائم کاغذ (Paste Fibre of Mulberry Tree) (۲) جاپانی کاغذ (Japanese paper) ایچنگ کی تکنیک ایک مدت کے انفرادی تجربوں سے آج اس مقام پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں اسکا مقابلہ دوسرے اسالیب فن سے کیا جا سکتا ہے۔ فنی موضوعات کے بہت سے پیچیدہ اور ناقابلِ فہم عناصر اس تکنیک کے ذریعے آسانی سے نبھائے جا چکے ہیں۔ جو تاثرات کے باطنی حسن کو بے نقاب کرتے ہیں۔

پاکستان میں چغتائی نے بھی ایچنگ کی تکنیک کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنایا ہے۔ اور مغربی طریقہ کار کو اپنے انفرادی انداز میں نبھایا ہے۔ یہاں میں چغتائی کی ایک کندہ کی ہوئی تصویر کا ذکر کروں گا۔ جو اس مضمون کے بعد آرٹ پیپر پر آپ کو دعوت نظر دے رہی ہے (دیکھیں صفحہ ۴۶ کے بعد) یہ تصویر ایک پیتل کی پلیٹ پر کندہ کی گئی ہے۔ اور بعد میں مومیائی کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ اس تصویر کو مکمل کرنے میں فن کار کو جن صبر آزما مراحل و دقتوں سے گذرنا پڑا ہے۔ وہ اس تصویر کے مہین خطوط اور گہرے تاثر سے ظاہر ہے۔ ہر تصویر کی خاموشی ہمیں کچھ کہتی ہے۔ اس تصویر میں دو چیزیں ہمیں اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ ایک تو مغل دور کی محراب اور دوسری ایک پیکر جو ایک طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ اور اپنی درسگاہ کی محراب کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے جسم کا انداز ایک اندرونی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔ اور محراب کے اندر کی روشن سطح مشرق کے علم اور ذہنی سلجھاؤ کی عکاس ہے۔ سفید اور سیاہ رنگوں کا تضاد فہم و ادراک اور ایک اجنبی احساس کا آئینہ دار ہے۔ اس تصویر کے باریک اور گہرے نقوش میں موضوع کی توانائی اور ہمہ گیری سمٹ آئی ہے۔ فن کار نے اس دقیق ترین تکنیک کے باوجود بعض اندرونی کیفیات اور مشاہدات کے اظہار کو ممکن بنا دیا ہے۔



صوفی عبدالجبار

ونسنٹ وان گاگ



وان گاگ کا خود ساختہ پورٹریٹ جسے زونی نے نقل کیا

ونسنٹ وان گاگ کی زندگی اور اس کا آرٹ دونوں دنیا کے لئے تعجب کا باعث ہیں۔ دونوں اپنی نوعیت کے آپ مالک ہیں اور اس قدر عجیب اور نرالے ہیں کہ انکی مثال آرٹ کی دنیا میں دوسری نہیں ملتی

آخری دم تک وان گاگ کی زندگی جذبات کے بے پناہ طوفان سے پر رہی اور وہ ایک نیم پاگل کی طرح زندگی کے مختلف سنگ ریزوں کو اٹھا اٹھاکر پرکھتا رہا۔ حقیقتاً اس کو ان سنگ ریزوں میں ایک غیر فانی شفاف اور مظہر جمال صداقت کی جستجو تھی جن کے آئینہ میں اس کی زخار وسیع اور متلاطم زندگی اپنا عکس دیکھ سکتی اور تسکین پا سکتی۔

زندگی جس قدر مضطرب ہے اسی قدر اس کو تسکین کی بھی ضرورت ہے۔ وان گاگ جیسی فطرت کو معمولی اور مختصر باتوں میں تسکین تو کیا نصیب ہوتی بلکہ وہ اور مضطرب ہو جاتی اور اس کی زندگی کی رفتار اور تیز ہو جاتی - وہ ہر ہر لمحہ حیات کو چٹکیوں میں پکڑتا اور اس کے مشام کو نچوڑتا چل رہا تھا - وہ اس میں سر تا پا غرق رہا اس طرح کہ صحیح معنوں میں اسے دنیا کی خبر نہیں رہ گئی تھی اسے دن رات بھوک اور پیاس - آرام و تکلیف - سردی اور گرمی - دوستی و دشمنی - محبت و نفرت غرضیکہ کسی بات کا ہوش نہیں تھا - اگر اسے ہوش تھا تو اپنی دھن کا - اگر وہ دیکھ سکتا تھا تو ان چیزوں کو جن کا تعلق اس کے جنون سے تھا اور یہی وجہ ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہوا وہ آب مقطر کی طرح شفاف اور آلائش سے پاک ہے - اس میں کندن کی سی دمک اور ہیرے جیسا وزن اور خیرہ کن چمک ہے - اس میں اس کی خونچکاں - مضطرب اور پر سوز زندگی کا گہرا عکس ہے اس میں اس کی صداقت - نیک نیتی اور اپنے فن سے گہرا خلوص پوشیدہ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے فطرت میں کتنا دخل تھا - وہ انسان کی دکھ بھری زندگی کا کتنا بڑا رازدان اور نباض ہے اور اس کی زندگی میں کتنے خون آلودہ دل تڑپ رہے ہیں - اس نے ایک خط میں خود کہا ہے کہ میں انسان.........انسان اور صرف انسان کی زندگی کے مرقعوں میں رنگ آمیزی کرنا چاہتا ہوں -

وہ انسان اور کائنات کی زندگی میں ڈوب گیا تھا اسے ایک اصول ایک انتظام ایک ربط اور حسن کی تلاش تھی - انسانی تہذیب میں اسے خودغرضی بے ربطی تصنع اور فریب نظر آیا - عام انسانوں کی زندگی درد و غم سے لبریز دکھائی دی - ایک طرف سے تو وہ بیزار تھا اور دوسری طرف کا روح فرسا منظر اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہا تھا اور اس کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا - یہ ضرور تھا کہ وہ انسان کے دکھوں کو بٹانے کا دل سے خواہشمند تھا اور اس کے لئے اس سے جو کچھ بھی جس طرح بن سکا زندگی بھر کرتا رہا لیکن اس کا حاصل ہی کیا تھا - اسے اس ذہنی اذیت سے کبھی نجات نہیں مل سکی' رہی فطرت تو وہ تصنع سے پاک سادہ معصوم اور حسین تھی جس کی طرف وہ اپنی زندگی کے پورے طوفان سے جھک پڑا - اس میں اسے زندگی کے وہی ابلتے ہوئے چشمے نظر آئے جن کا وہ خود سرمایہ دار تھا - سورج ہر صبح دنیا کو زندگی کا پیغام دیتا ہوا آتا' درخت کھیت پہاڑ دریا غرضکہ ساری کائنات اس چشمہ حیات میں غرق ہو جاتی اور اس کے ساتھ وہ خود بھی اسی جیتی جاگتی زندگی میں غرق ہو جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے آرٹ میں وہی زندگی ہے جو تصویر کے موضوع میں بذات خود موجود ہے - اس کے انسان درخت پھل تالاب بادل ہوائیں' اور وہ تمام چیزیں جن کی اس نے منظرکشی کی ہے' معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تمام حیات کے ساتھ اس کے کینوس پر ایک دائمی بقا کی خاطر آن پڑی ہیں - اسی خصوصیت کو حاصل کرنے کے لئے اس نے مصوری کے تمام اصولوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اس کی طبیعت [illegible] بھی کائنات کی اس روح کو پالینے [illegible] بیتاب تھی جو اس میں خود موجود نہیں - ہر آرٹسٹ یہی تمنا کرتا ہے لیکن ہر آرٹسٹ میں ولولہ اور خواہش کا وہ [illegible] نہیں ہوتا جو وان گاگ میں تھا' اور [illegible] یہی وجہ ہے کہ وان گاگ ہی ایسا فن کار [illegible] ہے جو فن کی اس صنعت میں سب سے [illegible] ممتاز ہے

ونسنٹ وان گاگ (١٨٣٠ء ١٨٩٠ء) ہالینڈ میں پیدا ہوا اسے بہت دیر میں اپنی زندگی [illegible]

صحیح مصرف کا پتہ چلا اورجب اسنے مصوری کی ابتدا کی تو اس کی عمر تقریبا ۳۰ سال کی ہو چکی تھی - اس کی مختصر زندگی رومان اور درد سے پر ہے

اس کا باپ مارٹن لوتھر کے پیراکاروں میں تھا اور پادری تھا - وان گاگ کی پرورش اسی مذھبی فضا میں ہوئی تھی - اس کے ذہن میں مذھب کی صداقت اور خلوص کا گہرا اثر تھا اور جب اس نے اپنی روزی کمانے کے لئے ایک تصویر فروش کی دوکان پر ملازمت کی تو جلد ھی نکال دیا گیا - وہ خریداروں کو انجیل کے احکامات ہدایت پرجوش لہجہ میں سنایا کرتا اور انہیں ان تصویروں کی خریداری سے باز رکھنے کی کوشش کرتا جو اس کی نظر میں گھٹیا اور حقیر ہوتیں

اسی زمانہ میں اسے مالکہ مکان کی لڑکی ارسلا سے عشق ہوگیا - ارسلا امرت کافی مانوس تھی - وان گاگ کو خیال تھا کہ ارسلا اس کی محبت کا جواب محبت سے دےگی - لیکن جب ایک روز جدائی سے قبل اس نے ارسلا کا فورشوق میں بوسہ لے لیا تو وہ خفا ہوگئی اور اس نے وان گاگ سے بولنا چھوڑ دیا - اس واقعہ کا وان کے دل پر بہت اثر ہوا -

کچھ عرصہ بعد وہ انگلستان میں معلم ہوگیا - اس زمانہ میں جو طریقہ تعلیم رائج تھا وہ اس کی فطرت اور طبیعت کے قطعی منافی تھا - اس میں اسے ایک گندے اور خود غرض نظام کی ساری خرابیاں نظر آئیں اور وہ ہزار ھی دسمبر ۱۸۷۷ء میں امیسٹمر ڈیم Amsterdam واپس آگیا اور پادری بننے کی خواہش ظاہر کی جو پوری ہوگئی لیکن مذھبی سکول کی خشک فضا میں اسے بے چینی ہونے لگی لہذا وہ بلجیم کے کوئلہ کی کانوں کے علاقہ بوریناج میں مذھبی درس و تدریس کی خاطر چلا گیا - یہاں مزدوروں کی زبوں حالی دیکھ کر اسے ان سے گہری ہمدردی پیدا ہوگئی جس کی بنا پر ان کے حکام سے جھگڑا ہوگیا -

یہاں پر اسے اس بات کا احساس ہوا کہ ایک غیر ستماری معاشی نظام کی خرابیوں کو مذھب دور نہیں کرسکتا - خدا کا عقیدہ انسان کے پیٹ کو نہیں بھرسکتا - اور نہ ھی ان کے ننگے جسم کو سردی سے بچا سکتا ہے - استعماری نظام میں انسان کی بے بسی اور کس مپرسی کا نہ صرف احساس ھی نہیں بلکہ علم بھی ہوا - بے شمار لوگوں کی بے شمار تکلیفیں ھیں جن کا اُن کے پاس کوئی علاج نہیں ھے لیکن اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے انتہائی فراخ دلی اور ایک لاپرواہ سخاوت کے جذبہ سے مغلوب ہوکر مزدوروں کو دے ڈالا اور خود عسرت اور فاقہ میں بسر کرنے لگا - یہاں پر اس نے اپنے جذبات کی شدت اور ذھنی تکلیف سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان فاقہ زدہ انسانوں کی تصویریں بنانی شروع کیں اس کے بعد آرٹ نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا - ہرچند اسے آرٹ سے روزی کمانے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اس کے چھوٹے بھائی تھیو (Theo) نے اس کی کفالت کی اور اسے استقلال سے کام کرنے کی ہمت دلائی -

اسی زمانہ میں سردی کی شدت - فاقہ اور ذھنی تکلیف کی بنا پر وہ بیمار پڑگیا - چھوٹے بھائی نے اسے کسی طرح بھی اس حال میں چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے گھر واپس لے آیا -

یہاں پر اس کے دن رات آرٹ کے مشاغل میں گزرتے تھے - وہ کھیتوں میں تالابوں کے کنارے درختوں کے پاس بیٹھا مناظر اور انہیں مناظر میں بہنے

تصویریں بنایا کرتا - قدرت آہستہ آہستہ اس کے سامنے بے نقاب ہورہی تھی - خد و خال میں انسانی کردار واضح ہوتا جارہا تھا - اور ساتھ ہی ساتھ اس کا جذبہ بھی فزوں تر ہوتا جارہا تھا -

اسی زمانے میں اس کی رشتہ کی بہن کے (Kay) اس کے گھر آکر مہمان ہو گئی - اور وان کے مشغلہ میں کافی دلچسپی لینے لگی گھر کے باہر مناظر کشی میں دونوں کا کافی ساتھ رہتا - وان کے دل میں اس کے لئے گہری محبت پیدا ہوگئی - اور اس کی جانب ایک ایسے جذبہ کے ماتحت کھنچ اٹھا جس میں جنون کا شائبہ بھی شامل تھا

اور کے (Kay) کو حاصل کرنے کی خواہش میں ایسی شدت پیدا ہوئی کہ اس نے ایک روز اس سے شادی کرنے کا مطالبہ ایسے وقت میں کیا جب "کے" (Kay) کے والدین بھی موجود تھے وان گاگ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی اور وہ بیوی کا بار کسی طرح نہیں اٹھا سکتا تھا - لہذا اس کے والدین نے جواب نفی میں دیا - وان گاگ نے اپنا ہاتھ جلتی ہوئی شمع کی لو پر رکھ دیا اور کہا "یہ ہاتھ اسی طرح جل جائے گا اگر "کے" کے ساتھ شادی کی اجازت نہیں دی گئی" لوگ اس منظر کو حیرت اور خوف سے دیکھتے رہے اور شمع کی لو پر ہاتھ جلتا رہا - یہاں تک کہ گوشت کے جلنے کی بدبو تمام کمرے میں پھیل گئی "کے" (Kay) کے باپ نے گھبرا کر شمع کی لو پر ہاتھ مار دیا اور وہ بجھ گئی - غرضکہ (Kay) اسے نہیں ملی لیکن اس کی زندگی کے سوز میں ایک اور غم چھوڑ گئی -

کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی تھیو (Theo) کے پاس پیرس چلا گیا اسی زمانے میں Post Impressionism کے نظریے سے آرٹسٹوں کے ذہن متاثر ہوچکے تھے لیکن اس کی واضح تشکیل نہیں ہو سکتی تھی -

واقعیت نگاری سے بعد کے نئے ذہن گھبرا چکے تھے - یہ ایسا میدان تھا جس کے تمام نازک شعبوں پر آرٹسٹ کامیابی کے ساتھ موشگافیاں کر چکے تھے - ادھر کیمرے کی ایجاد نے واقعیت نگاری کی اہمیت اور بھی کم کردی تھی - ذہن نئی جولان گاہ چاہتا تھا - ادھر سائنس کے تجربات نے رنگ اور سادہ کی نئی قدریں پیدا کردیں تھیں جن کی بنا پر نئی "جولا نگاہ" کے خاکے واضح طریقہ سے مصوروں کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے تھے تولولاٹریک جارجیس - سیورٹ - گوگاں - مونے وغیرہ اس نئی جولاں گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھے، وہ کسی نہ کسی طرح اپنے تخیلات اور نظریات کے مطابق اپنے آرٹ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے -

ابتدائی دور ان ہستیوں پر ذہنی اور جسمانی اعتبار سے انتہائی سخت اور صبر آزما گزرا - کیونکہ ان کی کاوشوں سے جو نتیجہ بر آمد ہوا وہ دنیا کے لئے بالکل نیا تھا - انکی نظریں مایوس نہیں تھیں - اس واسطے ابتدا میں لوگوں کی مشکوک نظریں پڑیں کہ آیا یہ اپنے اصناف کے لحاظ سے آرٹ ہے بھی یا محض فضول ہے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گروہ مالی اعتبار سے زیادہ پھول پھل نہیں سکا - اور اس کی ذہنی پریشانیاں ایک طرح کا روگ بن کر رہ گئیں ان میں سے کچھ بیزار ہوکر اور کچھ نے گھبرا کر اپنی اپنی پناہ گاہیں تلاش کیں جہاں تخیلات اور ماحول میں کافی ہم آہنگی تھی - اور کسی قدر ذہنی سکون

بھی تھا۔ ایک طرح سے یہ لوگ تارک الدنیا ہو رہے تھے لیکن انھوں نے بھی آرٹ کی نئی قدروں پر تجربات کئیے اور ان پر عبور حاصل کیا ابتدا میں وان گاگ وبلٹ سے متاثر ہوا - اور جب وہ دیہات سے پیرس آیا تو اس پر بسارو (Pissaro) اور سیورا Seorat کا اثر پڑا - وہ بھی -New Impre) ssionism نیو امپریشنزم تحریک سے متفق ہوگیا - یہ لوگ رنگوں کو بغیر ملائیے ہوئیے باقاعدہ علیحدہ استعمال کرتے - سیوار رنگوں کے نکتوں کے ذریعہ پوری تصویر بناتا اور سپارو مختلف رنگوں کے دھبوں کو اس طرح ترتیب دیتا کہ پوری تصویر تیار ہو جاتی یہ طریقہ کلاسکی مصوری سے قطعی مختلف تھا - وان گاگ پر ان مصورں کا اثر ضرور پڑا لیکن رنگوں کے استعمال میں اس نے اپنی انفرادیت قائم رکھی - نقطوں اور دھبوں کی بجائے اس نے خطوط کے ذریعہ اپنی پوری تصویر کی تعمیر شروع کی - یہ خطوط ایک غیر معمولی اعصابی قوت اور جوش کے ماتحت کینوس پر نمودار ہوتے اور اس قدر جان دار ہوتے کہ ان کو "بل کھاتے ہوئیے سانپوں" سے تشبیہ دی گئی ہے - اس کی اپنی تصویر جس میں اس کے چہرہ پر داڑھی اور سر پر دیہاتی ٹوپی ہے اور جو اس نے (Impressionism) کے اصولوں کو پا لینے کے بعد بنائی ہے اس کے کردار کا پتہ دیتی ہے - وان گاگ نے کوئی نئی تکنیک نہیں ایجاد کی لیکن اس نے جلد ہی اپنی ایک ذاتی طرز پیدا کرلی جو اپنی اسی قوت کے لحاظ سے غیر معمولی ہے جس کے زیر اثر اس کے آرٹ کی تعمیر ہو رہی تھی -

وان گاگ تمام مصورں میں سب سے زیادہ پرجوش واقع ہوا ہے - اس کا کائنات کا مشاہدہ نہایت واضح اور ٹھوس ہے جو اسے ایک مافوق البشری کیفیت کے ماتحت حاصل ہوا ہے اس طرح کہ اندھیری رات میں بجلی چمک جائیے اور تاریکی میں چھپی ہوئی چیزیں نگاہوں کے سامنے آجائیں -

باوجود اس کے کہ وہ پسارو اور سیورا سے متاثر تھا لیکن اس کا اپنا مسئلہ ان سبھوں سے مختلف تھا- لہذا وہ بہت جلد پیرس کی صحبتوں سے گھبرا گیا - اور خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا - یوں بھی پیرس کی زندگی اسے پسند نہیں تھی وہاں پر ان عناصر کی کمی تھی جن کا مطالبہ اس کی طبیعت کررہی تھی - وہاں کا بھورا آسمان اور آفتاب کی شعاعوں میں حرارت کی کمی اس کی مصورانہ فطرت کو اپنی جانب رجوع نہ کرسکی - اسے ایسے خطۂ خاک کی ضرورت تھی جہاں سورج کی گرم گرم شعاعیں کائنات کو پوری زندگی دے رہی ہوں جہاں گہرے اور شوخ رنگ کی فراوانی ہو اس کا عقیدہ تھا کہ پہلا رنگ جس کا منبع براہ راست آفتاب ہے کائنات میں زندگی سموتا ہے - زرد ہی رنگ سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے لہذا وہ آفتاب کی حرارت میں نکھرے ہوئیے شفاف زرد اور دوسرے رنگوں کی جستجو میں جنوبی فرانس میں بمقام Arles چلا آیا یہاں پر اس نے خود کو تمازت آفتاب کے حوالہ کردیا - وہ کھلی ہوئی جگہوں پر بغیر ٹوپی لئیے ہوئیے تمام دن تصویریں بنایا کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے سر کے بال تک جھلس گئیے - لوگوں کو اس کے ذہنی توازن پر شبہ ہونے لگا - لوگ اس کے متعلق خیال آرائیاں کرنے کہ اسی دوران میں ایک واقع نے ان کے شبہ کو یقین میں تبدیل کردیا -

جس ہوٹل میں وہ کھانا کھایا کرتا تھا وہاں کی ایک نوجوان ملازمہ نے جس میں وہ

دلچسپی لینے لگا تھا ایک روز کہا " اگر تم مجھے کچھ اور نہیں دے سکتے تو اپنا کان ہی دے دو مجھے بہت پسند ہے " بڑے دنوں سے کچھ روز قبل اس نے اپنا کان کاٹ کر پارسل بنایا اور ہوٹل کی ملازمہ کو بطور تحفہ پیش کردیا - وہ اس عجیب تحفہ کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئی - وان گاگ جسم سے بہت سا خون نکل جانے کی وجہ سے سخت بخار میں مبتلا ہوگیا - اور مہینوں بستر پر پڑا رہا - اسی حالت میں وہ پاگل خانہ پہنچا دیا گیا - جہاں اس کے ذہن اور جسم کا خاطر خواہ علاج ہوا -

لیکن اس واقعے نے اس کے تخلیقی ذہن پر کوئی اثر نہیں کیا - اس کی اپنی ذاتی تصویر جو اس نے اس واقعے کے بعد بنائی ہے جس میں وہ ٹوپی پہنے ہوئے ہے اور منہ میں پائپ ہے اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس کے ہاتھ کی قوت اور مشاقی اور نگاہوں میں ضروری اجزا کو روشن اور جامع طریقہ سے دیکھنے کی قوت باقی ہے -

۱۸۸۹ء کی گرمیوں میں اسے صحت ہوگئی اور وہ اپنے بھائی کے پاس پیرس چلا آیا - اس کے بھائی نے اس کی بودو باش کا انتظام ایک دیہات میں ابورس آئس Auyar Siroise ایک ڈاکٹر کے یہاں کیا - یہاں وہ عمدہ صحت کے ساتھ خوش بھی رہتا - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس افسردگی کے خلاف جنگ آزما بھی رہتا جو رہ رہ کر اس کے غیر معمولی ذہن پر چھا جاتی اب تک وہ ایک بے صبری کے عالم میں اپنے دل کی پیاس بجھارہا تھا - وہ اپنی زندگی کے بے پناہ جذبے سے جس کا لازمی نتیجہ اضطراب اور نا آسودگی تھا کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا لیکن اب اس کے ذہن پر تاریک بادل اور گہرے چھاگئے - اسے اپنی زندگی فضول لا حاصل اور بے کار نظر آئی - دنیا اب بھی ویسی ہی تھی - اور یہ ایک ایسی افسردگی اور تاریکی تھی جس کا علاج اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور آخر اس نے گھبرا کر ۲۸ جولائی ۱۸۹۰ء کو پستول کی گولی سے اپنا خاتمہ کر ڈالا -

خودکشی سے قبل جب کہ اس کی زندگی ظلمت میں گھرتی جارہی تھی اس کی تخلیقی قوت اسی طرح جاگتی رہی اس طرح کہ اس کی کچھ تصویریں ایک غیر معمولی وجدانی مشاہدہ کا پتہ دیتی ہیں - اس کی زیادہ تر تصویروں پر ایک شاندار صحت مند دماغ کا پرتو ہے - ہم وان گاگ کی تصویروں میں اس قوت سے متاثر ہوتے ہیں جو سیزاں Cezanne کا بھی حصہ ہے لیکن وان گاگ کے پس پشت صرف اعصابی طاقت ہی نہیں بلکہ ایک گہری اخلاقی زندگی بھی کارفرما ہے -

اس کے رنگوں میں جان ہے - وہ روشن چمکدار اور زندہ ہیں زرد رنگ سے اس نے اشیاء عالم کی زندگی کو بے نقاب کیا ہے اس کی تخلیق میں تزئین کاری Decorative design کا بھی عنصر شامل ہے - لیکن بذات خود انسانی زندگی میں اس گہرائی سے ڈوب چکا ہے کہ تزئین کاری (Decorative design) اس کی بلندی اور عظمت کو نقصان نہیں پہنچا سکتی - اس کی ایک تصویر جیل خانہ Prison Yard سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کس شدت سے آلام و مصائب کا احساس ہے - اس نے کم سے کم جزئیات کے ساتھ قیدیوں کی دردناک زندگی پیش کی ہے - مضمحل اور مصائب کے بوجھ میں دبے ہوئے قیدی اپنے روزمرہ کے غیر دلچسپ چکر پر چل رہے ہیں - قید خانہ کی سنگلاخ

اور بلند دیواریں فرار کے
ناممکنات کا احساس دلاتی
ہیں ۔ حن کے باہر کی
روشن اور زندہ دنیا کبھی
بھی ان بد قسمت انسانوں
کو نصیب نہیں ہوگی اس
تصویر میں جذبات کو دخل
نہیں ہے ۔ صرف وان گاگ
نے حقیقت کو عریاں پیش
دیا ہے ۔

اور حقیقت نگاری ہمیں
اپنے درد و غم کے پورے
جذبہ کے ساتھ یہ
سمجھنے پر مجبور
کرتی ہے کہ قیدی بھی
ہماری جماعت کے
افراد اور ہمارے ہی
بھائی ہیں لیکن
کس قدر مجبور
اور مصیبت زدہ ۔

عبدالمجید بھٹی

ناچ رہا ہے پیار

پیارا پورب اچرج مایا
اپنے ہی نیندوں کی چھایا

اوروں کے جھولں پر ناچے بن کر روپ سنگار
ناچ رہا ہے تیری سندرتا میں میرا پیار

آشاؤں کی بنے کہانی
ٹھنڈی آہیں ' بریت پرانی

پاگل نینا کیسے کیسے کرتے ہیں بیوپار
ناچ رہا ہے تیری سندرتا میں میرا پیار

برہ میں بے کل نیناں برسیں
اپنی ہی جوتی کو ترسیں

ڈوب گیا ہے بھیگی بھیگی پلکوں میں سنسار
ناچ رہا ہے تیری سندرتا میں میرا پیار

جمیل الدین عالی — دوھے

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جیسے مہا کوی بھی بابوجی کہلائے

●

روٹی جس کی بھینی خوشبو بنے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

●

نا کوئی اس سے بھاگ سکے اور نا کوئی اس کو پائے
آپ ہی گھاؤ لگائے سمے اور آپ ہی بھرنے آئے

●

یہ ہر سندر نار کو تکنا یہ جھک جھک پرنام
عالی تو تو بھگت گیانی بھاں ترا کیا کام

●

دیکھیں تو آخر چولی سے کیا چیز یہ ابھری آئے
گوری ہم تو "چنگی بابو" ہم سے کیوں شرمائے

●

پورب کی ابلا دکن کی ابلا اور پنجاب کی نار
عالی اپنے من پر سب کے گہرے گہرے وار

شیخ احمد

چاندنی اور سائے

دیہاتوں میں عموماً (رات کے وقت) جہاں روشنی کا ذریعہ صرف روغنی چراغ ہوتا ہے وہاں محض سفید اشیاء دکھائی دیتی ہیں سیاہ چیزیں جزوی طور پر چمکتی ہیں۔ یا تاریک اور تقریباً پوشیدہ ہی رہتی ہیں کیونکہ چراغ کی روشنی دھیمی ہوتی ہے۔ روشنی کا منبع ذرا کمزور اور پھیکا ہونے کے باعث روشنی سایوں میں جذب ہو کر سایوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ سورج کی روشنی کے مقابلے میں چاند کی روشنی ایک چھوٹی سی مثال ہے اس لئے رات کے رینگتے ہوئے سائے جزوی طور ظاہر ہوتے ہیں۔ چاندنی رات کے منظر کا خواب نما تاثر

دھیمی دھیمی روشنی ہی کے باعث ہے۔ جس میں ایک خاص ٹھنڈک ہوتی ہے۔ چاندنی کا پس منظر ایک ایسے سحر کی خاصیت رکھتا ہے جس سے فضامیں لامحدودیت اور خواب نما کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

ایسے مناظر روح کے لئے کشش رکھتے ہیں۔ نہ کہ مادی دنیا کے لئے۔ روحانی دنیا جذبات اور احساسات کے ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔ احساسات ہمارے شعور کے بسیط و عمیق ترین تجربات ہیں۔ یہ جذبات بچپن ہی سے ہماری زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ رات کے وقت جنہوں نے شاہدرے کے پرانے کھنڈرات کو دیکھا ہے۔ انہیں یاد ہوگا کہ کس طرح چاندنی اور سائے جو کھنڈرات کے مختلف حصوں کو نمایاں اور پنہاں کرتے ہیں۔ ماضی کے دھندلے دھندلے خیالوں کو واپس لانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے مناظر تخیلی جولانیوں کے لئے موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ وہ رنگ جو دن بھر مناظر میں رنگینی پیدا کرتے ہیں۔ رات کو غائب ہوجاتے ہیں۔ زرد رنگ سب سے پہلے چھپتا ہے۔ نارنجی رنگ سرخ رنگ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور زرد رنگ سبز کی طرف۔ جوں جوں رات بڑھتی جاتی ہے اور روشنی مدھم ہوتی جاتی ہے۔ سرخ رنگ سیاہی میں ملتا جاتا ہے۔ پتوں کی سبزی اپنی زردی کھو کر ہلکے سبز



رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ اتنی ہلکی ہو جاتی ہے۔ جیسے اس میں سفیدی مل گئی ہو۔ رات کا پھیلا ہوا رنگ بنفشئی بھورے رنگ (VioletGrey) جیسا ہلکا اور بے نور ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی آنکھ کی خاص بناوٹ کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ دھیمی روشنی میں آنکھیں ہلکا بنفشئی اور ارغوانی تو دیکھ سکتی ہیں لیکن زرد رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔

سایوں کے ڈھلتے ہی وہ چیزیں جو زیادہ نمایاں ہوتی ہیں بنفشئی اور بھورے آسمان کے مقابل اور درخشاں ہوجاتی ہیں۔ دن کے سایوں کے برعکس رات کے سائے ہر زبان میں افسردگی اور آسودگی کے تصورات سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر موت کے سائے جو بڑھاپے کو محیط کرتے ہیں ڈائکنس ہونے کے بجائے بہت ہی گھناؤنے ہوتے ہیں۔ بقول آر۔ روڈر سائے ہماری بصیرت (Vsion) کے راستے میں حائل ہیں اور ذوق جستجو کو پریشان کرتے ہیں ایک سلجھے ہوئے ذہن میں چاندنی رات کی پر چھائیاں وہ تصور پیدا کرتی ہیں جو موت یاتباہی سے ہوتا ہے۔اس طرح سائے کا خوف اور روشنی کی محبت طاقتور نفسیاتی عناصر بن جاتے ہیں۔ اس طرح روشنی جو پرچھائیوں کی حریف ہے۔ ہمارے لئے ایک فرحت انگیز نعمت بن جاتی ہے سائے سے فطری ناپسندیدگی قدرتی طور پر اُس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب ایک فوٹو گرافر اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے تصویر کی سیاہ پرچھائیاں صاف کرکے اس کو خاص طور پر روشن کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے لئے سائے اکثر اوقات مزاحمت کا باعث بن جاتے ہیں ہمارے فوٹو گرافر اور آرٹسٹ اپنے فن کے ذریعے اس امر کی شہادت دیتے ہیں وہ چہرے کی خوبصورت شبیہ بناتے ہیں یا روشن رنگوں کے نقش بناتے ہیں یا منفی عکس کی اصلاح کر کے انہیں صاف کردیتے ہیں عریاں تصویروں میں وہ سایوں کو اسحد تک نظرانداز کردیتے ہیں کہ ان کی تخلیقات وہ تمام محسوسات کھوبیٹھتی ہیں۔ جو ایک خوبصورت پیکر سے وابستہ ہوں۔

تاریکی میں بہت سے جادوٹونے کئے جاتے ہیں۔ بدکردار لوگ پچھلی رات کی مکمل تاریکی میں یاچاندنی رات میں مسان میں جاتے ہیں محبت کے طلسمات کو قوی الاثر بنانے کے لئے انہیں چاندنی رات ہی میں سر انجام دینا چاہئے کیونکہ اس کی خواب نمانضا پراسرار خیالات کی معادن ہے۔ خام ذہن کے لئے جادو ایک حقیقی قوت ہے—————— ایک قوت جوعلم سے زیادہ اثر رکھتی ہے اور یہ قوت چاندنی اور سایوں میں زیادہ کام کرتی ہے۔

مصوری کے کچھ ادارے ایسے ہیں جو سایوں اور جھلکیوں کے قطعی طور پر قائل نہیں۔ مثال کے طور پر چینی اور جاپانی دونوں ملکوں کے قدیم اساتذا ان سے گریز کرتے ہیں۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے ممیز کرنے کے لئے وہ صرف محدود (Local) رنگوں اور خاکوں پر انحصار کرتے ہیں۔ مغربی مصوروں کی طرح وہ سایوں کو چھوڑ کر اپنے فن میں ایک خاص ماحول پیدا کرتے ہیں۔ چینی اور جاپانی مصور تصویر کی سالمیت کو بر قرار رکھنے کے قائل ہیں۔ اور سایوں کو اس کے لئے تباہ کن سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ ایک قدیم چینی مصور کا قول ہے۔ کہ سائے فن میں تخریب پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ان سے احتراز کرنا چاہئے وہ اپنے فن میں پھیلے ہوئے سایوں کو بھی

الگ رکھتے ہیں یورپ میں بھی (Holbein)
ہولبین جیسے آرٹسٹ اپنے مجسموں کے چہروں
میں بہت کم جھلکیاں ظاہر کرتے ہیں۔ ایکی
ملبوس پر کسی قدر ضرور ـــــ ان کا چہرہ
دلچسپ ہونے کی وجہ سے جاذب توجہ ہوتا
ہے۔ اور اس لئے ہولبین کہتا ہے۔ کہ اسے
زیادہ موثر بنانے کے لیے پرچھائیاں بالکل نہیں
ہونی چاہئیں۔ دوسری طرف وانلر کا خیال ہے
کہ فطرت میں کیونکہ اشیاء روشنی اور
سایوں کی وجہ سے نمایاں ہوتی ہیں۔ اس لئے
وہ ایک تخلیقی قوت ہیں۔ اور انہیں نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی کندہ کی ہوئی تصاویر
میں ہمیں ان کی پرچھائیاں اشیاء اور زمین پر
پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جو انہیں ایک
دوسرے سے منسلک کرتی ہیں۔ اب ان کی
چھپی ہوئی صورت کو ملانے کے لئے وہ
سایوں کو کام میں لاتا ہے۔ وہ سایوں کو بیکار
اور پھیکے دھبوں کی طرح نہیں بلکہ تصاویر
کے خوابیدہ نقوش کو اکٹھا کرنے کے لئے
کام میں لاتا ہے۔

سایہ محض روشنی کی عدم موجودگی ہے۔
انسان ازل ہی سے سایوں کو نا پسند کرتا
ہے۔ کیونکہ وہ رات کا تصور دلاتے ہیں۔
اور رات ناپختہ ذہنوں کے لئے مسلسل خوف
کا باعث ہے۔ کسی نہ کسی طرح رات کی
پرچھائیوں میں انسان اپنے دشمنوں، شیطان
روحوں اور شکار کی تلاش میں پھرنے والے
وحشی جانوروں کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔
دن کے وقت بھی جنگل کے گہرے سائے
نفرت انگیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ وحشی
درندوں، سانپوں اور دوسرے خوف ناک
رینگنے والے جانداروں کو پناہ دیتے ہیں۔
ہمارے گھروں میں بھی تاریک کمروں
کے گوشے ان کے کم منور حصوں کی
نسبت زیادہ دہشت ناک ہوتے ہیں۔
کیونکہ تاریکی مانوس چہروں اور چیزوں
کو چھپاتی ہے۔ کسی تاریک کمرے میں
سے گزرتے وقت ہمارے تنے قدرتی
طور پر محتاط اور چوکنے رہتے ہیں کیونکہ
کہ ہمیں گر پڑنے یا کسی چیز سے چوٹ
کھانے کا ڈر ہوتا ہے۔

ڈر کی ایک وجہ تو یہ ہے اور دوسری یہ
کہ تاریکی ہم سے ان آشنا صورتوں کو
چھپا دیتی ہے۔ جنہیں ہم پسند کرتے ہیں
اور محبت کرتے ہیں۔ تاریک کمرے میں
کسی دوسرے کی موجودگی محسوس کرنے
کے لئے لوگ خود بخود باتیں کرنا شروع کر دیتے
ہیں۔ اور تاریکی کا خوف دور ہو جاتا ہے۔
کسی تاریک گلی یا جنگل سے گزرتے وقت
ہم سیٹیاں بجاتے ہیں اور اس طرح محسوس
کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں۔ لیکن
چاندنی رات میں سائے بہت ہلکے نظر آتے ہیں
کیونکہ چاندنی سورج کی نسبت روشنی کا
ایک صغیر منبع ہے۔ اس کے سائے ہلکے
پڑتے ہیں اور قدرتی طور پر بہت تاریک
لیکن سیاہ رنگ کے نہیں سفید دیواروں کی
چاندنی بیک وقت ہمیں ایک سکون اور
شفاف چمک کا احساس دلاتی ہے روشنی کا
ایک جزو ایک ہی منظر میں مختلف تاثرات
پیدا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک
سفید مکان میں سفید اور نیم تاباں آسمان ملگجا
معلوم ہوگا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے
درخشاں حصے اپنی روشنی سے آپ دھندلے
معلوم ہوں گے کہ وہ تقریباً تاریک نظر
آئیں گے۔ اور ان پر آسانی سے سایوں کا
گمان ہونے لگے گا۔

(مصنف کے انگریزی مضمون سے ترجمہ)

جلیل کریم



کوریا کی جنگ کا پس منظر

کوریا کی جنگ کو صحیح زاویے میں دیکھنے کیلئے ہمیں وال سٹریٹ کے مالی ساحروں کی مہرہ‌بازی کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ جنگ کے دوران میں امریکہ کی معیشت پورے عروج پر تھی۔ بیروزگاری کا تقریباً خاتمہ ہوچکا تھا۔ ملک کی تمام پیدائشی قوتیں مجتمع ہوچکی تھیں۔ جنگ کے دھکتے ہوئے شعلے سرمایہ‌داری کے گھٹتے ہوئے حلقوم میں آب حیات بن کر ٹپک رہے تھے۔ مگر جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی امریکہ کو ایک وسیع اور شدید معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے کارخانوں نے، جو جنگی سامان تیار کر رہے تھے، کام بند کردیا۔ مزدور بیکار ہوگئے اور قیمتیں دن بدن گرنی شروع ہوگئیں۔ اجارہ دار اس صورت حال کو کیونکر برداشت کرسکتے تھے۔ اس وقت بحران سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی۔ کم منافعوں کے باوجود صنعت کار اپنی قوت پیدائش کو کم نہ کرتے تو بیروزگاری عام نہ ہوتی۔ عوام کی قوت خرید میں کمی واقع نہ ہوتی اور امریکہ کی صنعتی اشیا کیلئے کم از کم اندرونی مارکیٹ محفوظ رہتی۔ مگر جس نظام کی بنیاد ہی ذاتی منافع پر رکھی گئی ہو۔ وہاں اس قسم کی توقع فضول ہے۔ امریکی اجارہ داران نے صالح طریقۂ عمل کو چھوڑ کر سامراجی حربے استعمال کرنے شروع کئے صنعتی اشیا کی فروخت کے لئے بیرونی مارکیٹوں کی تلاش ہوئی مغربی یورپ کے وہ ملک جن کی معیشت پر جنگ کا اثر تباہ کن ہوا تھا۔ وہ پسماندہ علاقے جو مغربی اقوام کے زیراثر تھے۔ مشرق وسطیٰ۔ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا شمالی اور مشرقی افریقہ۔ ان پر نگاہ انتخاب پڑی۔ موجودہ انقلاب سے پہلے چین بہت وسیع سامراجی منڈی تھی۔ مگر انقلاب کے بعد یہ امکانات بہت حد تک کم ہوگئے۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر امریکہ کے لئے تو چین کی مارکیٹ بالکل ختم ہوگئی۔ اس نقصان کو پورا کرنے کیلئے مسٹر ڈین ایچی‌سن کی طرف سے ایک لائحۂ عمل بنایا گیا۔ صدر امریکہ مسٹر ٹرومین کا پوائنٹ فور پروگرام Point Four Programme اس ضمن میں پہلا قدم تھا۔ کوریا کی جنگ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ٹرومین پروگرام نے نوعیت ایشیا والوں کے لئے اب خالص [illegible] ہوکر رہ گئی ہے۔ مسز پنڈت نے پچھلے دنوں امریکہ میں کہا کہ ٹرومین [illegible] کے لطیفے کو اب ایشیا کے لوگ بھلا چکے ہیں۔ خود امریکی اجارہ‌داروں کی توجہ بھی اب تمام‌تر کوریا کی جنگ پر مرکوز ہوگئی ہے۔ ایشیا کو غالباً امریکی سرمائے کیلئے محفوظ مقام نہیں سمجھاجاتا۔

یورپ میں اسی صنعتی سامراج نے مارشل ایڈ (Marshal Aid) کا حیلہ ڈھونڈا۔ جنگ کے اثرات سے تباہ شدہ ممالک کو مدد

بہانے امریکی منڈیاں بنا لیا گیا۔ خود ان ملکوں کی اندرونی معیشت کو تعمیری سعی سے ہٹا کر جنگی جدوجہد کی طرف منعطف کردیا گیا۔ مارشل ایڈ کی ناکامی کا اعتراف بھی سب سے پہلے سرمایہ دار حلقوں ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ پچھلے دنوں اقوام متحدہ کے ایک معاشی کمیشن نے (جس میں روس اور مشرقی یورپ کے نمائندے شامل نہیں) مغربی یورپ کی اقتصادی حالت کے متعلق ایک رپورٹ پیش کی ہے۔ جس میں 'غیر براہ راست' طریقے سے اس بات کو مانا گیا ہے کہ مارشل ایڈ متوقع نتائج پیدا کرنے میں کامیاب نہیں۔ اس رپورٹ میں امریکہ کو متنبہ بھی کیا گیا ہے کہ جب ۱۹۵۲ء میں مارشل ایڈ ختم ہوجائیگی تو یورپی ممالک کے توازن تجارت کو بر قرار رکھنا ناممکن ہوجائیگا اور ڈالر کا خسارہ دن بدن وسیع ہوتا جائیگا۔ جب بین الاقوامی بینک اور آئی۔ ایم۔ ایف (I. M. F.) کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ اب تجارتی حلقوں کو پچھلی جنگ عظیم کے بعد کی پیدا شدہ مصیبتوں سے نجات مل جائیگی مگر امریکہ کی خود غرضانہ حکمت عملی کی وجہ سے یہ توقع بھی نقش بر آب ثابت ہوئی ہے۔ اور یہ ادارے اب محض امریکہ کے سامراجی منصوبوں کی توسیع کا آلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کو ان اداروں کا رکن بنالیا گیا۔ سرکاری حلقوں میں اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم بھی کیا گیا ہے۔ مگر سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ اوپر بیان کی ہوئی وجہوں کے باعث اس انتظام کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دے رہے۔ پاکستان کو ان اداروں کی رکنیت سے فائدہ ہوگا تو معلوم۔ ہاں یہ قیاس آرائی ضرور کی جارہی ہے کہ آئی۔ ایم۔ ایف پاکستان کو اپنے Non-Devaluation کے فیصلے کو منسوخ کرنے یا اس میں ترمیم کرنے پر مجبور کرے گا۔ پاکستان کے سرکاری حلقوں کی طرف سے اس افواہ کی پرزور تردید کی گئی ہے۔ مگر اس کا کیا کیجئے۔ بہت سی باتیں پرزور تردید کے باوجود بھی ہو جایا کرتی ہیں۔

مارشل ایڈ کے ساتھ ساتھ یورپی منڈیوں پر قابض ہونے کیلئے ایک اور حربہ استعمال کیا گیا۔ یہ یورپین ادائیگی کی سکیم (Euro-pean Payments Union) کی 'اخلاقی' مدد ہے۔ امریکہ متحدہ یورپ کی مارکیٹ پر اندر سے قابو پانا چاہتا ہے۔ متحدہ یورپ کی تحریک بھی اسی کے تسلسلات میں سے ہے۔ یہاں برطانیہ کے سرمایہ دارانہ مفادات امریکی سامراجیوں کی مصلحتوں سے ٹکراتے ہیں۔ اسی باعث پچھلے دنوں ان دو پرانے رفیقوں میں لفظی جنگ آزمائی ہوتی رہی ہے۔ اس وقت تقریباً تمام یورپی ملکوں کا سب سے بڑا مسئلہ ڈالر خسارے کو پورا کرنا ہے۔ اسی خسارے کو پورا کرنے کیلئے اور توازن تجارت کو بر قرار رکھنے کی خاطر یورپ کے پسماندہ ممالک درآمد کے محصولوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر رہے ہیں تاکہ انکی درآمد میں کمی ہو اور برآمد کی تجارت بڑھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات امریکہ کے مفاد کے خلاف ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مغربی یورپ کے ممالک یہ محصول بالکل ہٹادیں یا کم از کم بہت کم کردیں۔ حالانکہ خود امریکہ نے اپنی درآمد کی تجارت پر کڑے محصول عائد کر رکھے ہیں۔

یورپین ادائیگی کی یونین کا سب سے بڑا مقصد بین الاقوامی تجارت پر عائد کردہ محصولوں کو کم کرنا ہے۔ اسکی ابتدا یورپ کی مارکیٹوں کو ایک اکائی میں تبدیل کرنے سے کی جائیگی۔ اگرچہ یہ یونین خود یورپی ممالک کے حق میں نہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح امریکہ اپنی صنعتی اشیا کو یورپی منڈیوں میں بے حد ارزاں فروخت کرسکیگا اور یہ بات مقامی صنعتوں کے حق میں تباہ کن ہوگی۔ دوسرے اسطرح ایک دم تمام پابندیاں ہٹا لینے سے تجارت و صنعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بالخصوص ان ملکوں میں جو صنعتی ترقی کے بالکل ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔ یا جنگ کی تباہیوں کو از سرنو تعمیر کا روپ دے رہے ہیں۔ کئی پسماندہ ملکوں کے لئیے فی الفور یہ پابندیاں ہٹانا ممکن بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ اسطرح انکے توازن تجارت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچے گا۔ مالی ادائیگی کی اس اسکیم نے برطانیہ کو خصوصیت سے پس و پیش میں ڈال دیا ہے۔ مغربی یورپ کی منڈیوں میں برطانیہ امریکہ کا حریف ہے اور کسی صورت بھی ان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یہ برطانیہ کے اقتصادی بحران میں سے نکلنے کیلئے ضروری بھی ہے۔ برطانیہ چاہتا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی تجارت خارجہ میں اضافہ کرسکے تاکہ اسکے بدلے میں وہ اپنی خوراک کی اور دوسرے صنعتی خام مال کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ برطانیہ امریکہ کے ساتھ بھی اپنی تجارت خارجہ میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ڈالر ریزرو (Dollar Reserve) کو مضبوط بناسکے۔ حال ہی میں ایک ترمیم یافتہ یونین کی سکیم کا معاہدہ ہوگیا ہے۔ اس میں برطانوی نقطۂ نظر کو زیر غور لاتے ہوئے اسے خصوصی مراعات دی گئی ہیں سٹرلنگ کی حیثیت اور سٹرلنگ ایریا (Sterling Area) کی خصوصیات کو باقی رکھا گیا ہے۔ برطانیہ بعض محصولوں مثلاً امپیریل پریفرانسز (Imperial Preferences) اور تفاوتی ٹیکسوں سے دست بردار نہیں ہوگا۔ اس صورت میں بھی یہ معاہدہ برطانیہ کیلئے بہت زیادہ قابل قبول نہیں۔ مگر چونکہ اب وہ پوری طرح امریکہ کا دست نگر ہے۔ اسکو قبول کئیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ یورپی مارکیٹ کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہونے کے ساتھ ہی برطانیہ نے اپنی نوآبادیاتی سرگرمیوں کو تیز تر کردیا ہے۔ ملایا اسلئے بھی برطانیہ کیلئے بہت اہم ہے کہ اسمیں بہت تعداد میں ربڑ اور ٹین حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ اشیاء ڈالر حاصل کرنے میں برطانیہ کی سب سے بڑی معاون ہیں۔ برطانیہ کے ڈالر کے ذخیرے کی حالت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ مگر پھر بھی کچھ بہت تسلی بخش نہیں۔ دولت مشترکہ کے تمام ملک بھی اس مہم میں برطانیہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہے ہیں۔ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ "تعاون" پر مجبور کئے جارہے ہیں۔ کم از کم پاکستان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نئے سٹرلنگ معاہدے (یکم جولائی ۱۹۵۰ تا ۳۰ جون ۱۹۵۱ء) کی رو سے جسکی شرائط کا اعلان حال ہی میں کیا گیا ہے۔ پاکستان کو اپنے ڈالر اخراجات کو ۶۲ ملین ڈالر تک محدود کرنا ہوگا۔ یہ رقم پاکستان کی صنعتی ضروریات کیلئے بے حد کم ہے۔ معاہدے کے دوران میں پاکستان کو ۱۵ ملین سٹرلنگ ادا کئے جائیں گے

سکے علاوہ ہندوستان کے سٹرلنگ کی ادائیگی ے انکار کے باعث' مزید ۱۶ ملین پاکستان کو ادا کیا جائیگا۔ یہ قرضہ ہندوستان سے ٹرلنگ کے حصول تک ہے۔ ظاہر ہے کہ ادائیگی کی یہ رفتار بہت ناقابل اطمینان ہے۔ اس معمولی سے قرضے کی ادائیگی میں و برطانوی Sterling Devaluation کے معاملہ کی وجہ سے پہلے ہی ۳۰ فیصدی کم ہوچکا ہے' نہ معلوم ابھی کتنے برس رکار ہیں

یورپ کے معاشی اشتراک کی ایک اور سکیم جسے امریکہ کی ہمدردیاں حاصل ہیں شومان (Schuman Plan) ہے۔ اس تجویز کے تحت۔ حصہ لینے والے ملک اپنے کوئلے اور لوہے کے ذخیروں کو ایک مرکزی ادارے کی زیر نگرانی مجتمع کریں گے۔ یہ ادارہ ملکی حدود سے بالا تر ہوگا ور اسکے فیصلے تمام اشتراک کرنے والے ملکوں کے لئے لازمی ہونگے۔ یہ ادارہ سال کے بعد اپنی کارگذاریوں کی رپورٹ مجلس قوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے پیش کریگا۔ ابھی تک جن ملکوں نے تجویز میں شرکت کی ہے انکے نام یہ ہیں۔ فرانس۔ مغربی جرمنی۔ بلجیم۔ لکسمبرگ۔ ہالینڈ ور اٹلی۔ اس تجویز کا مختلف حلقوں سے مختلف طرح خیر مقدم ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سکیم کو فرانسیسی ذہانت کا شاہکار قرار دیا ہے۔ اور بعض لوگ ہیں جو ایسے "وہی پرانا روگ" کہکر طاق سیاں پر رکھدینا چاہتے ہیں۔ یہ تجویز کچھ ایسی نئی بھی نہیں۔ پچھلے بیس سال میں یہ مختلف صورتوں میں مختلف حلقوں کی طرف سے پیش کی جاتی رہی ہے۔ اس مرتبہ اسے زیادہ واضح صورت دی گئی ہے۔ او ساتھ ہی Supra National Authority کی کلنج بھی لگا دی ہے۔ اس تجویز کا بھی اصل الاصول برطانیہ کے اس پلان سے علیحدہ رہنے کا باعث بنا ہے۔ پچھلے دنوں برطانیہ کی لیبر پارٹی کا ایک منشور شائع ہوا تھا جسمیں برطانوی لیبر حلقوں کے رویے کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس تجویز کو دو بنیادی وجوہات کے باعث رد کردیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ (لیبر پارٹی کے خیال کے مطابق) اشتراک عمل ایک ہی عقیدے کی پیرو حکومتوں میں ہوسکتا ہے۔ سوشلسٹ برطانیہ میں اور دوسرے خالص سرمایہ دار ملکوں میں بہت تفاوت راہ ہے۔ دوسرے برطانیہ کیلئے یہ ممکن نہیں اور وہ اپنے کامن ویلتھ اور امریکی تعلقات سے دست بردار ہوکر' اپنی قومی خود مختاری کسی مرکزی ادارے کے سپرد کردے۔ جہاں خالص سرمایہ دار حکومتوں کے نمائندوں کی کثرت ہوگی۔ امریکی دباؤ کے باعث برطانیہ نے اتنا منظور کرلیا ہے کہ پیرس میں ابتدائی گفت و شنید کے بعد اگر حالات ساز گار پائے تو وہ اس پلان میں شرکت کریگا۔ حکومت فرانس نے بھی پلان کے متعلق تمام حالات سے برطانیہ کو مطلع رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ فرانس کی یہ خواہش ہے کہ برطانیہ سکیم میں شرکت کرے۔ اسے ڈر ہے کہ برطانیہ کے بغیر جرمنی اپنے وسائل کے باعث مرکزی Authority پر حاوی ہوجائیگا۔ اس پلان کا سیاسی مقصد بظاہر فرانس اور جرمنی کی مدتوں پرانی رقابت کو ختم کرنا ہے۔ اصل میں امریکہ اس علاقے کو اس سکیم کے ذریعے ایک آہنی حصار میں تبدیل کردینا چاہتا ہے۔ تاکہ یہ اشتمالی سیلاب کے سامنے

بند کا کام دے سکے - جہاں تک اس کے اقتصادی پہلو کا تعلق ہے - یہ سکیم ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے - اسلئے کوئی واضح اندازہ نہیں کیا جاسکتا - کوئلے اور لوہے کے ' اجتماع قوت ' میں اچھائی اور برائی دونوں کے امکانات مضمر ہیں - اس پلان کو صالح یا غلط راہوں پر ڈالنے کی ذمہ داری تمام تر مرکزی مجلس پر ہوگی - اس مجلس کی رکنیت کا تجزیہ اس ضمن میں کم رهنمائی کرسکتا ہے - بہت سے ' یاس پسند پیغمبروں' کا لکھنا ہے کہ یہ پلان بھی قبل از جنگ بہت سے اجاروں کی طرح ایک اجارے کی تشکیل میں منتج ہوگی - پلان کے حامی اس خیال سے متفق نہیں - وہ اسے ایک انوکھی نوعیت کا اجارہ سمجھتے ہیں جسکا مقصد ذاتی منافع کی بجائے عامی بہبود ہوگا - یہاں صنعت کاروں کی خوش حالی سے مقدم خریداروں کا مفاد ہوگا - یہ تمام نیک ارادے درست - مگر لوگ کہتے ہیں کہ ' جہنم کا راستہ بھی نیک ارادوں سے ہوکر جاتا ہے ' ، اس پلان سے بہت سی بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا ڈر ہے ممکن ہے جو گتھیاں یہ تجویز سلجھانا چاہتی ہے - وہ کچھ اور الجھ جائیں - سب سے پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا لوہے اور کوئلے کا اجتماع کسی وقت بھی امن عالم کے لئے وسیع خطرے کا باعث بن سکتا ہے - خصوصیت سے جب کہ مرکزی ادارے کی باگ محض چند افراد کے ہاتھ میں ہوگی جو اپنے ملک کی پارلیمنٹ اور دوسرے جمہوری اداروں کے سامنے جوابدہ نہ ہونگے- ان کی قوت مکمل ہوگی اور اسے کسی طرح استعمال کرسکیں گے- اگر امریکہ اور برطانیہ کے سیاسی ماہرین جرمنی کی حربی قوت سے خائف ہیں اوراسے دوبارہ پنپنے نہیں دیناچاهتے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس لئی پلان کو پروان چڑھانے کی سعی کریں - دوسرا خطرہ صنعتی آمریت کا مسئلہ ہے - ظاہر ہے کہ اگر امریکہ اور برطانیہ کے حکمران طبقے امن کے لئے دل سے بھی اتنے ہی خواہاں ہوتے- جتنے وہ بظاہر ہیں تو اس قسم کی تجاویز کو اپنی مالی اور اخلاقی مدد نہ دیتے - سامراجیوں کے لئے امن کے معنی اپنی شرائط پر امن کے ہیں - انکی تمام امن کی تجویزیں اور امداد کے پروگرام ایک محور کے گرد گھومتے ہیں - وہ محور ہے اشتمالی خطرہ - برطانیہ - امریکہ اور انکے ساتھی ممالک کی حالیہ سیاست تمام تر منفی قدروں پر مبنی ہے - اس لئے کسی تعمیری کام کی توقع ان سے کی ہی نہیں جا سکتی - جمہوریت‌پسند ملکوں کے لئے اب اسکے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے سیاسی اور معاشی نظام کی تشکیل کیلئے کسی اور اُفق کی جانب نگراں ہوں - آج کی دنیا میں جب عالمی حکومت کا تصور اتنا جاگزیں ہو چکا ہے - علیحدگی اور غیرجانبداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - مسئلہ اتحادی تلاش کرنے کا ہے - کوریا کی جنگ نے ایشا کے پسماندہ ملکوں کیلئے ایک واضح اشارہ کیا ہے - اب یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ سامراجی ملک آزادی کے روز افزوں جذبے کو کچلنے اور معاشی استحصال کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے آزاد معیشت Laissez faire کا زمانہ ختم ہو چکا - اور اب منصوبہ بندی کا دور ہے - اگر ہم نے وقت کی رو کے خلاف چلنا چاہا تو ہم صدیوں پیچھے جا پڑیں گے - پہلے ہی ہم ابھی سائینسی دور کی فضا میں سانس لے رہے ہیں - پاکستان کو

دو قدم ایک ساتھ اٹھانے ہیں۔ اس کے لئے ہے۔ ہمیں ان آدرشوں کا سہارا لیکر یہ ہمیں ان ملکوں کے اقتصادی نظام کو مشعل ارتقائی مراحل طے کرنے ہونگے۔ جنکی راہ بنانا ہو گا جنہوں نے پچھلے پندرہ سال جڑیں عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں پیوست کے مختصر عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہوں۔

★★
★

استاد دامن۔

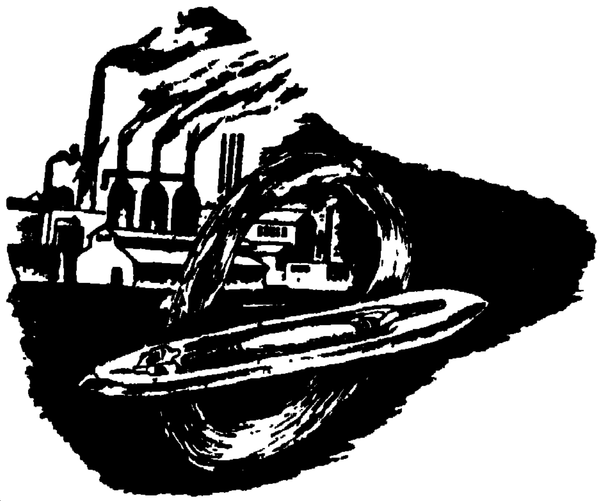
قطعہ (پنجابی)

بڑے ولی اوتار آئے پوتھیاں پونھے نے ہن تک
پر دنیا نگر جانی دے عمل تھوتھے نے ہن تک
میرے ولوں وی ودھائی ہووے خداوندا
بندے جتھے سن اوتھے دے اوتھے نے ہن تک

اکرام قمر

مشرقی بنگال کی صنعتی ترقی

"قدرت نے ہمیں لامحدود وسائل عطا کئے ہیں اُن سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے تاکہ پاکستان ایک طاقتور اور خوشحال ملک بن جائے" قائد اعظم



مشرقی پاکستان کی صنعت پر گفتگو کرتے وقت ذہن خود بخود ڈھاکے کی ململ کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ ململ دنیا بھر میں مشہور تھی۔ سارا یورپ اس کا گاہک تھا۔ ڈھاکے کی اس عجوبۂ روزگار صنعت کے بارے میں بیسیوں ہی روایتیں اور حکائتیں مشہور ہیں۔ لیکن زمانے کی گردش نے اس تاریخی حقیقت کو کچھ اس طرح مٹایا کہ آج اس کا نام و نشان بھی پورے مشرقی پاکستان میں نہیں ملتا۔ اور قیامِ پاکستان کے وقت تو صورت یہ تھی کہ ململ تو ایک طرف، مشرقی پاکستان میں ٹاٹ بنانے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، حالانکہ ساری دنیا ٹاٹ اور بوریاں تیار کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کی پٹ سن کی محتاج ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کی صنعت کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ جس طرح بہترین کپاس، تمباکو اور دوسری خام اجناس کی افراط کے باوجود پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ صنعتی اعتبار سے پسماندہ رہے، اسی طرح دنیا بھر میں بہترین پٹ سن کا واحد اجارہ دار ہونے کے باوجود مشرقی پاکستان صنعتی ترقی سے نا آشنا رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برعظیم ہند و پاکستان میں سیاسی و اقتصادی بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اقتصادی ترقی کا اثر انہی علاقوں تک محدود رہا جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں تھے۔ دوسری جنگ عظیم نے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ہلا کر رکھ دیا۔ عدم ضرورت کی چیزیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوگئیں۔ کارخانے دار ... فوجی سامان تیار کرنے ... کام کی زیادتی کی وجہ سے کل پرزوں کی ...

اور دیکھ بھال مسلسل نظر انداز ہوتی رہی۔ اس جنگ نے ہندوستان کے باقی علاقوں کی بہ نسبت مشرقی بنگال کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ سب سے بڑا تاریخی قحط اسی جنگ کے دوران میں مشرقی بنگال میں رونما ہوا۔

جنگ ختم ہونے پر عام استعمال کی اشیا تیار کرنے اور ملک کی صنعت کو نئے حالات کے موافق بنانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ مگر نہایت تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے حکومت کی تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ چنانچہ اقتصادی مسائل کی طرف پورا دھیان نہ دیا جا سکا۔ ان حالات میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

پاکستان قائم ہوتے ہی، بڑی بڑی مشکلوں اور دوسرے بڑے بڑے مسئلوں کے باوجود ملک کی صنعتی ترقی کی طرف توجہ دی گئی۔ نہ صرف مرکزی حکومت نے بلکہ صوبائی حکومتوں نے بھی صنعتی منصوبے تیار کئے۔ صنعتی ترقی کے لئے مرکز نے صوبوں کو امداد اور قرض دینا شروع کیا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کو ۱۹۴۸-۴۹ء میں چار کروڑ روپے اور ۱۹۴۹-۵۰ء میں چار کروڑ اکیس لاکھ روپے قرض دئے۔

جہاں یہ کہنا سچ ہے کہ قیام پاکستان کے وقت مشینی صنعت مشرقی پاکستان میں صفر کے برابر تھی، وہاں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں مشرقی پاکستان میں کافی تعداد میں موجود تھیں۔ مثلاً سوت کاتنا اور کپڑا بننا ایک ایسی دستکاری ہے جو مشرقی پاکستان کی اکثر عورتوں کا ذریعۂ معاش رہا تھا اور جہاں تک اس کے دو اہم مرکز تھے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے ڈھاکہ کی ململ اپنی نفاست کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھی۔ اب ململ کی صنعت تو ختم ہو چکی ہے، لیکن ڈھاکہ اب بھی وہاں ایک اہم پیشہ ہے۔ سوتی سوت سے بوٹےدار اور رنگین چادریں بنی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور قسم "جالدار" کی ہے۔

مشرقی بنگال میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ اور سب سے بہتر پٹ سن پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں پٹ سن سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی دستکاری بہت منافع بخش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پٹ سن کا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں کی ملوں میں پہنچ جاتا ہے، لیکن اس کے کچھ حصہ سے اسی صوبہ میں کپڑا بھی تیار کیا جاتا ہے۔ کچھ خاندان اور دیہاتوں سے اسی صنعت کے لئے وقف ہیں۔ پٹ سن کے ریشوں کو ہاتھ کی تکلیوں کی مدد سے سوت میں بدلا جاتا ہے۔ ایک دن میں ایک عورت ایک سیر سے زیادہ پٹ سن کات لیتی ہے۔ مرد اس سوت سے کپڑا تیار کرتے ہیں۔ موٹے سوت سے بوریاں ٹاٹ اور کمبل بنائے جاتے ہیں۔ عمدہ قسم کے سوت سے بیل بوٹےدار تیار کئے جاتے ہیں۔ ترپال اور کینوس بھی بنائے جاتے ہیں۔ پٹ سن کے سوت میں کپاس کا سوت ملا کر پردے، دریاں، قالین اور صوفوں اور کرسیوں کے غلاف کا کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ بننے کا کپڑا بھی بنایا جاتا ہے۔ حکومت اس صنعت کو نئے طریقوں سے روشناس کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ دستکاروں کو نئی تربیت دینے کی غرض سے مختلف ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

مشرق پاکستان میں ریشم کی صنعت بھی کافی اہمیت رکھتی ہے ۔ ٹوپیوں پگڑیوں اور پردوں پر ریشم سے کام کیا جاتا ہے ۔ اونچے گھرانے کی عورتیں کشیدہ کاری کرتی ہیں ۔ ''پھول پتی'' ، ''زردوزی'' اور ''کامدانی'' کشیدہ کاری کی اہم قسمیں ہیں ڈھاکے کی کشیدہ کاری بہت مشہور ہے ۔ سوتی کپڑے پر ریشم سے کشیدہ کیا جاتا ہے ۔ ''چکن'' اور ''کشیدہ'' ڈھاکے کی کشیدہ کاری کے مشہور اور خوبصورت نمونے ہیں ۔

ہاتھی دانت سے چوڑیاں ' کنگھیاں ' ہار' صندوقچیاں' بٹن اور کاغذ داب وغیرہ بنائے جاتے ہیں ۔ ڈھاکہ قدیم زمانہ سے گھونگھوں سے چیزیں بنانے میں مشہور ہے ۔ گھونگھوں سے بٹن' چوڑیاں' کنگن' زنجیریں اور انگوٹھیاں بنائی جاتی ہیں ۔ ہندوستان کے مندروں میں گھونگھوں کی مورتیاں بھی یہیں سے بن کر جاتی ہیں ۔

مشرق پاکستان میں شیشے کے برتن وغیرہ بنانے کے دو کار خانے ہیں ۔ چوڑیاں وغیرہ بنانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کارخانے قایم کئے جار ہے ہیں ۔ اس صنعت کیلئے خام مواد مشرق پاکستان میں بکثرت موجود ہے اور اس صنعت کو کافی ترقی دی جاسکتی ہے ململ بنانے کا اس وقت ایک کارخانہ ہے اور ایک اور لگایا جا رہا ہے ۔

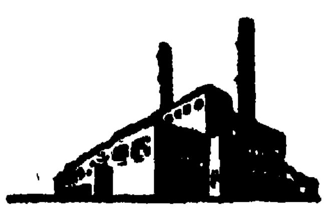
امداد باھمی کے ادارے بھی صنعتی ترقی میں قابل قدر مدد دے رہے ہیں ۔ کچھ ادارے تو کپڑا بننے کے ہیں ۔ کچھ چاولوں کے اور ایک ادارہ پٹ سن کا کارخالہ چلا رہا ہے ۔ ایک انجمن امداد باھمی دواسازی کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے بنی ہے اور ایک شکر سازی کے لئے ۔ پاکستان میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ ٹن تمباکو سالانہ پیدا ھوتا ہے ۔ جس کا اسی فی صدی حصہ مشرق پاکستان میں ھوتا ہے ۔ چنانچہ سگار' نسوار' زردہ اور حقے کا تمباکو تیار کرنے کے لئے کوآپریٹو فیکٹریاں قائم کی جارھی ھیں ۔ اس وقت باقر گنج میں دیا سلائیاں بنانے کی ایک کوآپریٹو فیکٹری ہے ۔ کچھ اور فیکٹریاں لگانے کے امکانات معلوم کئے جا رہے ھیں ۔

مشرق پاکستان میں امدادی صنعتی مرکز بھی ھیں ۔ قحط بنگال کے دنوں میں اپاھجوں کا ایک صنعتی مرکز چاندپور میں قائم کیا گیا تھا ۔ جہاں چرخوں پر سوت کاتا جاتا ہے اور کھڈیوں پر ساریاں' دھوتیاں' میزپوش اور بستر کی چادریں بنی جاتی ھیں ۔ چٹاگانگ کے ایک امدادی مرکز میں اپاھج عورتوں کو کھڈی پر کام کرنا سکھایا جاتا ہے ۔

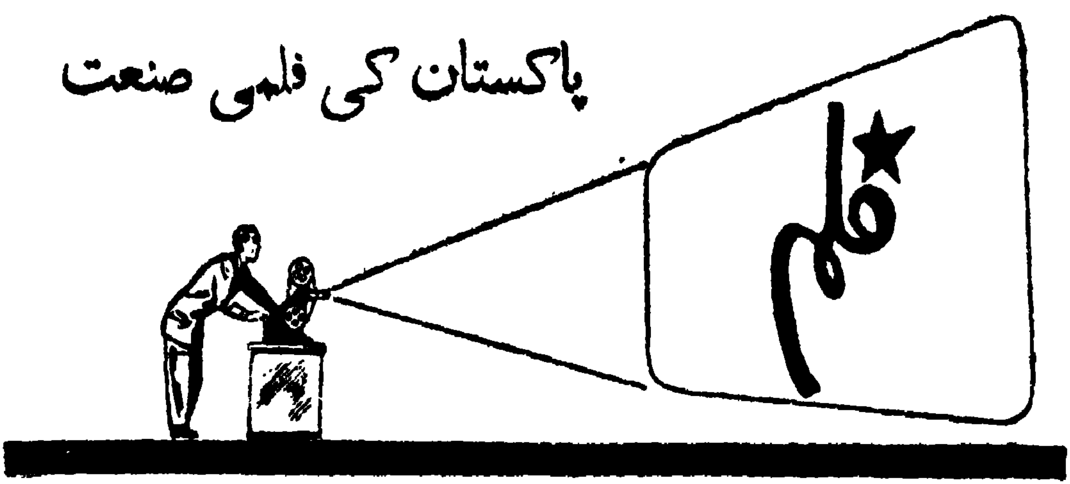
صنعتی ترقی کے سلسلے میں حکومت بھی کوششوں کی بھی مدد کر رھی ہے ۔ چنانچہ متعلقہ سرکاری قانون میں ضروری ردو بدل کیا گیا ہے ۔ نئے کار خانے تعمیر کرنے کے لئے صوبائی حکومت قرض اور امداد دے کر مشینری' خام اجناس' رسل و رسائل کی آسانیوں اور زمین وغیرہ کے حصول میں سہولتیں فراھم کر رھی ہے ۔

(نا تمام)

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان راولپنڈی)



پاکستان کی فلمی صنعت



پاکستان کی فلمی صنعت ابھی ایک تازہ کونپل کی مثال ہے جسے بہت سے ناموافق حالات اور تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ کرنا ہے - کیونکہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے حصے میں جو کار خانے، فیکٹریاں اور سرمایہ آیا ہے وہ ہندوستان کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے - اور جب تک پاکستان پوری طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر متمدن دنیا کے دوش بدوش نہ چلنے لگے اور اپنی بنیادی ضروریات کے پورا کرنے میں کسی بدیسی صنعت کا محتاج نہ رہے - اُسوقت تک کسی فنی یا تہذیبی ترقی کے امکانات پیدا ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ کسی بھی ملک کی تہذیبی یا صنعتی ترقی اُسکے باشندوں کی اقتصادی حالت پر منحصر ہے - ابھی پاکستان کے سامنے زیادہ ضروری اور نازک مسائل ہیں جنکے حل کئے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے - پاکستان کی فلم انڈسٹری کے مستقبل کا جائزہ ہم اُسکے ماضی ہی سے نہیں متعین کر سکتے کیونکہ تقسیم ہند کے بعد اس نوزائیدہ ملک کا ماضی ہی منقطع ہو چکا ہے - اور ہمیں اپنے حال اور مستقبل کی عمارت ازسر نو تعمیر کرنی ہے -

مسلمان اور فلمی صنعت

ہندوستان میں فلم انڈسٹری کی ۳۷ سالہ تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ غیر مسلموں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر اہم اور نمایاں ہے۔ مسلمانوں نے دنیائے فلم میں جو عظیم الشان کارنامے چھوڑے ہیں ہندوستان میں انکی مثال اور کہیں نہیں ملتی - اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو چند پنجابی غیر مسلموں کے علاوہ مسلمان ہی اس صنعت کے روح و رواں ہیں — ایکٹرسوں میں نرگس - ثریا - ستارہ - مدھوبالا - نسیم - نورجہاں - ریحانہ - راگنی - گیتابالی۔ جلو بائی - گلاب - خورشید۔عیدن بائی۔آزوری۔ وینا۔ منجو۔ زیب قریشی اور بیگم پارہ — ایکٹروں میں دلیپ کمار- یعقوب -مرزا مشرف- ممتاز علی۔ کمال - واسطی - نذیر۔ مظہر خاں مرحوم -

گل حمید مرحوم ۔ نجم الحسن ۔ کمار۔عباس ۔ جینت۔ آصف۔ مبارک ۔ الیاس ۔ اجیت ۔ شیخ مختار۔غلام محمد۔ اسمعیل اور همالیه والا وغیره۔ ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں میں — کاردار ۔ محبوب ۔ شوکت حسین۔ فضلی۔ ڈبلیو۔زیڈ۔احمد شاهد لطیف۔ ولی۔حسنین۔ نجم نقوی۔ صفدر جاه۔ وجاهت مرزا ۔ مسعود پرویز۔ اختر حسین نذیر اور ملکه پکهراج کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دنیائے فلم میں مسلمان ادیبوں' شاعروں اور افسانه نگاروں کا حصه بهی کسی سے کم نہیں۔ کهانی۔ مکالمه۔ موسیقی اور ڈائرکشن کی تکنیک میں جوش ملیح آبادی۔ عصمت چغتائی راجه مہدی علی خاں۔ امتیاز علی تاج' سعادت حسن منٹو۔ شاهد لطیف۔ خواجه احمد عباس۔ کمال امروهی۔ اختر شیرانی مرحوم۔ آرزو لکهنوی۔ ساغر نظامی' شکیل بدایونی ۔مجروح سلطانپوری۔ نخشب۔ بہزاد۔ تنویر نقوی اور ناظم پانی پتی وغیره کے نام خاص طور پر قابل ذکر هیں۔ موسیقی کے هدایت کاروں میں نوشاد' غلام حیدر' ساجد اور عنایت حسین کا نام پیش پیش هے۔ فن موسیقی میں بهی مسلمانوں میں صف اول کے فنکار هوئے هیں — اور موجود هیں' جنکے نغمے ایک طویل عرصے تک ملک کے گوشے گوشے میں گونجتے رهینگے۔ هر چند تقسیم هند کے بعد مذکوره بالا فنکاروں میں بہت سے مشہور فن کار اور ادیب هندوستان میں ره گئے هیں۔ تاهم انہیں مسلمانوں کی عظیم الشان تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا - اور ان مثالوں کی روشنی میں هم یه بات اعتماد سے کهه سکتے هیں که فلمی صنعت میں پاکستان کے مسلمان بهی اپنی روایات کو محسوس کرتے هوئے حال کے ساتھ ساتھ ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھ سکتے هیں۔

تقسیم سے پہلے مسلمان هندو سرمایه داروں کی اقتصادی برتری کے بوجھ تلے دبے هوئے تھے اور انکی صلاحیتوں کو آزادانه طور پر پنپنے کا موقع انہیں ملا اور انکی مالی حالت هندوؤں کے مقابلے میں بہت هی کم رهی۔ قیام پاکستان کے بعد همارے لئے زندگی کے هر شعبے میں ترقی کرنے کے امکانات بہت وسیع هوگئے هیں ۔ کیونکه اب همیں دوسرے ملکوں اور بالخصوص هندوستان کے مقابلے میں اپنی کمزوریوں کا جائزه لینے کا موقع ملے گا اور هم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زمانه کی رفتار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ سکیں گے۔

پنجولی سٹوڈیو

پاکستان میں یوں تو صنعت فلم کے کچھ مرکز ظہور میں آرهے هیں لیکن ابهی تک لاهور هی اس صنعت کا اهم مرکز هے۔ اور ابهی اسکی حالت سدهارنے میں ایک طویل عرصه درکار هے۔ ۴۷ء کے بعد سیٹھ پنجولی کے جاتے هی پنجولی سٹوڈیو ویران هو گیا جسے وه اپنے معاون سرداری لال کے سپرد کر گیا تها۔ اس واقعه کے چند ماه بعد جب حکومت پاکستان نے کچھ هندوؤں کو انکی جائداد واپس کرنے کا فیصله کیا اور انہیں یہاں آنے کی اجازت دی' تو سیٹھ پنجولی لاهور واپس آگیا۔ لیکن اس نے پاکستان کی اس رواداری کے باوجود یہاں رهنا پسند نہیں کیا اور سٹوڈیو کو کلکتے کے ایک ممتاز تاجر جے۔ بی۔ فیروز کے سپرد کر دیا۔ یه حقیقت ریکارڈ پر موجود هے که اس سٹوڈیو کی شاید هی کوئی ایسی فلم هو جو پہلی بار مکمل هو کر منظرعام پر آئی هو۔ اسکی سب سے بڑی وجه ٹکنیکل ماهروں کی کمی هے۔ اچهے فوٹو گرافروں کے بغیر

کسی فلم کا کامیاب ہونا ناممکن ہے اور ہمارے ملک میں ابھی ایسے ماہر کمیاب ہیں۔ یہاں نے کسی سٹوڈیو میں پرنٹنگ اور ڈویلپنگ کا خاطرخواہ انتظام نہیں۔ کچھ عرصے سے اس سٹوڈیو کو حکومت نے اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔ آجکل ڈائرکٹر نذیر اسکے مدارالمہام ہیں۔ چند افراد کی ذاتی کشمکش کی وجہ سے اس سٹوڈیو کی حالت ابھی تک نہیں سدھرسکی۔ اور ممکن ہے کہ حکومت کے نئے اقدام سے یہ گتھی سلجھ جائے۔ ہمارے خیال میں اس سٹوڈیو کو چند مخلص اور قابل ڈائرکٹروں کی تحویل میں دے دینا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ مقصد کو جاری رکھ سکیں۔

پاکستانی فلمیں

۱۹۴۹-۵۰ میں پنچولی پکچرز نے جن فلموں کا اعلان کیا ان کی تعداد تقریباً بیس ہے۔
شاہدہ۔ دو کنارے۔ ہچکولے۔ پھیرے۔ مندری۔ بیلی۔ غلط فہمی۔ لارے۔ ہماری بستی۔ دو آنسو۔ جدائی اور شمی' ان میں سے چند فلمیں ہیں جو فنی تکنیک کے لحاظ سے بہت ہی گھٹیا درجے کی ہیں۔ ان میں سے نذیر کی تین فلمیں اور انور کمال کی ''دو آنسو'' قدرے بہتر تھیں۔ کچھ اور فلمیں حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں۔ اور توقع ہے کہ ان میں سے بعض فلمیں گذشتہ تین سالوں کی تلافی کر سکیں گی۔ چن وے۔ اور دوپٹہ شوکت اور فضلی شاہ نور سٹوڈیو سے پیش کر رہے ہیں۔ نذیر کی انوکھی داستان اور امین پروڈکشنز کی '' امانت '' منظرعام پر آکر مقبول ہو رہی ہیں کاروان فلمز والے فلم '' اکیلی '' پیش کر رہے ہیں جسکی ڈائرکشن کے ضامن مہرہ اور موسیقی کے ہدایت کار غلام حید رہیں۔ پاکیزہ پروڈکشنز کے حیدر شاہ فلم چنگیز خان کی تکمیل میں مصروف ہیں اور پنچولی سٹوڈیو میں ''غنون'' کی شوٹنگ شروع ہو چکی ہے۔ سال ہی میں دو نئی فلموں ''بوٹ پالش '' اور '' دربار قیس '' کا اعلان ہوا ہے۔

مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں پاکستان کی صنعت فلمی کا مستقبل خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تک پی۔ پی پکچرز (Fakistan Produced Pictures) میں اچھے درجے کی فلمیں بہت ہی کم ہیں کیونکہ پاکستان میں سرمایہ داروں کی کمی ہے اور ڈسٹری بیوٹر ہندوستانی فلم خریدنے پر مجبور ہیں اور ملک کا بہت سا روپیہ ہندوستانی اور غیر ملکی فلموں پر صرف ہوجاتا ہے۔

کسٹم ڈیوٹی اور تفریحی ٹیکس

۱۹۴۹-۵۰ء کے دوران میں پنجاب کے سنیما گھروں کی آمدنی گذشتہ سالوں کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے۔ اسکی ایک وجہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تجارتی کشمکش ہے اور دوسری وجہ حکومتوں کے نئے ٹیکس بھی ہیں۔ ہماری مرکزی حکومت نے پاکستان میں چلنے والی فلموں پر ایک روپیہ فی فٹ کسٹم ڈیوٹی کے علاوہ جون ۱۹۴۹ء سے دس فی صدی مزید تفریحی ٹیکس کا اضافہ کردیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف درجوں کے سنیما گھروں پر ٹیکس لگایا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ فلمی تاجروں کی آمدنی کا ٦٠ فی صدی حصہ ٹیکسوں ہی میں نکل جاتا ہے۔ حکومت ہندوستان نے بھی پاکستانی فلموں پر کافی ٹیکس لگایا ہے۔ ان تمام ٹیکسوں کی وجہ سے

پاکستانی پروڈیوسر اپنی فلموں کے لئے ضروری سرمایہ نہیں بچا سکتے اور اچھی فلموں کے منظرعام پر نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

دستاویزی فلمیں

صنعت فلمی کے پرائیوٹ اداروں کے علاوہ حکومت پاکستان نے بھی چند دستاویزی فلموں (Documentary Films) کاسلسلہ شروع کیا ہے۔ جو ڈھاکہ ۔ کراچی اور لاہور کے فلم بیوروز اور محکمہ تعلقات عامہ کی نگرانی میں تیار ہوتی ہیں۔ حکومت کی یہ کوشش نہ صرف پاکستانی عوام کے لئے مفید ہے بلکہ دوسرے ملکوں کے لئے بھی اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہے کہ ان فلموں کے ذریعہ پاکستان کے متعلق بعض مفید اور ضروری معلومات فراہم ہوسکتی ہیں۔ ان فلموں میں قائد اعظم کا آخری سفر۔ پاکستان میں لیاقت علی اور گورنر جنرل کا دورہ ۔ شاہ ایران کی آمد۔ پاکستان کے اولمپک کھیل۔ پنجاب میں سیلاب اور تھل میں جل تھل۔ وغیرہ خاص طورپر قابل ذکر ہیں —

لندن میں اردو فلم

حال ہی میں پاکستان کے چند نوجوان تاجروں اور فن کاروں نے لندن میں اردو فلمیں تیار کرنے کی مہم شروع کی ہے۔ کراچی کے ایک ۲۴ سالہ نوجوان تاجر فرخ الحسن نے برطانیہ کے پائن وڈ سٹوڈیو (Pine Wood Studio) میں ایک اردو فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ سنا ہے کہ اس فلم پر تقریباً دو لاکھ پونڈ صرف کیا جائے گا جسمیں برطانیہ کے فن کاروں کے علاوہ چار مشہور پاکستانی ایکٹر بھی حصہ لینگے — اس فلم کی کہانی اور مکالمہ شفیق الرحمان نے لکھے ہیں —

پاکستانی ڈسٹری بیوٹر

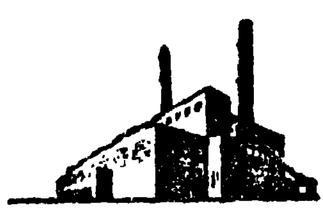
پاکستانی فلموں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ڈسٹری بیوٹروں کی پبلیسٹی پالیسی (Publicity Policy) زیادہ تر ناتجربہ کار اور ناخواندہ تاجروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ نفع کمانے کی غرض سے فلم تو خرید لیتے ہیں لیکن اسکے مقبول بنانے کے موثر طریقوں سے ناآشنا ہیں۔ انکی آواز صرف چند روزناموں اور کچھ گھٹیا فلمی رسائل تک محدود ہے اور انھیں ادبی رسائل کی اہمیت کا احساس نہیں ۔ اگروہ اپنی منظورشدہ فہرست (Approved List) میں کچھ معیاری رسائل کو بھی شامل کر لیں تو ان کی فلموں کی مقبولیت اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ تہذیب یافتہ ممالک کی فلموں نے اب یہ بات ثابت کردی ہے کہ فلم اور ادب میں ایک گہرا رشتہ ہے اور فلم دنیا کے تمام علوم وفنون کی ترویج کا غیر معمولی اور دلچسپ ترین ذریعہ ہے۔ ڈسٹری بیوٹروں میں چودھری عیدمحمد۔اسمعیل نور اورانکے بعض رفقاء پاکستانی فلموں کو کامیاب بنانے کے لئے بہت کچھ کررہے ہیں اور اسی سلسلے میں ایک فلم چیمبر (Film Chamber) قائم کی گئی ہے۔ لاہور میں پروڈیوسروں اور فلمی فن کاروں کی ایک دو ایسوسی ایشنز بھی قائم کی گئی ہیں، جنکا مقصد اچھی فلمیں تیار کرنا اور فنکاروں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے—

صنعت فلمی کی اہمیت

دنیا کے صنعتی انقلاب کی تاریخ میں فلمی صنعت بھی ایک انقلاب تھا اور آج یہ صنعت دنیا کی صنعتوں میں چھٹے درجے پر ہے۔ جسکی اہمیت کو نظرانداز کرنا ایک تہذیب یافتہ ملک کے لئے ناممکن ہے۔ یورپ انگلستان اور

امریکہ میں فلموں نے تہذیب و تمدن پھیلانے میں معجزاتی کارنامے کئے ہیں اور انہوں نے انہی مختلف النوع فلموں کے ذریعے اقوام عالم سے ایک گہرا رشتہ قائم کیا ہے۔ وہاں کی فلمیں زندگی کے مختلف شعبوں کی جیتی جاگتی ڈائرکٹری ہیں۔ صنعتی ترقی اور سائنس کی نئی ایجادوں نے لوگوں کو اسقدر مصروف بنادیا ہے کہ ان کے پاس دنیا کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے کا وقت بہت محدود ہے۔ اخبارات ریڈیو اور خاص طور پر فلم ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے سکول کالج اور سرکاری ادارے بھی دستاویزی فلمیں بناتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عوام ہمارے تعلیم یافتہ طبقے سے کہیں زیادہ باخبر اور چوکنے ہیں۔ انگلستان کی فلم لائبریری اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ یہ لائبریری دنیا کی تمام فلموں کا ایک ایک پرنٹ شائع کرنے کے حقوق حاصل کر کے انہیں اپنے ملک کے لئے محفوظ کرلیتی ہے۔ نیو یارک میں نہ صرف اچھی فلمیں بنائی جاتی ہیں بلکہ دوسرے ملکوں کی ہرقسم کی فلموں کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیاجاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال نیو یارک کے ماڈرن آرٹ کا میوزیم ہے جو دنیا کی فلموں کا سب سے بڑا (Clearing House) ہے۔ اس ادارے کو نیو یارک کے بڑے بڑے سرمایہ دار، پروڈیوسر، فن کار اور حکومت مل جل کر چلا رہے ہیں جسکا سب سے بڑا کام عوام کو ہر ملک اور زندگی کے ہر شعبے کے متعلق مفید اور ضروری معلومات پہنچانا اور دنیا کی پرانی فلموں کو محفوظ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر ہماری حکومت اور ہمارے فلمی تاجر صنعت فلمی کی اہمیت کا احساس اس نقطہ نظر سے کریں تو یہ صنعت عوام اور ملک کی ترقی کا ایک انقلابی ذریعہ بن سکتی ہے۔

★————★



آخری بات

● اہل قلم سے ——

آپکی تحریریں اردو کے تمام رسائل میں شائع ہوتی ہیں "اوراق نو" بھی آپ کا قدردان ہے ۔ اور ادیبوں کا پرچہ ہوتے ہوئے، آپکے صحیح مقام سے آشنا ہے ۔ اور اسی لئے ہر قسم کی تاجرانہ مصلحتوں پر ادب کو ترجیح دینے کا ذمہ لیتا ہے ۔ ہمارے موضوعات علم کی علمیت کو مقدم رکھتے ہوئے روز مرہ زندگی سے قریب رہنا چاہتے ہیں امید ہے آپ اس خصوصیت کے پیش نظر ہماری معاونت فرماتے رہینگے ۔

● قارئین سے ——

آپکے سامنے تمام اردو رسائل ہیں "اوراق نو" بھی اپنی تمام رعنائیوں اور جدتوں کے ساتھ آپ کو پکار رہا ہے آپ اسے خرید کر ہمیں رسائل کی دنیا میں نئے نئے تجربے کرنے کا موقع دینگے ۔ امید ہے آپ اسے دیکھکر متاثر ہونگے اور پڑھکر محظوظ ہونگے ۔ اپنے حلقۂ اثر میں "اوراق نو" کو متعارف کرائیں ۔

● مشتہرین سے ——

"اوراق نو" مختلف رنگوں میں اشتہارات پیش کریگا ۔ جسکی ترتیب و تزئین کے ضامن فن کار ہونگے ۔ اشتہارات کے نرخ آخری سرورق (اندرونی) پر دیکھیں ۔

"اوراق نو" میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کے فن کاروں اور ادیبوں کے بھی کام آئیں ۔

"ادارہ"

● [illegible] دفتری زبان اردو [illegible]

● [illegible] سرکاری زبان ہو سکے

★

انشا پریس لاہور